

نظر نامہ

محمود نظامی

گوشہ ادب، لاہور

ترتیب

| | | | | |
|-----|---|---|---|---------------|
| ۹ | - | - | - | خدیجہ |
| ۱۴ | - | - | - | بازار مسر |
| ۹۱ | - | - | - | روم ناپس |
| ۱۳۶ | - | - | - | برسبیل لشدن |
| ۲۰۹ | - | - | - | شب طلوع پریرس |
| ۲۵۰ | - | - | - | بالا خرمیکو |

عذریہ

بیاحت میرا منتقل مشغلہ ہے نہ سفر نامے لکھنا مقصدِ حیات۔ یہ تو ایک اتفاق تھا کہ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں مجھ کو زندگی کا بیشتر حصہ گھر کی چار دیواری میں بسر کر چکے کے بعد باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ جڑائیوں کو غیر متوقع طور پر اقوام متحدہ کے ادارہ ٹولکو نے بعض ملکوں کی فہرست میں کے کام کا شاہد کرنے کے لئے مجھے ایک ایسے سفر پر بھیجنے کا اہتمام کیا جس کے ذریعے مجھے اس وسیع دنیا کے چند ممالک کو سرسری طور پر دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔ میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو راولپنڈی سے چلا تھا اور ۲۴ مارچ ۱۹۵۸ء کو میسریناں، اٹلی، سویٹزرلینڈ، فرانس، برطانیہ، ریاستہائے متحدہ، کینیڈا، جزائر باما، اکویبا اور میکسکو کا چکر کاٹ کر واپس کراچی پہنچ گیا۔

ہوائی جہازوں کے اس دور میں جبکہ خاصے ٹکٹ گئے ہیں اور دور دورا کے

ممالک ایک دوسرے کے ہمایہ بن گئے ہیں سفر کی حقیقت یہ ہو گئی ہے جیسے کوئی چل قدمی کسے کچھ دُور نکل جانے اور ٹھٹھا ہوا واپس آ جانے۔ اس اعتبار سے میز سفر کوئی عام بہتیت نہیں رکھتا جن ممالک میں میں گیا ہوں اُن کا سفر لوگ اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی ایک محلے سے دوسرے محلے چلا جائے۔ مگر یہ ایک قدرتی بات ہے کہ سفر خواہ وہ کسی قسم کا ہو مسافر کو اپنے تجربات اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سنا مانے پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔ اس کے وابستگان اس سے گریہ کرید کر پوچھتے ہیں کہ کیا دیکھا، کیسی گزری، کیا کھریا، کیا پایا، احباب نے مجھ سے بھی سفر کی سرگزشت پوچھی اور میں نے بھی عام روش کا اتباع کیا۔

میں جب مادلینڈی سے چلنے لگا تھا تو نصیر اور جواد پٹنڈی کے ریڈیو پیشین پر میرے وینن کا رشتے ایک دبیز قسم کی کوری کتاب لے کر میرے پاس آئے کہ میں اپنے سفر کے دوران میں اپنے تاثرات اس میں قلمبند کرتا جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ یہ کتاب میں نے رکھ لی۔ اور بعد میں یہ میرے کام بھی آئی۔ کیونکہ اس پر سفر کے تاثرات تو لکھے نہ جاسکے البتہ جس مطالعے کے لئے میں لکھ رہا تھا اس سے متعلق کچھ یادداشتیں ضرور اس پر محفوظ ہو گئیں جن سے مجھے بعد میں اپنی رپورٹ مرتب کرنے میں خاصی مدد ملی۔ لیکن آخر ایک دن ہوا کہ نصیر اور سنے کو پایا اور میرے سر جو گئے کہ لاؤ وہ سفر نامہ، سفر نامہ تھا، کہاں جو میں انہیں دیتا۔ میں نے کہا ہم دونوں کا قتل ایسے فی سے ہے جو بولنے کو گھنے ہر ترجیح دیتا ہے

سوسفر کے حالات زبانی حاضر ہیں۔

نصیر اوزد نے سنی ان سنی کروسی اور گروگر چلے گئے۔ چند دن آرام سے کئے گئے
آخر ایک روز قیوم نقر پشاور میں مجھ سے ملے آئے۔ وہ اس زمانے میں نئی تحریروں کا
پہلا پرچہ ترتیب دے رہے تھے۔ شاید انہیں مضامین کی ضرورت تھی۔ کئے گئے روم
سے متعلق جو باتیں تم نے مجھے سناں ہیں انہیں تھکندہ کردہ نہیں انہیں چھاپوں گا۔ میں نے
خاق کا جواب مذاق ہی میں دیا اور وہ مضمون لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ جو اس
کتاب میں ”روم تاج“ کے عنوان سے درج ہے۔ انہوں نے اسے صحیح صحاب
دیا۔

مضمون چھپ گیا تو بعض ایسے احباب کی طرف سے جن کی مانے کی میں قدر
کرتا ہوں۔ اس کی تشریح بھی آگئی اور میں نے سال بھر کے عرصہ میں دو تین اور رپورٹاژ
اسی نوعیت کے لکھ ڈالے۔ جو سب کے سب نئی تحریروں میں چھپے۔ آخر ایک
دن مجھ سے احباب کا یہ سنجیدہ مذاق بھی شروع ہوا کہ اب انہیں یک جا کر کے کتابی
صورت میں چھاپ دیا جائے۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ میں نہیں چاہتا دنیا مجھ پر
پہنے کہ شاید میں ان ممالک کی دریافت کا دعوے کر رہا ہوں اس لئے کہ جہاں تک
سفر نامہ لکھنے کا تعلق ہے ایک تو میں اس فن سے غائب ہوں۔ دوسرے یہ سفر بھی نہیں
نے اس غرض سے نہیں کئے تھے کہ مجھ کو سفر نامہ لکھنا ہے۔ میں تو بس گزرتا ہوں
اور ان ممالک کے جو نقش و خدو بخود میرے دل و دماغ پر بیٹھتے گئے اور اسلحا

کی گمراہی میں اُترتے گئے ان کا اندازہ بھی اگر سچی پرچھے تو سمجھ کر اس وقت ہو سکا
جب میں اس سفر کے بعد گھر پہنچا۔

مگر جب میرے بعض اُن دوستوں نے جن کی دانتے کے وزن سے میں اکثر
دب جایا کرتا ہوں۔ سمجھ کر سنجیدگی سے یہ مشورہ دیا کہ چونکہ تم ایک غالب علما نہ
ذہنیت لے کر اس سفر پر گئے تھے۔ اور چونکہ تم نے اپنے اس تمام سفر میں اپنی طبیعت
مشرقیّت کو کہیں فراوانش نہیں کیا ہے بلکہ اسی زاویہ نگاہ سے دُنیا کے یہ حصے
دیکھے ہیں لہذا تمہارے یہ تاثرات جن کا اسلوب مختلف ہے۔ کتابی صورت میں چھپ
جانے چاہئیں۔ تو میں نے پھر بھی کہا کہ اُن تاثرات کو سفر نامے کی حیثیت حاصل نہ
ہو سکے گی۔ یہ تو کچھ چلتا پھرتا تبصرہ سا ہے۔ کہیں فکر یہی ہے کہیں میں خود ہکا ہوں۔
مگر ان حضرات کا اصرار تھا کہ اگر یہی لغزشیں حاصل سفر ہوں تو ان لغزشوں ہی سے
ممکن ہے قاری کو کچھ مل جائے مختصر یہ کہ یہ مضامین احباب کی خاطر لکھے گئے تھے۔
اور جب انہیں کا اصرار تھا کہ انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو میں نے ان کا
مشورہ قبول کر لیا اور انہیں یہ کتاب آپ تک پہنچ گئی۔

(۲)

یہ تو تھا غدر گناہ۔ اب ان بزرگوں کا ذکر کرنے سے پہلے جنہوں نے اس
گناہ کی ترغیب دلائی اس کتاب کے بارے میں بھی ایک اُدھ بات کہہ دی جائے

ایک آخری نگاہ خوف، خائفِ فرح اور مشکورِ رح کے جلیل القدر مقدسوں اور ابوالہول کے عظیم جتنے پر ڈالی۔ پھر میری نظریں قریب کے ایک سیٹروں کی ایک دیرار پر پڑیں جہاں ایک قد آور بوڑھا آویزاں تھا۔ اس بوڑھے پر ایک ایسی سفری دوشیزہ کا چہرہ دکھایا گیا تھا جس کے رنگین ہونٹوں کے ساتھ ایک کاغذی نالی کے ذریعے سونے کی ایک نیلگوں بوتل لگی ہوئی تھی۔ اس نازنین کی نیم دائرہ کی کیفیت سے اس روح پرور لطیف کا اندازہ ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ اس مشروبِ حیات کو پی رہی تھی تصویر کے پہلو میں عربی رسم الخط میں لکھا تھا، کھو کھو کھو لا۔

(۴)

جب دریا کے پل کو عبور کر کے صالح حسین کی کارغینہ سے بیدار ہوتے ہوئے تباہہ کوٹنا صلی کی دھند میں چھوڑ کر کھلی شرک پہا سکنہ ریر کی طرف دوڑنے لگی۔ تو میرے سامنے افق شمال تک ایک ہموار اور سرسبز خطۂ ارض پھیلا ہوا تھا۔ اس پر مٹی اور گنے کی فصلیں دریا سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکوں کے آگے صلابت ہی تھیں۔ ان سے پرے صحرا کے برے پرہانپ مغرب کھجور کے گٹھے جھنڈ بجائے مشرق سے آہستہ آہستہ سر نکالتے ہوئے سورج کی علاقائی کرنوں سے شہزادنگ کے سرے کی طرح جھک رہے تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ دونوں طرف اونچے اونچے کناروں کی منڈیر پر دو درنا صلی میں اونٹوں کی قطاریں تھیں جنہوں نے اپنی لمبی

تاکہ اگر ممکن ہو تو ان کی تلمیخ میں کچھ کمی مائع ہو جائے۔

یہ دستاویز آپ کو سفرنامہ سے زیادہ مسافرت نامہ نظر آئے گی۔ کیونکہ اس میں مقامات کی تفصیل کی بجائے "میں" کے لفظ کی تکرار زیادہ ہے۔ اگر یہ ناگوار خاطر ہو تو اس کے لئے میں ابھی اپنی مصدرت پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ دراصل یہ مجھ سے اُن مضامین پر مشتمل ہے جن میں مقامات ویدہ کے تعلق میرے ذاتی تاثرات کا ذکر ہے۔ گویا یہ کتاب مصنف کی ذاتی آراء، یادوں اور پسند و ناپسند پر مشتمل ایک مجھ سے ظاہر ہے ذاتی چیز میں "میں" کے لفظ کی تکرار ناگزیر تھی۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اس لئے نہیں کیا گیا کہ مجھ میں اپنی ذات کی فرو و ناکش کا شوق اپنے معصروں سے نسبتاً زیادہ ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کے لئے جس طرز نگارش اور لفظ چناؤ کے لئے جس اسلوب کا میں نے سہارا لیا ہے اس کے بغیر اس کی تکمیل میرے نزدیک ممکن نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے مشاہدات کے بیان میں نہ تو مروجہ قسم کے سفرنامے کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے نہ اس فن کی اصطلاحات میں الجھا ہوں۔ مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ سفرناموں کی مختلف قسموں میں سے میرے یہ تاثرات کسی قسم کی تحت بھی نہیں آتے۔ اس لئے کہ ان مقامات کی جغرافیائی کیفیت بیان کی ہے۔ وہاں کی آبادی کے اعداد و شمار پیش کئے ہیں، انہوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے اور ان قسم کی تحقیقات میں اپنے کو جکایا ہے۔ جو گاندھیک کا خاصہ ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ شاید میں نے ان مختلف مقامات کے حالات

پیش کرنے سے زیادہ ان مختلف آئینہ خاؤں میں خود اپنے کو دیکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں میں اس سفر میں بہت سے شہروں سے گزرا ہوں۔ وہاں کئی شہر ایسے بھی تھے جو خود میرے دل سے گزرے ہیں۔ اس مجہولے میں آپ کو ان ہی مقامات اور ان ہی شہروں کی باتیں ملیں گی جو میرے دل سے گزرے ہیں حالانکہ کوشش یہ بھی کی ہے کہ دل کی وہ باتیں معرضِ اخبار میں ذرا جانیں جن کا تعلق سوائے میرے کسی اور سے نہیں ہے۔

میں اپنے اس سفر میں بہت سے ایسے مقامات پر بھی گیا جہاں کی کسی ایک کوشش نے مجھ کو اپنا کرباتی ہر طرف سے بے نیاز اور بے خبر رکھا جیسے کوئی سیاح تاج محل دیکھنے آگرا۔ ہمارے۔ اور بغیر آگرہ دیکھے صرف تاج محل کو دیکھ کر آہائے۔ کہیں کہیں کیفیت بھی آپ کو نظر آئے گی کہ دیکھنے تو میں تاج محل کو گیا تھا لیکن آگرہ کی گلی کوچوں کی دلکشیاں میں کچھ ایسا لکھو یا کہ تاج محل کی طرف رخ کرنے کی چنداں نہ

درا۔

بات طول کھینچ گئی۔ عرض صحت اس قدر کرنا تھا کہ اس سفر نامے "اور اصطلاحی سفر ناموں میں وہی فرق ہے جو آپ مبنی اور جب مبنی میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں سفر کی تفصیلات کے مقابلے میں آپ کو شاید ان تاثرات کا ذکر زیادہ ملے گا جو سفر کے دوران میں کسی مقام یا شے کی دید کا میرے لئے براہِ راست نتیجہ تھے۔ مگر ان ذاتی تاثرات سے کسی اور کو تاثر نہ ملے گا۔ کوشش صرف یہ ہے کہ جس طرح اس

تمام سفر میں مختلف ممالک کی بارونی شاہراہوں اور مسان گلی کوچوں میں ہر جگہ میں اپنے کو پہچانتا رہا ہوں۔ اسی طرح آپ بھی اس سفر کی سرگزشت میں مجھ کو گم نہ کر پائیں۔

(۳)

جن بزرگوں نے اس کتاب کو مکمل کرنے اور پھر حجاب ڈالنے میں میری حوصلہ افزائی کی نہیں ان کا ذکر ان کی ایسا کے خلاف یہاں کر دیا جاتا ہوں تاکہ وہ اس حرکت سے جسے میں نے گناہ کے نام سے قہر کیا ہے اپنے آپ کو بری الذکر سمجھنے کی بھلائی اس کے عواقب میں میرے ساتھ ہا ہ کے شریک ہوں۔

اس کتاب کی ادلیں تحریک بن، ام راشد کی طرف سے ہوئی تھی اور اس تحریر کی حمایت میں اشفاق احمد نے روم میں جس بحث کا آغاز کیا تھا۔ اس نے لاہور میں کئی مرتبہ لڑائی بھڑائی کی صورت بھی اختیار کی۔ کتاب کا نام اور مضامین کے عنوانات سب کے سب شوکت قانوی کے تجویز کئے ہوئے ہیں جنہوں نے ان مضامین سے متعلق کئی مشکلات کو حل کرنے میں میری مدد کی۔ سید عابد علی مآبد نے ہر مضمون چھپنے سے قبل بلو بھاسم مجھ سے منگوا کر سنا اور اس کی اصلاح کے شوق سے دئے۔ سید امتیاز علی تاج نے ان میں سے بعض مضامین یا ان کے جتنے تھے اور اپنی رائے سے میری حوصلہ افزائی کی۔ جن لوگوں کو یہ مضامین میں نے ذرا ہستی سنانے ان کی فرست بہت طویل ہے۔ یہاں صرف عقدا ارباب ذوق کے ارکان کے ممبر و تحمل کی داد دینا

چاہتا ہوں جنہوں نے خند و ہنسی سے ان طویل مضامین کو سنا اور پھر میری دہنائی کرتے کہتے خود بحث میں ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ کتاب کو مرتب کر سکنے کے بعد اسے چھاپنے کے لئے جو جذبہ ہر نئے مصنف کے دل میں ہوتا ہے میرے لئے اس کا ازالہ سید ذوالفقار علی بخاری اور قرۃ العین حیدر نے کیا۔

میرے محترم بزرگ عبدالرحمن چشتائی نے میری کوشش کو کچھ ایسی شفقت سے دیکھا کہ کتاب کا سرورق انہیں کا عطیہ ہے۔

آخر میں دو اور مستویوں کا ذکر ضروری ہے جس دوران میں یہ مضامین لکھے گئے آفتاب احمد اور میری بیوی کے درمیان یہ بحث مستقلًا چلتی رہی کہ یہ مضامین لکھے جائیں یا نہ لکھے جائیں۔ آفتاب کا خیال تھا کہ مجھے انہیں ضرور لکھنا چاہئے۔ ظاہر کو ہر ادھار کہ اس طومار کو بند کر دیا جائے۔ کیونکہ اس تحریر و تصنیف سے میں ادیب بننے ہی کی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جہانیاں جہاں گشت ثابت کرنے کی سعی کر رہا ہوں جس سے میری آبرو میں اضافے کا چنداں امکان نہیں۔ اب جبکہ یہ مضامین لکھے جا چکے اور یہ طومار ختم ہو گیا تو نہ جانے اس بحث میں کون جیتا ؟

محمود نظامی

ریڈیو پاکستان لاہور

یکم ستمبر ۱۹۵۶ء

بازارِ مصر

ایک خفیہ سی تحریک رہت ہے اور چنگوں کی کھوکھوں کے علاوہ کسی بات سے یہ
غدا نہ دہر سکتا تھا کہ ہم کوئی تین سو میل کی رفتار سے بحیرہ عرب کی کفٹ آلود لہروں
سے کوئی فوہزار فٹ اوپر فضا میں اڑ رہے تھے۔

اب سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے جب کائناس بی۔ او سی کما لائنکیشن جواز ہم
۲۵ سافروں کو ساڑھے گیارہ بجے شب کراچی کے ہوائی اڈے سے لے کر زمین و
آسمان کی درمیانی پٹائیوں کی پرسکون فضا کو چیرتا ہوا، وادی نیل کی پُر سرسبز زمین
کی طرف اڑتا تھا تو کراچی کا مطلع صاف و شفاف تھا۔ اُنٹریں یا فوہیں کا پانچواں فریکوئنسی
کی ٹھنک دات میں ضیا پاشی کر رہا تھا اور تار سے دھیسے دھیسے لڑ لڑ کر قدرت کے
دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ جب چنگی برقی چاندنی میں بہتی رہتی تھی

سے جگمگاتے ہوئے چوائی اٹھ سے دُور فاصلے پر آنے اور جانے والے ہوائی جہاز
کسی شب بیدار پرندے کی طرح پر پھیلانے اور پر نیچے ہاتے جاتے تو معلوم ہوتا تھا
کہ کائنات کے عناصر میں آج لات جڑی ہم آہنگی ہے۔

پھر اچانک کوئی ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارے سامنے کی جانب دُور
کہیں پہلی کوندلے لگی۔ اور سیاہ بادلوں کے کوفوں پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ
ایک روپہنی گوٹ چمک چمک کر آنے والے طوفان کا پتہ دینے لگی۔ پندرہ منٹ میں
بادلوں کے سیاہ چادر شہارے اور آسمان کے درمیان بلند موجے تھے اور برق کی چمک
کھڑکیوں کے واسطے جہاز کے اندر کی نیم تاریک دنیا کو ٹھہر ٹھہر کر روشن کرنے لگی تھی معلوم
ہوتا تھا۔ بحیرہ عرب میں کہیں فاصلے پر کوئی خوفناک طوفان اپنا رنگ جہاز پر ہے۔ اور ہم قار
کے کندھوں پر سوار کسی مقناطیسی کشش کے ماتحت اور ہری کو تین سو میل فی گھنٹہ
کی رفتار سے اڑے چلے جا رہے ہیں۔

طوفان کے احساس سے مجھے کچھ ذہنی پریشانی سی محسوس ہونے لگی۔ اور
میری نگاہ خود بخود چھت کی طرف اُدھر کو اٹھ گئی۔ جہاں تیرنے والی پٹیاں سفوف کی
مزدت کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ جہاز کی سبوتاژ
نے میں کلاچی سے رونا ہونے کے پندرہ منٹ بعد قدرے تفصیل سے یہ بتلایا تھا کہ ضرورت
کے وقت اس پہلی کو کس طرح استمال کرنا چاہئے۔ جب وہ مسافروں کے بچے سے گزرتی
ہوئی اس دورانے کی طرف پشت کے کھڑی ہوئی تھی۔ جو عملے کے کمرے سے مسافروں

کے کمرے میں کھلتا تھا تو وہ خود بھی ایک ایسی ہی چٹنی پہنے ہوئے تھی۔ پھر اُس نے ایک مصنوعی قسم جہرے پرلا کر بلند آواز سے کہا تھا: خواتین و حضرات سربانی کر کے خاضے گا؟

خواتین و حضرات پہلے ہی سے گویا سننے کے لئے تیار تھے۔ اس جملہ کے ساتھ ہی جہاں لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور ایک دو بچے جہاز کے آہن تختے میں شور مچا رہے تھے۔ وہاں بالکل غار شنی چھا گئی۔ سپردار دُوس کے رنگین ہونٹوں کا قبم کچھ ادا کر رہا ہوا تھا۔ اور وہ ایک بڑے لوح کے ساتھ بولی کو کل پُر زدن کی خرابی یا کسی اور وجہ سے کپتان کو اگر یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ جہاز کو پانی میں اترنا ہو گا تو ہم سب فوراً نکلیں یا تیز قسم کی اشیاء مثلاً فیل وغیرہ جب سے نکال دیں چپترہ اتار دیں۔ گاڑیوں کو دیں۔ ٹائی اور دھونا الگ کر دیں اور پھر اپنے سر کے اوپر سے اس لیے سے خانے میں سے جو جہاز کی محبت کے ساتھ ساتھ دو وزن طوف ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔ اپنے لئے وہ محافظ واسکٹ سٹیکالی میں بیٹھی اس نے ہن کی تھی۔ اور اسے اس کے ساتھ لگے ہوئے فیٹوں سے مجسم پر یوں باندھ لیں جیسا اُسے اس نے باندھ رکھا تھا پچھ اپنی نشست آگے کی طرف سرکا کر سامنے کی نشست کی پشت پر اپنے دونوں بازو پھیلا دیں اور اپنا سر ان بازوؤں پر جھکا دیں۔ جب جہاز پانی میں اتر جائے گا تو ہم اپنی اپنی بادی سے جہاز میں سے نکل کر اس رچ کی کشتی میں بیٹھ جائیں گے جو دوازے کے پاس سمندر کی لہروں پر ہماری منتظر

بھگی۔ اور پھر سبب یہیں تلاش کرنے والے جہاز ڈھونڈ نکالیں گے تو ہمارا سفر دوبارہ جاری ہو جائے گا۔ گویا اس روٹی کے قول کے مطابق جہاز کا پانی میں گرنا بظاہر ایسا ہی تھا جیسا لاہور کے بے ٹکروں کا مال روٹی کی نثر میں مریم گراما کی کسی صاحبس سپر کوں پہلے نے کے لئے ٹوکی لگایا۔

روٹی ہدایت دے کر چلی گئی۔ لوگ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ بچوں نے نکل پانا شروع کر دیا۔ اور جہاز کے آخری حصے سے ایک بھاری بھر کم قہقہے اور کسی عورت کی بے ساختہ ہنسی کا شور مفاظ واسکٹ اور کپتان کے احکام کے خیال کو میرے ذہن سے باہر دھکیلنے لگا۔ تھڑی ویر میں مسافروں کو کافی پیش کی گئی۔ پھر جہاز گلی کر دی گئیں نیم تائیک کیبن میں کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ نشستیں پیچھے کی طرف سرکنے لگیں اور لوگ نیند کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

میں نے مگر ٹیٹ ملگایا اور نشست کو پیچھے کی طرف سرکا کر ٹاٹ لگیں دواؤں کے دھوئیں کی چادر میں سے جہاز کی چھت کو دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا نیند میں ابھی دیر ہے دماغ پریشانی میں تندر کے ساتھ ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ اپنا کٹ مفاظ واسکٹ اور کپتان کے احکامات کا خیال بھرف میں آیا۔ اور میں سرچنے لگا کہ خوشی پر اگر جہاز گرے تو مفاظ واسکٹ کا سہارا تو خیر کیا پیدا ہو گا۔ لیکن اگر ہمارا جہاز بحیرہ عرب میں دس وقت اڑتا تو کسی حادثے کے باعث لہروں پر جاگے تو یہ سیڑیاں اور واسکٹیں کس کے کام آئیں گی۔ اور کون ان سے نائنو اٹھائے گا۔ بس گرسے اور لگے اگر وہاں

خفگی پر جل کر راکھ ہونا تھا تو یہاں پانی میں ڈوب کر خاتمے کو پہنچے۔ دونوں سورتوں میں شاپہ موت ایک سی اذیت تھی اور خوفناک ہوگی اور ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے کیا رنگی بجلی یوں چمکی جیسے ہم اس کے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ اور مجھے جہاز کے بطن کے اندریوں محسوس ہوا۔ گویا میں نے معد کی کوٹک پر اسے جوش و خروش کے عالم میں اپنے کاؤن سے سُنی ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دکھایا۔ ایک نوجوان مغربی جوڑے کے سوا جو شاید نئی نئی شادی کے بعد پہنی مرن کے چکر میں وطن کی طرٹ یا کسی سیر ہد جا رہا تھا۔ اور جس کی باتیں اور جنسی ختم ہونے کا نام نہ مٹی تھی۔ باقی سب مسافرا اپنی نشستوں پر نیم دراز گھٹنوں پر ہرے رنگ کے کپڑے ڈالے میٹھی نمینہ کے مزے لے رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا گویا تھر تھرا سٹ میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور باہر کی تاریکی محدود ہو بڑھ گئی ہے۔ میں نے کوٹری سے سرنگا کر باہر جھانکا تو تارے اور چاندنی سب گھٹاؤپ اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔ موت بجلی کی تیز چمک سے یہ تپہ چلتا تھا کہ ہم بادلوں کے غاروں کے اندر کسی نامعلوم منزل کی طرٹ بچکے جا رہے ہیں۔ پھر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو علامت کوٹنے لگا۔ کہ میں نے سیدھے ساو سے سمندری جہاز کی بجائے محض وقت کو بچانے کے لئے کیوں برائی جہاز جیسی خطرناک سواری کو قبول کیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر جہاز کا بج ایسی آن نیچے گر جائے تو کیا ہو۔ اور میز و جیلان

فوراً آواڑی کے ہوائی حادثے کی طرف متوجہ کیا۔ جو ۱۹۳۵ء میں ملتان کے قریب پاک ایئر
 کے ایک ہوائی جہاز کو کراچی سے لاہور آتے ہوئے پیش آیا تھا۔ اور جس میں خلیفہ
 ہونے والی قیمتی جائز میں سارے وطن کی قابل قدر شخصیتیں تھیں۔ اور پھر میرا
 خیال اس دوسرے حادثے کی طرف منتقل ہوا جو ۱۹۳۵ء میں جنگ شاہی کی سپارڈیل
 پر اسی ہوائی کمپنی کے ایک اور جہاز کو پیش آیا تھا۔ اور جس میں پاکستانی اور اسلامی ممالک
 کی کئی ممتاز شخصیتیں آنا فانا آگ کے خوفناک شعلوں کی نذر ہو کر مالک کا ڈھیر ہو گئی
 تھیں۔ مرنے والوں میں میرے دو عزیز دوستوں کے علاوہ پاکستان کے دو حبیب
 سپاہی جنرل محمد افتخار خاں اور جنرل شیر خاں اور طبیس اور مراکش کے وہ اعلیٰ العزم
 لیڈر بھی شامل تھے۔ جن کی ذات سے اسلامی ممالک کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ
 تھیں۔ اور جنہیں سامان سال کی غلامی کے خوفناک نتائج نے نہ جانے کس جاں کا ہتھلکا
 کے بعد پیدا کیا تھا۔ مجھے یاد آیا ان جلیل القدر رہتیلوں کے یوں چشم زدن میں ایک ٹل
 سکنے والے حادثے کی نذر ہو جانے پر ملک میں رنج و غم کی کسی بہہ گیر لہر شمال سے
 جنوب تک دوڑ گئی تھی۔ اور پھر کس طرح ایک وزیر با تدبیر نے یہ کہہ کر عوام نے غصے
 کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ کہ زندہ قومیں مرنے والوں کو رو یا نہیں کرتیں کیسی فرد و عاصی کے مرنے
 سے ملک مر نہیں جایا کرتے۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں رادہ پسندی کی آواز
 رو دھامے پان قروش ملا کے تارکینی الفاظ بھی گونجنے لگے۔ جو اس بیان کو سن کر اس
 کے مزے سے بے ساختہ نکل گئے تھے۔ اس نے کہا تھا: بھائی صاحب گو کہیں کہیں

ایک شخص کے مرنے سے ملک مرنے میں ہایا کرتے۔ پر ہم تو سینگ بھی بات یہ جانتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک ہی شخص ملک کی قسمت کو سنوار بھی دیا کرتا ہے۔ آخر قائد اعظم بھی تو ایک ہی شخص تھا اکیلا۔ اب یاروگ لاکھ کہیں کہ ہم بھی ساتھ ہی تھے پر یہ تو ایسے ہی ہے جیسے چرنا کتا کہ اپنی اپنی جگہ پر سب برحق۔ پر پان ہی نہ ہو تو سب بے ضرر۔

میرے ماضی کے اور فوٹو اُبھرنے لگے۔ مجھے یاد آیا جنک شاہی کے حادثے کی خبر اخباروں میں پھپھنے سے قبل جب کراچی سے ٹیلیفون پر وزارتِ کشمیر میں پہنچی تھی تو اس حادثے میں وفات پانے والے ایک ہرولتو جی افسر کی یاد میں تقریبی مجلس کا فری اتفاق کیا گیا تھا اور بڑی دیر تک اس بات پر بھی غور ہوتا رہا تھا کہ مرحوم کی وفات کی اطلاع ان کی نگیم کو کس طرح پہنچائی جائے۔ کرنی فرد اس منوس خبر کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا ذرہ نہ لینا تھا۔ آخر مے یہ پایا کہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک تقریبی رقم تیار کیا جائے اور اسے مکتوب الیہ تک پہنچانے کا بیج فرض مرحوم کے ایک رفیق ادا کریں۔ موصوف جب یہ مراسلے کے مرحوم کے ہاں پہنچے تو اس اندوہناک حادثے سے بے خبر خاتونِ صحن میں بھیٹی سوئٹرن رہی تھیں۔ اور ان کے ننھے ننھے محسوم بچے بڑے مزے سے کھیل کود میں مصروف تھے۔ ان صاحب نے علیک سلیک کے بعد تقریبی خط بالو کے ہاتھ میں دیا۔ آنے والے کے چہرے کی کیفیت سے انہوں نے شاید اندازہ لگایا تھا کہ یہ آدمی زہمت کی نہیں۔ خط کھولے بغیر انہوں نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

مذہب انسان کی تلاش میں شاید انہیں کچھ زیادہ وقت لگ گیا۔ جس سے بیگم کو گھبرا کر پھر پوچھنا پڑا۔ آپ مہی ماوٹے کی خبر تو نہیں لائے؟

اب چارہ ذائقہ کی بات صاف کر دی ہنسنے۔ انہوں نے کہا: بیگم صاحبہ میں بڑے درج سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ کے شہر ہرات کراچی کے قریب ہوائی جہاز کے حادثے میں وفات پا گئے۔ یہ بہت دردناک واقعہ ہے لیکن ہم سب کو جو آپ کے غم میں شریک ہیں توقع ہے کہ آپ پر سے صبر اور تحمل سے . . .

خدا جانے انہیں ابھی دیکھا کہ باقوان، مسلمانیاں اور لغا فوہیں چھوڑ کر تیز تیز سامنے کے کمرے میں اندر چلی گئیں اور پھر دعا دے کے پیچھے سے ان کی ایک جگر پاش اور بانگہ از پنج سنائی دی۔ ایسی چیخ جو سننے والے کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بچے اپنے کھیل کو دے چوٹکے اور بھاگ کر ماں کے پیچھے اندر چلے گئے۔ یہ صاحب چند ساعت صحن میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہئے۔ پھر وہ گھبرا کر آٹھے اور بے لہجے دنگ بھرتے گھر سے باہر چلے گئے۔

میں سوچنے لگا میرے گلے میں وہ کن شخص ہو سکتا ہے جو میرے ڈوبنے کی اطلاع والا لغا فوہ سے کمر میرے بیوی بچوں کے پاس جائے گا اور وہ کیا الفاظ ہوں گے جن کے ساتھ وہ اسے مکتوب الیہ کے حملے کرے گا۔ اور پھر وہ حسین کیس دلدوز ہوگی۔ جو اس کے کانوں میں آئے گی۔ اور آخر کار کس طرح ایک ہنستا کھینٹا گھرا ایک ابدی سوگ کی مہیب تاریکی میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔

خیالات کی رودیرے تصور میں ایک بوناک منظر کی جزئیات کو جمع کرتی جا رہی تھی۔ اور میں گھبراہٹ اور بے چینی کے عالم میں جلدی جلدی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے لگا۔ پھر ایک راحت کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا گویا جہاز کی تھر تھراہٹ بڑھ رہی ہے۔ اور اس کے ٹکپوں کی کموں کموں میں کسی اور ناقابلِ تفریح آواز کا اضافہ ہو گیا ہے۔ حیرت کو رفع کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر میں کھڑکی کے ٹھنڈے سیٹے کے ساتھ سر جوڑ کر باہر کی دُنیا کا نظارہ کرنے لگا۔ آسمان کی گہری نیلی چادر پر سبکے ہوئے روپوں اور نفرتی تارے جھلجھل کر رہے تھے۔ اور دور چاند کا عظیم سفینہ دھیرے دھیرے مغرب کی سنہری دھاری کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ طوفانی بادل جو چند منٹ پہلے میرے ذہن کو پُرمول منظر کی آماجگاہ بنا رہے تھے، نہ جانے اس وقت کہاں چلے گئے تھے۔ پھر اچانک جہاز کے نیچے ایک تیز چمک پیدا ہوئی اور گہرے بادلوں کا مد لگاؤ تک پھیلا ہوا سلسلہ سبیل کی جگہ گاہٹ کے ساتھ چاندی کے پاٹلوں کی طرح چمک کر ایک لمبے میں پھر تاریکی میں غائب ہو گیا میں نے اندازہ کیا کہ اس وقت ہمارا جہاز طوفانی بادلوں کی زدِ کل کرینین میس ہزار فٹ کی بلندی پر باپتیا ہے اور برق و باران اور خطرناک ہوائیں کہیں بہت نیچے ہمارا منہ ٹککتی رہ گئی ہیں۔

میں نے ٹھٹھی پر نظر ڈالی تو ایک بچ بچکا تھا۔ یہ وقت گریج کا نہیں خالص پاکستانی، میرے اپنے وطن کی گھڑیوں کا تھا۔ میں سوچنے لگا اس وقت میرے گھر

کے افراد کسی گہری غیند میں سرشار ہوں گے۔ راولپنڈی کے بانادر گلیاں، مکان اور
 حرمیاں تاریکی سے لپٹ کر کس طرح اڈگھ رہی ہوں گی۔ راولپنڈی ریڈیو سٹیشن کی
 تیسری مجلس کو ختم ہونے ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہوں گے۔ اب سے کوئی دو گھنٹے قبل
 پروگرام کا عملہ، فن کار، ناؤسر اور انجینئر سب دن بھر کے کام کاج سے تھکے ہوئے
 اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہوں گے۔ ساتھ بخش ڈرائیور بھی محلے کے تمام آدمیوں
 کو باری باری گھر پہنچا کر کار کو گیاراج میں منتقل کر کے گھر کو جا چکا ہو گا۔ البتہ اس وقت
 کوئی اگر جاگتا ہو گا تو وہ مکتا پانفروش ہو گا۔ جو محض اس احساس سے دوکان کو رات
 کے ایک بجے تک کھلا رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ کہ مبادا اس پاس کے سیناؤں کے
 آخری ثور سے نکلنے والے تماشاخیوں کو پان اور سرگڑی کی ضرورت لاحق ہو اور ان
 لوازمات لطف کو نہ پا کر ان کی سیر و تفریح کا سامانزاکر کر ہر جائے بیس سوچنے لگا
 اب سے فدا سی دیر پہلے کیپٹل سینا میں آخری ثور ختم ہوتا ہو گا۔ اور مکتا لاکھوں کو یہ
 کہہ کہہ کر پان پشیں کر رہا ہو گا کہ بھائی صاحب سے تو یہ جنگلہ پر اپنے وطن کا ہے
 اور مکتا کے ہاتھ کا لگا ہوا ہے۔

میرے دل میں حسرت کی ایک ٹہنی سی اٹھنی۔ کاش میں بھی آج ان تماشاخیوں
 میں جوتا کاش میں بھی اس جنگلہ بان کی گھردی کھا سکتا۔

وقت کے احساس سے مجھے اچانک خیال آیا کہ صبح جب سات بجے جا
 قاہرہ پہنچے گا تو جماعت کا کیا ہو گا۔ میں نے قہقہے نظر والی اور اندازہ لگایا کہ جہاز

کے عملے کو چھوڑ کر کوئی میں نہیں ہو مسافروں کے گروہ میں ضرور ایسے تھے جنہیں ان چڑھتے ہی حمایت کا خیال ستانے لگا اور وہ جلد سے جلد اس مرحلے کو لے کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ اس افراطی میں نہ جانے میری باری کب آئے گی۔ یا آئے گی بھی کر نہیں؟ دل نے کہا اس معاملے کو ابھی سے نبٹا لیا جائے۔ تو مصیبت آسانی سے ٹل جائے گی۔ نہ بہت سے حمایت کا سامان ٹائٹ بیگ سے نکالا اور اسے بڑی احتیاط سے تلے میں پیٹا۔ اور نیم روشن راستے پر سچ سچ قدم رکھتا ہوا منسل خانے کی طرف پہنچا۔ یہاں تک کہ مسافروں میں سے خدا خواستہ کوئی جاگتا تو نہیں اور یہ دیکھ کر مجھے ایک گونہ اطمینان ہو رہا تھا کہ سب کے سب نیند سے غلوب ہو کر پڑے تھے۔ مددی تھی کہ چند ساعت قبل شور مچانے والا باترفنی جوڑا ابھی پیچھے گھس گیا اور مسلسل قہقہوں کی ٹکان سے پھر ہر کیندگی آغوش میں دم لے رہا تھا۔ اور جہاں کی آخری نشست پر سچو دارو بھی نیند کی گرفت میں آکر حجت کی عزت منہ کئے بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

پھر منسل خانے میں حمایت کو تھوڑے وقت جرنی میری نظر آئینے کے عکس کی طرف گئی اور میں نے اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے آپ کو دیکھا تو سامنے کی شبیبہ میرے ذہنی تذبذب اور طبعی لاابالی پن پر سکرا رہی تھی۔ مگر یا زبان ماں سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ پانچ منٹ قبل جہاں تجھے جہاز کے ساتھ اپنے خوب جانے کا ایسا یقین تھا کہ تیرے ذہن نے تیری وفات حسرت آیات کی خبر کا مضمون بھی تراش لیا

قادر اب کرنے یہ کیونکر باور کر دیا ہے کہ کل صبح تو اس جہاز سمیت ضرور تباہ ہو چکی
ہوئی جائے گا اور راستے میں کسی خطرناک سانحے، کسی مہلک حادثے سے تلخے دوچار
ہونا نہیں پڑے گا۔

میں عام طور پر حجامت پر پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیتا۔ مگر میرا خیال
ہے اس رات میں نے صرف دو منٹ ہی لئے اور جلدی جلدی ریزہ برش 'سابن'
وغیرہ سمیٹ کر انیس تو لٹے میں ٹوٹے باہر آیا۔ پردے کو ٹھیک کر رہا تھا۔ اچانک
یہ سب سامان ایک سیب بھینٹا بسٹ کے ساتھ فرش پر آ رہا۔ کچھ ایسا شور مینہ بڑا جیسے
کبھی نے ٹین کے ٹکڑوں کے ڈھیر پر بھرتا دے مارا ہے۔ میرے تمام ہم سفر ٹرپڑا کر
اٹھ گئے۔ اور سچو دار ڈھپک کو میری طرف آیا میں کوری کو شش میں تھا کہ اس کے
پہنچنے سے قبل کبھی ہوئی چیزیں سمیٹ لوں۔ مگر وہ کچھ اس پھرتی سے میری طرف
بڑھا کہ نصرت سامان اسی نے اٹھا کر میرے ہاتھ میں بٹھایا اور میں شرمندگی کے پڑے
احساس کے ساتھ ان کہے کر رہا کھڑا ہوا ہوا اس اپنی سیٹ پر پہنچا۔

گڑھی میں پہنچنے کی طرف سارا کٹے جب میں بیٹھا نیند کا انتظار کر رہا تھا تو مجھے
کمرے کے سکون میں یہ محسوس ہوا تھا جیسے جہان کی اٹھان مدور چمکا ہے۔ ایسے
معلوم ہو رہا تھا جیسے میں جہاز کے اندر نہیں بلکہ کسی دوست کے ہاں نشست کے
کمرے میں صوفے پر بیٹھا اس کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں۔ ایک مستقل سکون اور اطمینان
ہر طرف چھایا ہوا تھا جس سے جھٹکا تھا۔ تمام کائنات ساکت و جامد بنانے میں لکڑی ہے

اور ہمارا جہاز زمین و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔

جب آنکھ کھلی تو جہاز کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہو رہا تھا کہ ہم اپنی گھڑیوں کو دو گھنٹے پیچھے کر لیں۔ اور نئے وقت کے حساب سے بیس منٹ کے بعد قاہرہ پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ میرے سرانے سجدہ فارڈس! ہمیں چائے کی پیالی مئے کھڑی تھی۔ کھڑکی سے پسیدہ صبح کی بہار چمن چمن کہ اندر آ رہی تھی۔ میرے ہم سفر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور جہاز کے عقبی حصے سے پھر نئے سیلاب ہونے جڑے کی ہر گشت گرد مسلسل قدموں کا آواز ہو چکا تھا۔

میں نے چائے کی بہالی شکریتے کے ساتھ کھڑی تو سچہ وارڈس نے پھر ہی سگراٹ کے ساتھ اپنی لوح وارڈ میں کہا۔

”آپ جلدی سے چائے پی لیں۔ چند منٹ میں تاہرہ آیا کرتا ہے۔“

(P)

میں نے صلاح حسین سے ملے پر کیا تھا کہ وہ ٹھیک دس بجے بجے لینے کے لئے
بروز مل میں آجائیں گے

نہیں نے پہر گھڑی دیکھی ترساڑے زنجیر تھے ہمیں ابھی صالح حسین کے آنے میں آدو گھنٹہ باقی تھا وقت گزارنے کے لئے میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا اور نیچے شارع ابراہیم چاشاکی جنگام پر درویش کو دیکھنے لگا۔ بلند قامت حسین

عمارتوں کے درمیان اس خوبصورت شہر پر لاتعداد خوش پوش مرد عورتیں اور بچے
 بیش قیمت کاریں اور حرّ و حرّہ جاری تھیں۔ اس منظر کو میرے کمرے سے دیکھ کر کوئی شخص
 یہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک مشرقی شہر میں کھڑا ہے میرے سامنے طاس نگ کی عیالان
 عمارت تھی جس نے مصر کی سیاحت کو فروغ دینے کے لئے نہ ہانپے کھلے پاس
 برس میں کتنا کام کیا ہے۔ اس کی عمارت کے سامنے گاڑیوں کی دھڑک پھیل رہی تھی
 سڑکیوں پر چڑھنے اور اترنے والا فیشن ایبل عورتوں اور مردوں کا ہجوم اور اندرون
 عمارت میں خوش پوش لوگوں کا ہجم غیر بالکل دلیا ہی تھا جیسا کسی مغربی شہر میں دکھائی
 دیتا ہے۔ اور پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے بائیس برس پہلے جب میں قاہرہ میں پہلی مرتبہ
 وارد ہوا تھا۔ تو اس غیر مشرقی منظر کو دیکھ کر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی تھی۔

یہ مسئلہ کی بات ہے، اکتوبر کے یہی آخری دن تھے۔ ہمارا جواز جو بمبئی سے
 واپس جا رہا تھا، مات کے وقت کوئی گیارہ بجے کے قریب سوئٹز کی بندرگاہ میں داخل
 ہوا تھا۔ مام طر پر یہاں سے پورٹ سیدنگ کوئی ڈیڑھ سو میل کی مسافت طے
 کرنے کے لئے جہاز کو کوئی اٹھارہ انیس گھنٹے ٹھیک نہر سوئٹز کے پایاب پانیوں کو
 کھنگانا پڑتا ہے۔ یہ سفر اس قدر سست اور بے کیفیت ہوتا ہے کہ بہت سے مسافر
 جو مزید خرچ کو برداشت کر سکتے ہیں اس اداس سفر سے جان بچانے کے لئے سوئٹز سے
 بذریعہ ٹرین قاہرہ پہلے جاتے ہیں اور وہاں بحریہ کی سیر کرنے کے بعد ٹرین کے دوسرے
 ماتے سے شام ہوتے ہوئے پورٹ سید پر جہاز سے پھر آن جاتے ہیں۔ ہم میں سے

چالیس ایک مسافروں نے مہینے سے دوام ہونے سے قبل حاصل ملک سے ملے کر لیا تھا کہ ہم بھی اس مروتہ طریق کے مطابق سوینے پر اتر جائیں گے۔ اور قاہرہ میں گھومنے کے بعد شام کو ریل گاڑی سے پورٹ سید ہینچ کر پھر جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔

جب ہم سوز میں جہاز سے اتر کر ٹرین میں سوار ہوئے میں قورات کے کوئی دو بج رہے تھے۔ رات بہت دلکش اور صاف صاف صبح ہو رہی تھی۔ ٹھنک ہوا ساحل سمندر سے ملک ملک کر صبح کی طرف چل رہی تھی۔ اور بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آہستہ آہستہ کے ساتھ آسمان پر رواں تھے جن کے درمیان سے چاند کا صاف و شفاف چہرہ نکلتا چلا کر رہا تھا۔

ہم ابھی گاڑی میں سوار ہوئے ہی تھے کہ وہ اپنے وہ میل کے سفر پر چاندنی کے کھیت میں جانب قاہرہ روانہ ہو گئی۔ کھڑکھڑاتی بجھکے کھاتی چھتی چلاتی ہوئی ٹرین کی سیٹ پر لیٹا ہوا کھڑکی میں سے نہیں مصر کو دیکھ رہا تھا جو اس وقت ایک وسیع و عریض ریگستان کی صورت میں میرے سامنے ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب سے کوئی پار گھنٹے بعد جب میں اس ٹرین کے بڑی سیٹ پر ایک کونینے والے سفر سے خلاصی حاصل کروں گا قاہرہ کے قدیم تاریخی شہر کی دید سے مجھے کیسا روحانی لطف حاصل ہو گا۔

پھر میرے تصور میں قاہرہ کی وہ عجیب و غریب خیالی تصویریں گھومنے لگیں جنہیں میرے خیال نے اُن داستانوں کی بنا پر تخلیق کیا تھا جو میں نے کتابوں میں پڑھی یا بنگلہ

سے سنی تھیں۔ اور پھر ٹرین کسی سٹیشن پر سے گزری۔ اور اس کے مدغم لمپ و حنولے و حنول
کی مانند نظر آئے معلوم ہوتا تھا۔ روشنی کی خفیف کرنیں و حنوں سے اٹے ہوئے شیشوں
کی تاریک چادر کو چیر کر فضا میں بچکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں جس سے سٹیشن
کی دھندلائی ہوئی جدید عمارت کا ہیولا ازمنہ و سطن کے کسی تاریخی کھنڈر سے مشابہت
اختیار کر گیا تھا۔ یہ نظام مجھے ذرا سے وقفے کے لئے خیالات کی تیز رفتار دنیا سے کھینچ کر
پھر باوی کائنات کی طرف لے آیا تھا۔ مگر پھر جیسے ہی ٹرین صحرا کے سینے پر کھڑکی مارتی
ہوئی تاہرہ کی طرف ٹہرنے لگی۔ میرا قصور مجھے ایک مرتبہ اور اسی قدیم دنیا کے ہمارے
میں لے گیا جسکی بحلول بھلیوں میں میں خدا سی دیر پہلے اپنی ثقافت کے زریں عہد کا نقشہ
دیکھ رہا تھا۔

* میں پھر سوچنے لگا کہ جب دو تین گھنٹے کے بعد ٹرین تاہرہ کے قریب پہنچے گی۔
تو شایعات کی وجہ سے شہر پناہ کے دروازے بند ہوں گے اور ہمیں باہر ہی ٹوک
جانا پڑے گا۔ پھر شاید ہم سب مسافر گارڈ اور ڈرائیور شہر کی تفصیل کے نیچے جا کر کچا تک
کھونے کے لئے محافطوں اور نگاہ بانوں سے درخواست کریں گے۔ اور وہ اندر سے
ڈانٹ کر کہیں گے کہ اتنی رات گئے دروازہ کھولنے کا حکم نہیں ہمیں پوچھنے کا انتظار
کرنا چاہئے۔ پھر فیر کاٹا مارا بھلے گا۔ اذان گونے لگی۔ برطانیہ بولے گا۔ آدمیوں کی آواز
آئے گی۔ اور آخر کار پابیوں کے گھٹے کی جھنکار ہوگی۔ پھر بھاری قفل کے کڑکھڑانے
کا شور سنائی دے گا۔ اور وہ قیامت دروازے کے اُونچے پٹ۔ کئی تو مسند شیشی غلام

ایک صیب چرچاہٹ کے ساتھ تھکے چکھتے ہوئے بے باتیں گے۔ پھر ایک سیاہ نام موٹا آزد لمبا تڑنگا خراج سرفراز تک نکلیے پڑے گئیں کاشتیں پارہ پڑنے پاؤں میں کامائی جوتاڑے کمر میں گھنٹیاں لٹکتے، منہری عصا ہاتھ میں سے خد شکاروں کی سمیت میں شہر پناہ کے دھندلے سے غراماں خراماں باہر نکلے گا۔ اور یہیں شہر میں آنے کی دعوت دے کر واپس چلا جانے گا۔ اور پھر اندر سے ہٹو بچو کی آوازیں بلند ہوں گی۔ تیز ٹاپوں کا شور اٹھے گا۔ اور دس بارہ شہسوار سبز حملے باندھ سے سفید جھتے پہنے برقی رفتار گھوڑوں کو اڑا رکھتے، مہریر کرتے، صمو کی خاک کو آسمان کی طہ آرائی، گولی کی طرح ہمارے پاس سے نکل کر دیگستان میں غائب ہو جائیں گے پھر ہم گلی کوچوں میں داخل ہو کر دیکھیں گے کہ بہر طوت، اونچی اونچی سولیاں اور عسکری کھڑے ہیں، جن کی ختہ نشینوں اور داڑیوں میں ہلکتی فرش کچے ہیں، منڈیں لگی ہیں صندوقیاں دھری ہیں، کمروں میں جا بجا کاشانی قالین، مشدی خالیچے، دستہائی نمونہ، چلبی آئینے موجود ہیں۔ دروازوں پر دیبا اور حریر کے پردے پڑے ہیں، بچتوں سے جھاڑ اور بنڈے ٹنگ رہے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ طلائی شمعداڑوں میں رنگین ابرک کی ٹمٹیاں لگی ہیں۔ خود سوزیں سے اگر اور زبان کی خوشبو میں آئندہ ہیں۔ باہر صحن میں حوض اور ضرور کے اندر رخارے چھوٹ رہے ہیں۔ باغ میں قسم قسم کے میوؤں سے درخت جھکے پڑتے ہیں اور ٹہنیوں میں ٹنگ بٹک کے مرغان خوش امان چھپا رہے ہیں۔ دھڑ بالا خانے کی کھڑکیاں کھل ہیں۔ حریر و پرتیاں کی چلیپوں کے تھکے پری روزانہ بیس ہزار

خراسانی اور اویگینیوں، قلماتیوں، ترکوں، بھٹنوں، اذکبیل کے جبرٹ میں
 بیٹھی سونے کے چڑاؤ گنگھوں سے گیسو سنوار رہی ہیں۔ سرم سوا کے باہر ایک اور ہی
 منظر ہے۔ رنجی سویرا ہی ہے۔ پھر بھی ایک ہجوم ہے کہ مادرے اور حرا جا رہا ہے۔
 بانادوں میں عجیب چل چل رہا ہے۔ دکانیں سج رہی ہیں۔ تاجروں کی کونیاں چین و
 ماحین، ایران و توران، کشمیر و ہند، شام و روم، عرب و عراق کے صناعتوں کے تیار
 کئے ہوئے مال کی فائنش کر رہی ہیں۔ خود فروش کی دوکانوں سے پلاؤ متھن، قبیئے
 قرے، مان پاٹھے کباب بچکے کی اشتبا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ بازار میں اب
 کھوسے کھواچے، سبز اور گیسے، ساڈیاں اٹھتر گاکوں اور تاجروں کو لاشے
 لادے پھر رہے ہیں۔ ابھی ابھی شرنپاہ کے بڑے پانک سے کسی حک کا ایک قافلہ
 داخل ہوا ہے قاشائوں کے ٹھٹھنگ گئے ہیں۔ بھکاری شور مچاتے دوڑے چلے
 آ رہے ہیں۔ کوئی پانچ ساونٹ ہیں جن کے شیلٹے پھینے اور تاجرات، ریشم اور
 طلا کے پارچات سے بھرے ہوئے ہیں۔ دوسو خچروں پر بڑے بڑے صندوق نقد
 زرد و جابر کے لدے ہیں اس بیش بہا سادو سامان کی حفاظت کے لئے سو غلام
 دشت تہقان اور دنگ و روم کے سنان و شمیر اور کمان و گرز سے مسلح تازی اور تکی
 اور عراقی گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ وسط میں میر کارواں ایک منڈو
 عربی راکب پر سوار، خلعت فاخرہ زیب تن گلے میں بصرے کے موتیوں کی الہ چکے
 پریل بن کمر میں خزانہ پیشابض، انگلیوں میں غیر ذی، علیم، عقیق، یاقوت میرے کی

انگوٹیاں، بڑے ٹھٹے اور مطراق سے سین ویاہ کے سلام کا جواب دیتا چلا آ رہا ہے
 کچھ دور جا کیم شہر کی غلہ سرائے جس کے باہر شمشیر زن لنگی غلام کندھے پر لگی تھواریں
 لئے پہرے پر مامور ہیں۔ اندر بچا ہلک کی محراب سے فلاہٹ کے چوہدار، سیادل
 گزہ بردار سینہ تلے آنکھیں کھولے اذن کے منتظر کھڑے ہیں۔ سامنے شد نشین پسندیاں
 بھی ہیں۔ گاؤں کے لگے ہیں۔ ان پر عالم و فاضل درویش اور املاہ اونٹنی دھڑلے اپنے اپنے
 پائے اور مرتبے پر آکر کھڑے ہیں درمیان میں ایک حققت مرتضیٰ بچا ہے اس پر ایک
 پر مہلان شخصیت اعلیٰ کے مہوسات اور جواہرات اور موتیوں کے ہار پہنے زانو پر جڑاؤ
 دستے کی شمشیر بردار رکھے در بخت کے ٹکٹے سے سہارا کئے بڑی شان و شوکت سے
 بیٹا پرے سے عقب و قدام سے عرضی گزاروں کے حالات سن رہا ہے ﴿﴾

تہ جانے کتنی دیر تک میں اس حسین دنیا کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر غنیمت آگئی۔ اور پھر جو
 آنکھ کھلی تو ہماری ٹرین قاہرہ کے شیش پر کھڑی تھی۔ اور جدید دنیا کے بنگلوں کا شور
 صوبہ اسرافیل کی طرح غنیمت کے ماتوں کو جگا رہا تھا۔ میں نے اُسی کمر کی میں سے جس نے
 پچھلے سات بجے تیرم شہر کی رعنائیوں میں جھانکنے کی غنیمت دلائی تھی۔ جدید شہر کی
 رنگینیوں کو ایک نظر دیکھا تو اس کسیر مختلف نظام سے یاروں پر کریں جیسے پہلے
 گیا۔ یہ کونسا قاہرہ تھا جو میرے سامنے تھا؟ یہاں شہر پناہ تھی نہ حرم سرا۔ تھلے تھے نہ
 شمسوار۔ وہ رومان پر و شہر جس میں نے پہلے سے سے کراس وقت تک فوٹو لہین علی
 کی کہانی ابو سیر حمام کے تھے۔ جمہور کی داستان نو معروت کے افسانے میں

الف میلے کے ذریعے میسوں مرتبہ زندہ و پائندہ دکھایا تھا۔ نہ چالے کہاں تھا پنشنوں
 موٹروں، ٹرید کاروں کا شہر، تپیلوں کوٹے اور فراک پہننے والے لوگوں کا شہر،
 سینما، تھیٹر، آپا کا شہر، ہڈیوں، بیٹرواؤں کا شہر، تہذیبِ عامہ کے جملہ مظاہر کا
 اجنبی اور غیر دلچسپ شہر اپنے ہنگاموں کے ساتھ ضرور موجود تھا۔ لیکن قاہرہ جسے
 میں جانتا تھا کہیں نہیں تھا۔ میں بڑے مغموم دل کے ساتھ ٹرین سے نکل کر اپنے
 ساتھیوں کے ساتھ چپ چاپ باہر جا کھڑا ہوا۔

نہشتے کے بعد سراسر لگ کے گائیڈ میں شہر دکھانے کے لئے آگئے اور ہم
 ٹریوں میں تقسیم ہو کر ان کے ہمراہ قاہرہ کی سیر کو نکلے۔ شہر کے جدید حصے سے مجھے کوئی
 رغبت نہ تھی لیکن جب ہم قلعے کے پاس پہنچے اور میں نے غازی صلاح الدین ایوبی
 کے پر عظمت حصہ دار اس سے ملحقہ وہ ایوان افزہ مسجد جسے محمد علی پاشا نے تعمیر کیا تھا
 دیکھی تو میری نظروں میں ایسا کدو شہنشاہ کی تصویر پھر ابھرائی۔ اور پھر جب ان گنجان لود
 تملیک گلیوں میں پھرتے پھرتے پرانے عمارت تعمیر کی کم سن عمارات کے مایوں میں سے
 نکلتے ہم نامہ شہر میں جا پہنچے تو ایک شانیدہ کے لئے مجھے اس دلفریب منظر کی دیکھ
 یں محسوس ہوا گویا میں کچھ عجیب و غریب اسلام کے درمیانی دور کے کسی صوبائی ولایت میں
 الف میلے کے کسی رومان پروردہ شہر کی خفیف سی جھلک دیکھ رہا ہوں۔ وہی پرانی عمارت
 کے اونچے اونچے مکانات جن کے معمور کوں سے کبھی وہ لود نکلتا ہے نیچے کی دنیا کا جائزہ
 یا کرتی تھیں۔ وہی تنگ و تاریک گلیاں جن کی دیواروں کے ساتھ لگ کر کبھی مغلقات اور

مسلمین جمہور اسلام کے دل کی دھڑکنیں سنکرتے تھے، وہی مشرقی کیفیت ایشیائی ماحول اور مخصوص طرز زندگی جو ہمیشہ ہمارے تصور میں زندہ و پائندہ رہے گی، ہرق النیل اپنی دوکانوں کی سہاڑے کے انداز اور کاندھوں کے لین دین کے طور طریق کی بنا پر کچھ ایسا پائنا دکھائی دے رہا تھا جسے الف میلے کے کسی مصور ایڈیشن میں سے انشا کریاں جدید قاہرہ کے پنوں میں بسا دیا گیا ہو۔

— اس جھٹے سے باہر نکلے تو ہمارے سامنے دریائے نیل کا ٹیلا پانی کسی نصفی کی طرح اپنے خیالات کی دنیا میں گم غالباً اس حلیل القدر تہذیب کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتا چپ چاپ بھرہ دم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاز سے چھ ہزار برس قبل اس کے کناروں پر پہلی پھولی تھی۔ اور ساٹھ سین ہزار برس تک دنیا کو اپنی عظمت سے مرعوب کرنے کے بعد اپنی طبعی موت مر گئی تھی۔ وہ سے اس کے پانیوں پر حرکت کرنے والے بھرے اور ان کے سفید بادبان یوں دکھائی دے رہے تھے گویا تلیاں سطح آب پر اپنے پر سکیر سے بے خودی اور خود فراموشی کے عالم میں پانی کے باؤ پر نیچے کو پھسل رہی ہیں۔ —

سامنے کی طرف دیکھا کہ وسط میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گائیڈ نے کہا: یہ روضہ ہے۔ اور اس میں وہ مسجد ہے یہ بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا تعلق خلافت راشدہ کے عہد زریں سے ہے۔ اس مسجد کے قریب میں وہ چوکوں کوں ہے جسے معیاس النیل کہتے ہیں۔ اس کے فدیے

آج بھی صدیوں پہلے کی طرح نیل کی طغیانوں کا اندازہ کرنے کے لئے دسیا کے چڑھتے اور اترتے ہوئے پانی کو ناپا جاتا ہے۔

ہم میں سے کچھ آدمی جب قنور مینوں سے اس جزیرے کو دیکھنے لگے تو ان کی دلچسپی کا اندازہ کر کے وہ بولا یہ یہی وہ جزیرہ ہے جہاں سے فرعون شمس ثانی کی ملکہ اسی نے صبح کے دھندلکے میں وہ مسند و قہر دیکھا تھا جس میں شیر خوار نبی حضرت موسیٰ بٹے اطمینان سے بیٹھے امواج نیل پر جھولا جھولتے ہوئے چلے جا رہے تھے :

— اس فقرے نے مجھے چونکا دیا اور میں اس روایت کی صحت یا کمزوری پر غور کرنے بغیر اصل واقعے کی جزئیات کے تصور میں کھو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ منظر صاف عتد کی رفتار سے میرے تخیل میں گھوما جس کی طرف قرآن پاک میں سورہ انفصص اور سورہ طہ میں بڑے تفصیل اشارے ہیں۔ اور میں نے یوں محسوس کیا گویا حبیب یہ واقعہ پیش آیا تو میں یہیں کھڑا اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس تخیلی تصویر میں اُس سبانی صبح کا منظر ہر طرف جلوہ فرما تھا جو ازل سے طوائفی نیل کے مختص ہے۔ قرمزی شفق بنگلوں آسمان ٹنڈے جھونکے، ٹسک بانوسیم گدرا سکوت گویا ساری کائنات سو ادھنگار کئے نئے دن کے استقبال کے لئے آنکھیں فرشِ راہ کئے ہوئے ہے۔

اس پس منظر کے اوپر فرعون شمس ثانی کا پر شکوہ محل تھا جس کی شاگین دیواروں کے ساتھ روڈ نیل کی آہستہ خرام موجیں اٹھکیلیاں کر کے ملکہ کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں جو اس پہلے سے میں کینیزوں اور خاصوں کے ساتھ محل کی بالائی منزل کے

ایک در چھپے سے اپنے معمول کے مطابق صبح کا قاشا کر رہی تھی۔ وہ بظاہر اس جگہ پر غور نظر سے کی وید میں کھوئی ہوئی تھی۔ لیکن در پردہ اس کا دل گھرے رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ ایک ایسی ہی سہانی صبح کے پرسکون لمحات میں اس کے شوہر فرعون میس ثانی نے وہ بھیا تک خواب دیکھا تھا۔ جس کی تعبیر دربار کے کاتبوں اور متجربوں نے یہ دی تھی کہ اس کی حکومت کی بربادی بنی اسرائیل کی مقبوضہ قوم کے ایک لڑکے کے ہاتھوں عمل میں آئے گی۔ اور وہ صبح رہی تھی کہ آخر وہ قتل و خون کب تک جاری رہے گا جو فرعون کے اس حکم کی تعمیل میں کئی برس سے مصر کی سرزمین میں بہایا جا رہا تھا۔ کہ جب کسی اسرائیلی کے ہاں روکا پیدا ہوگا اُسے قتل کر دیا جائے۔ مگر اس کے استغراق کو ایک خواص کی اس چٹخنے پریشان کیا۔ جس میں حیرت و استعجاب کی گہری جھلک موجود تھی بلکہ اپنے خیالات سے چونکی اور اس نے لڑکی کے ہاتھ کے اشارے کی طرف نگاہیں دوڑائیں تو دیکھا ایک صندوقچہ نیل کے بناؤ پر چلا آ رہا ہے اور آہستہ آہستہ محل کی دیواروں سے ٹکرا کر دھڑک بڑھ گیا ہے۔ جہاں محل کا زینہ پانی میں اترتا ہے۔ بلکہ کے حکم پر کنیزوں اس صندوقچے کو پانی سے نکال کر اوپر لائیں۔ آہستہ نے صندوقچے کا ڈھکنا اٹھایا تو دیکھا ایک صندوقچہ جس کی بڑی بڑی روشنی آنکھیں کھلکھلا کر اس کے شکوک و شبہات پر سنس رہی تھیں۔ جو بے اطمینان سے بیٹھا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ بچے کو دیکھ کر ملکہ کا دل فرط مسرت سے جھٹوم اٹھا۔ وہ اُسے صندوقچے میں سے نکال کر گود میں لئے محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ کسی شوخ و طعنا کنیز نے کہا: یہ تو خود حال سے اسرائیلی

معلوم ہوتا ہے۔ رب راع ذکر سے کہیسی ہمارے آقا کے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟
 لوہا کی نے جس وقت یہ خطرناک فقرہ کہا میں اس وقت فرعون ملک کی خواب گاہ
 میں داخل ہو رہا تھا یہ الفاظ اس کے کانوں میں پہنچے تو وہ ایک کلمہ کی طرف بڑھا
 بچے کو دیکھ کر نفرت و حقارت سے کہنے لگا۔ یہ منوس بچہ اگر اسرائیل کی اولاد میں سے
 ہے تو اُسے قتل کرنے کے لئے جلاہوں کے حوالے کر دو۔

آئیں اُسے بچے کی ہشیاں پر بوسہ دیا۔ پھر اُس کے باپوں میں اٹھکیوں سے کلگی
 کرتے ہوئے کہنے لگی۔ اے کسی غیبی طاقت نے اگر ہماری پناہ میں لا ڈالا ہے۔ تو میں
 اسے قتل نہ ہونے دوں گی۔ کیا عجب کہ یہ اجنبی بچہ ہمارے گوارہ محبت اور آغوش
 تربیت میں پروان چڑھ کر تیرے خواب کی تعبیر بننے کی بجائے ہمارے لئے آبر و رمت
 ہو۔

جب ملکہ کے اصرار اور سفارش کے سامنے ہڈ حان فرعون خاموش ہو گیا تو شقیق
 ایزیدی جس نے اس کی تمام حرم و احتیاط کے باوجود خود اُسی کو اُس کے دشمن کا وہی
 مقرر کر دیا تھا، انسانی فہم و وقوت کی کمزوری پر ہنس دی۔

میں خاصے پرکھڑا اس جزیرے کو دیکھ رہا تھا تو ایک اور منظر میرے تصور میں آجھڑا
 جس کا تعلق ان روایات سے تھا جو حضرت موسیٰ کی ملکوت کے بارے میں میں نے سن یا
 پڑھ رکھی تھیں۔ غالباً وہ واقعہ بھی یہیں اسی جزیرے میں فرعون کے جلسہ راسی میں کہیں پیش
 آیا تھا۔ جس وقت میرے تصور میں موجود تھا میں دیکھ رہا تھا کہ حضرت موسیٰ

میں غیبتِ زبانی کی گود میں بیٹھے معصومیت سے اس کے جسم پر پہنے ہوئے زبردست سے کھیل رہے ہیں۔ پھر ان کا ہاتھ ان موتیوں کی طرت اُٹھ گیا ہے جو فرعون کی وارسی میں چمک رہے ہیں۔ اور ان کی مضبوط گرفت کو کھولنے کے لئے اس کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ موتیوں کے ساتھ اس کی وارسی کے چند بال بھی اکھڑ آئے ہیں۔ یوں نے بچے کو خنگی کے عالم میں ایک درباری کے حماسے کیا ہے کہ وہ اسے قتل کر دے لیکن آسیہ کی سفارش چر آڑے آئی ہے۔ اور فرعون نے حکم کے اس خیال کا جائزہ لینے کے لئے قتل کا حکم عارضی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔ مگر معصوم بچہ مصر کے مذہبِ خدا کے احترام سے واقف نہیں۔ وہ تو آگ کی چنگاری اور کھجور کے دانے میں بھی امتیاز نہیں کر سکتا۔ فرعون کہہ رہا ہے کہ اگر اس بچے نے انگارے سے ہاتھ کھینچ لیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اب وہ حکم دے رہا ہے کہ چند کھجوریں اور جلتے ہوئے کوئلے امتحان کے لئے شیر خوار بی کے سامنے رکھے جائیں۔ غلام یہ چنریاں کے حاضر ہو گئے ہیں۔

دل کے ساتھ کبھی انگاروں کو اور کبھی موشی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر آسیہ کے لبوں سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ہے۔ کیونکہ بچے نے ہلک کر انکھ جھپکے ہیں ایک انگارا اٹھ کر منہ میں ڈال دیا ہے۔ مگر بچے کی ملبلاہٹ کے ساتھ خود تو پٹ اٹھی ہے۔ اور اس نے ہلک کر یہ انگارہ درو سے چلاتے ہوئے بچے کے منہ میں انٹلی ڈال کر انگارا دیا ہے۔ لیکن معصوم بچے کی زبان پر آجے پڑ گئے ہیں اور اب وہ شاید ہمیشہ کے لئے

کھٹ کا اسیر ہو گیا ہے ۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم تاریخی عجائب خانے میں داخل ہوئے ۔ اس عجائب خانے میں عہدِ فرعون کا وہ ساز و سامان محفوظ ہے جو پچھلے سو سال کے دوران میں جگہ جگہ سے کھدائی کے ذریعے حاصل ہوا ہے ۔ اس عجائب خانے میں دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ فرعون مصر کی ساری تہذیب اپنی تمام جزئیات سمیت جوں کی توں اُس کے سامنے آکر قائم گئی ہے ۔ حدیث ہے کہ اس تہذیب کے اونٹے کا رندوں سے لے کر اصل باقی تک اُسے اپنے سامنے یوں دکھائی دیتے ہیں ۔ گویا دن رات کے مسلسل کام سے تھک کر سوتے کی خاطر یوں ہی خدا اذگھ سے گئے ہیں ۔

اس عجائب خانے میں فرعون کے محلات کا سامانِ آرائش ، ان کے شاہی ملبوسات ، بیش قیمت زیورات ، ہتھیار اور اسلحہ ، ان کے روزمرہ کے استعمال کی جملہ اشیاء خود ان کی محفوظ شدہ لاشیں پڑی ہیں اور دیکھنے والے کو جہتِ بھرتی ہے کہ یہی وہ دھڑے تاج والے بادشاہ تھے ۔ جو ارض و سما کے خالق حقیقی کے مقابلے پر اپنے آپ کو بھراتے تھے اور جن تک باریاب ہونے میں عمریں صرف ہر باقی تھیں اور اب یہی وہ میاں ہیں جو عجائب خانے میں تماشاخیوں کے لئے سیر و تفریح کے لوازم میں شامل ہیں ۔ اور ہر وہ شخص جو چند بجٹے واغنے کے ٹکٹ پر سُرٹ کر سکتا ہے ۔ ان ویرناؤں کو ان کی پوری بے بسی کے عالم میں چند گز کے فاصلے پر سے دیکھ سکتا ہے ہم سب سے پہلے اس جتے میں گئے جس میں تو تیخ آمون کے مقبرہ سے کا

سازو سامان کھلے۔ دولت و ثروت کی اس بہتات کو دیکھ کر انسان کی آنکھیں پتھر سی جاتی ہیں۔ اور اُسے حیرت ہونے لگتی ہے کہ کسی فردِ واحد کی ذاتی املاک میں سونے کی اس قدر افراط بھی ہو سکتی ہے۔ پھر ان کثاریا کی نفیس صنعت اور زیورات کی ساخت کو دیکھ کر تڑپ چلتا تھا کہ عہدِ پارینے کے مصری کاریگر اور فن کار اپنی نبیرہ مندی میں عہدِ جدید کے صنّاعوں سے کتنا آگے تھے۔ حالانکہ یہ سب سازو سامان اور ذرو مال ایک ایسے بادشاہ کے عہد سے متعلق تھا جس کے تخت نشین ہونے سے قبل مصری سلطنت کی اصل شوکت اور مصری شائستگی کی حقیقی شان بڑی حد تک بخت ہو چکی تھی۔ م

اس مال و منال کے ذخیرے میں ایک شاہی صندوق نے میری توجہ کو بطور خاص اپنی جانب کھینچا۔ یہ کرسی جس کے بازوؤں کے سرے پر ٹھوس سونے کے شیروں کے سر بنے ہوئے تھے۔ شاید بادشاہ کو بہت مرغوب تھی۔ قدیم مصریوں کے عقاید کی رو سے مرنے والے کی وہ تمام اشیاء جو اس کی ذاتی ملکیت ہوتیں اور جنہیں وہ بہت عزیز رکھتا۔ میت کے ساتھ اس خیال سے دفن کر دی جاتی تھیں کہ موت کے بعد نئی زندگی میں متوفی کو ان کی ضرورت پیش آئے گی۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی زندگی اس دنیا سے کونچ کرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتی، مرنے کے بعد اُسے ایک نئی زندگی میسر آتی ہے۔ جسے حیاتِ ثانیہ کہنا چاہئے۔ اس حیاتِ ثانیہ میں مرنے والے کی راحت کے لئے کھانے پینے، پہننے اور اوڑھنے کی اشیاء کے علاوہ اس کے ذاتی اشغال کے لوازم مثلاً شکار و تفریح کی چیزیں بھی ساتھ دفن کر دی جاتی تھیں۔ تاکہ

نئی زندگی میں اس کی روح کو وہی ساز و سامان دینے لگا۔ وہ نظر آنے جو اس کی پہلی زندگی میں اس کی راحت اور دلچسپی کا باعث تھا۔ سو تو خراج آسمان کے مقبرے کے ساز و سامان میں سے یہ صندوق بھی ملتی تھی۔ اس صندوق کی پشت کے اندرونی حصے پر ایک نہایت خوبصورت تصویر بادشاہ کی شاہی زندگی سے متعلق نقش تھی۔ جسے میں دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ موت کے وقت تو خراج آسمان کی عمر غالباً بیس برس تھی۔ اور اس کی ملکہ کی اس سے دو برس کم۔ جب یہ بادشاہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا تو ملک کی حالت ابتر تھی۔ بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ اور حکومت کا دبدبہ جاتا رہا تھا۔ اس سے قبل اخاتون بادشاہ نے مصر کے قدیم دیوتاؤں کی پوجا کیسے مروت کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ مندروں کے دولت مند پر دولت اور کلاہن مندروں کے چڑھا دے کے کثیر مال و زر کے بل بوتے پر دوبارہ کے معاملات اور حکومت کے نظم و نسق میں بڑا دخل دینے لگے تھے۔ اس بادشاہ کی چھیتی بیوی نفرتی جو اس کی سوتیلی بہن اور بائبل نسل کی شاہزادی تھی۔ پجاریوں کے خطرناک اقتدار کو بہ نظر حقارت دیکھتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو ان حقائق کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس نے اندر اور منجھلے بادشاہ نے جرات اور دلیری سے کام لے کر صد ہا سال کے پرانے مذہب کو بدل کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔

چنانچہ جب تو خراج آسمان سربراہ آنا مند ہوا تو صد بادشاہوں کی پہلے صرف ایک سورج دینا کی پوجا ہوتی تھی۔ باقی مندرا جڑے پٹے تھے۔ پجاریوں کا کوئی

پرساں حال نہ تھا۔ دیوتاؤں کے چڑھلوے اور ندما نے نوقت تھے۔ مندروں کی جاگیریں چھین چکی تھیں۔ اور ملک کا صد ہا سال پرانا مذہب اپنی تقدیس اور عظمت کھو کر بے ابرو ہو چکا تھا۔ توخ آمون نے تخت نشین ہوتے ہی لوگوں کی بد حالی کو جانپ لیا اور فوراً اپنے بزرگوں کے پرانے مذہب کو از سر نو رائج کیا۔ مندروں کی جاگیریں بحال کر دیں۔ بیلوں، ہوتھواروں کو پھر سے رواج دیا۔ قدیم دیوتاؤں کی مورتیاں سونے چاندی کی بنوا کر انہیں جواہرات سے مرتع کیا۔ اوریوں عوام اور پجاریوں کے دل میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنائی۔ ملک میں امن اور اطمینان کے بقراء ہونے سے زمر بادشاہ کو مصر کی ختم ہوتی ہوئی شرکت اور شتاباً سیاسی اقتدار اور سر نو قائم کرنے کے لئے فرصت مل گئی تھی معلوم ہوتا تھا۔ مصر کو پھر ایک اور باتدبیر بادشاہ تیسرے آگیا ہے لیکن ابھی توخ آمون کے عہد کو چھ برس بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ اچانک فوت ہو گیا اور بے اولاد ہونے کی وجہ سے سلطنت کا سارا بوجھ اپنی سولہ سالہ ملکہ کے خفیت کندھوں پر چھوڑ گیا۔ ملکہ اپنے چاہنے والے شہر پر دل و جان سے فدا تھی۔ اس کی بے وقت موت سے مغزوہ میرہ کا دل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ اور اتنی بڑی ظلمت کو سنبھالنا اور پجاریوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور اصرار کی بیشہ دانیوں کا مقابلہ کرنا اس کے لئے بڑی بڑی سیاسی مشکلات کا باعث ہو گیا۔ چنانچہ وہ چند مہینوں میں سازشوں کا شکار ہو کر قتل ہو گئی۔

مذکرہ شاہی صندل کے پشت پر جس تصویر کو کھڑا میں دیکھ رہا تھا۔ وہ

تو حج آموں اور اس کی ملکہ کی خانگی زندگی اور ان کے باہمی پیار و محبت کا ایک
 دلنریب منظر پیش کر رہی تھی۔ مصوٰر نے بڑی چابکدستی سے دکھایا تھا کہ زمر
 بادشاہ ایک مرتع گرمی پر بیٹھا ہے۔ اور کس ملکہ اس کے سامنے کھڑی ہوئے
 اخلاص و محبت سے اس کے بازوؤں پر خوشبو لگا رہی ہے۔ بظاہر یہ گھریلو زندگی
 کا ایک عام سا منظر تھا۔ لیکن رنگوں کی آمیزش، جذبات کی کیفیت اور اشکال کی حرکت
 سے اس تصویر میں مجھے ایک ایسی جان نظر آئی جس سے وہ کہ یہ خیال گزرتا تھا کہ
 یہ بلکڑی کے تختے اور رنگوں کے لیپ میں سے اُبھر کر ایک ہا و دانی حیثیت حاصل
 کر گئی ہے۔ جتنا عرصہ میں اُسے دیکھتا رہا مجھے یوں معلوم ہوتا رہا کہ یا وہ اُداسی جو موت
 کا پیش خمیدہ ہوتی ہے اور وہ غم جبے یا رود و گار انسان کے دل کا احاطہ کر لیتا ہے
 اس محشر و شوکت کے عالم میں بھی تو عمر بادشاہ اور کس ملکہ کی آنکھوں میں سے
 جھانک رہا ہے۔

عباب بن خلف نے ایک اور جگہ پر انیسویں خاندان کے فرعونوں کی محفوظ شدہ
 وائیں رکھی تھیں۔ ان میں بیس شانی اور مرن پتہ کی میاں اس نسبت سے جو انہیں
 حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل سے ہے ہم مسافروں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ بیس شانی
 کے بیٹے اور عمارت فرعون مرن پتہ کی لاش کو دیکھ کر انسان کے اصل انتہام کے
 احساس سے ہم سب کی ایک وحشت سی ہونے لگی۔ اور میں سوچنے لگا کیا یہ وہی
 شخص تھا جس کے قدموں کی خاک پر انسان کی بلند اور روشن پیشانیوں

انہما وخصیت اور شرم نیاز میں رگڑی جاتی تھیں کیا یہ وہی شخص تھا جس کے سامنے بڑے بڑے شہروروں کا زہرہ آب آب ہوتا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جو اپنے جلال شاہی اور زبدیہ حکومت کے زعم میں اپنے آپ کو اپنی رعایا کا خالق گردانتا اور خود کو دیوتاؤں کی طرح پھراتا تھا۔ اور جس نے سورۃ طہ کے مطابق اپنا اور خدائے الیزال کے عذاب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مبارکے ان ماحول سے جو حضرت موسیٰ کے معزوں سے متاثر ہونے لگے تھے بغض کے عالم میں کہا تھا کہ جب تم میرے ہاتھوں اپنی سزا کو پہنچو گے اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ محمد میں اور موسیٰ کے خدا میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیر پا ہے؟ مگر یہ سارے یقین ہلکا مال پھلے کی بات تھی۔ اس وقت یہ شخص موت کی ابدی گرفت میں یوں پڑا ہوا تھا کہ یا زندگی میں اسے تکبر و نفرت نے چھرا لکھ دی تھا۔

فرعون مرن پتہ کی مٹی سے کچھ فاصلے پر کھڑا میں خود گردا تھا کہ سورۃ یونس کے یہ الفاظ کہ فَإِنِّي لَأَكْفِيكَ بَدَأْتُ الْفُلْكَ لَمَّا كُنْتُ خَلْفَكَ أَيْتَهُ لَكُمُ دَارُ تفسیر کے ساتھ میرے سامنے تھے۔ اور میں حیرت سے کھڑا دیکھ رہا تھا کہ یہی وہ شخص تھا جس کے جوہر استبداد سے غوت کھا کر بنی اسرائیل حب سے بھاگے تھے تو انہیں بزورِ شمشیر اپنی غلامی میں واپس لانے کے لئے یہ اپنی قہار فوجوں کے ٹڈی دل کو لے کر دھاوا مارتا آندھی کی طرح صحرا کی خاک اٹاتا بحیرۃ قلزم کے کنارے پر جا پہنچا تھا۔ اور جب حضرت موسیٰ کے عصا کی ضرب سے سمندر کا پانی

پسٹ کر سنگین دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ اور ترم و سرائیل درمیان کی خشکی پر سے پار
 ہو چکی تھی تو اس نے ان کے تماقب میں اپنا تھوڑا سی راستے پر اس خیال سے ڈال دیا
 تھا کہ یہ چند لمحوں میں جاگتی ہوئی خلقت کو مٹا دے گا۔ اور پھر جب بھرپور راج کی دیواریں
 ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئیں اور شخص اس اپنے شاہانہ کتو فرار و سپاہیانہ جاہ و جلال
 سمیت سمندر کی لپیٹ میں آ گیا تو یہ بے اختیار چلا یا تھا کہ موسیٰ میں تیرے خدا پر ایمان
 لاتا ہوں "اس اعلان پر جواب آیا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ فَالْيَوْمَ نَخْلِفُ بِبَنِي إِسْرٰءِیْلَ
مِنْكُم مَّنْ خَلَقْنَا آدَمَ "اب تم ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو سمندر کی
 موجوں سے بھالیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آئے گے والے ہیں۔ قدرت
 حق کی ایک نشانی ہو۔"

اور میں سوچ رہا تھا کہ قدرت حق کی یہ نشانی کس طرح تین ہزار سال تک
 سنگین اور خفیہ مقبرے میں پوشیدہ رہ کر آخر بعد کے آنے والوں کے لئے آج اب
 محائب خانے میں عبرت کا سبق دے رہی تھی اور اس کے طفیل کیونکر ماضی اور حال
 ایک دوسرے سے جمل گیر ہو گئے تھے۔

اس محائب خانے کی سیر کے بعد ہم سب مسافر جب عہد گذشتہ کے حیرت کھلے
 سے نکل کر عصر جدید کی عجول جلیوں میں وارد ہوئے۔ اور پانچ سو سال کے قریب پورٹ سمیڈ
 کے لئے روانہ ہوئے سے قبل پائے کے لئے شیمپڑو ہوٹل کے طعام خانے میں پہنچے
 تو اس وقت میرے سامنے وہی دنیا تھی جس کا نظارہ بیس برس کے بعد میں آج ایک

مرتبہ پھر اس ہوٹل کے کمرے سے صالح حسین کی انتخاب کے دوران میں کر رہا تھا۔

(۳)

نمبر سیح کے وقت کسی رومی ادیب نے لکھا تھا کہ دنیا کو ہمیشہ افریقہ سے کوئی
 ذکوئی نئی چیز ملتی ہی رہی ہے۔ غالباً وہ اس برعکس کے اصل باشندوں جنگلی جانوروں
 اور صدائیات کا ذکر کر رہا تھا جن کے متعلق اس نے یورپی ستیاحوں کی داستانیں سن
 رکھی تھیں۔ اور جو کچھ اس نے لکھا تھا وہ بڑی حد تک صحیح تھا۔ صدیوں تک یہ سرزمین
 ایک ایسا پٹا سراور خطرناک خطہ ارض رہی ہے جو اپنے لاتعداد عہدہ کسی کو آسانی سے
 نہیں بتاتی تھی۔ اس کے عجیب و غریب ہدیہ اور جھیلیں جن کے کناروں پر خوش آشام
 اور دم خور وحشوں کی آبادیاں تھیں۔ ان کے گھنیرے بھلے اور تاریک غاریں جن میں
 خوفناک درندوں کی فرمانروائی تھی۔ اس کے ہونک سمجھا جو ہر فوجی حیات کیلئے پیغام اجل
 تھے۔ اس کے وادیاں اور پہاڑ جو اپنے بطن میں ایک بیش بہا معدنی دولت کو چھپائے
 ہوئے تھے۔ اس کے خود سراور جنگجو قبائل جو دن رات موت سے کیلتے اور زندگی سے
 جنگ کرتے تھے۔ اس کے پراسرار مذاہب جن کا لہر مدار انسان کی توہم پرستی اور
 اس کے احساسِ عیم و ہراس پر تھا۔ مذہب و دنیا کے لئے ایک ایسا سرسبز تلاء تھے
 کہ حبیب بھی ان میں سے کسی کا حال اس پر کھتا تو اس کے چرچے ویر تک اُسے مجر
 حیرت چھوڑ جاتے۔

رومی ادیب نے جو بات دو ہزار سال پہلے کہی تھی۔ وہ آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے
لیکن فرق اتنا ہے کہ جہاں پہلے اس کا تعلق انفریقہ کے باشندوں کے موسم درواز
اس کی مصنیات اس کے وحوش و طیور سے تھا۔ وہاں اب اس کا واسطہ اس ملک
کی سیاسی بیداری سے ہے۔ آج سے بیس تیس برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ وہی
ملک جہاں کے عوام مشنریوں میں بمیلر کیوں کی طرح بکتے تھے اور جس کے چتے چتے
پر جنسی حکمرانوں کا قبضہ تھا، ایک دن استبداد سے نبو و آزما ہونے کے لئے غم ٹھونکے
کھڑا ہو جائے گا۔ اور اپنی محبت و استقلال کا ایک میلر مستقل ثبوت اس مہذب دنیا
کو دے گا۔ جہاں سے دارو ہونے والے غاصبوں نے اس وحشی دنیا کے چتے چتے
پر قبضہ مخالفانہ جبار رکھا تھا۔ اگر یہ رومی ادیب آج زندہ ہوتا کہ دنیا میں ماؤناؤ بہامت
کی جدوجہد سے متاثر ہو کر نہ جانے کیا نکلتا اور مقامی باشندوں نے جس طرح ریفٹ
سے سپین کو مراکش سے فرانس کو، بیلجیئم سے اٹلی کو یا مصر سے انگریزوں کو نکال باہر کیا
ہے۔ اس کا سال اس کے قلم سے کیسی کیسی و لغزب داستانیں لکھواتا۔

لیکن ان مقام واقعات کے مقابلے پر جہاں سب سے زیادہ اس کی حیرت
کا موجب ہوتا وہ ۱۲۳۲ء ^{۱۲۳۱} ہجری کی کا وہ انقلاب تھا جو قاہرہ میں میری آمد سے قریباً
تین ماہ پیشتر چند جہاں بہت وطن پرست فوجیوں کی ماسی سے عمل میں آیا تھا۔
نہ جانے وہ اس حقیقت پر کس قدر متحیر ہوتا کہ یہ انقلاب انہیں مصریوں کی اولاد میں
تھے جنہوں نے فرعون مصر سے لے کر فاروق کے عہد تک چھ ہزار سال کے طویل عرصے

میں ہر نوعیت کے ظلم اور بے انصافی کو برداشت کرنے کی ایک عادت اختیار کر لی تھی۔ اور جن پر کسی قسم کے جوہر نقدی کا کوئی مستقل اثر نہ ہوتا تھا۔

جس وقت سارح حسین مجھے لینے کے لئے میرے کمرے میں داخل ہوئے میں اسی انقلاب کے اسباب پر غور کر رہا تھا میں سوچ رہا تھا کہ وہ حالات کس قدر زور فرما ہوں گے۔ جنہوں نے کرنل جمال عبدالناصر اور ان کے ساتھیوں کو بان پکھیل کر بادشاہت کا تختہ مٹانے کی ترغیب دلائی تھی۔ برٹل کی ٹیڑھیوں پر سے اترتے وقت سارح حسین نے ان حالات کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور وہ بتانے لگے کہ مصر جہاں معاشرتی طور پر پامیر اور غریب کے درمیان ہمیشہ سے بہت بُد رہا ہے۔ گزشتہ ایام میں کی مہیشی اور براشرتی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ انقلاب سے پہلے ملک کے حالات وہی ہو چکے تھے برٹل ٹیڑھیوں میں۔ دس میں نظر آتے تھے۔ اور جنہوں نے لینن کی قیادت میں باشوریک بغاوت کو پیدا کیا تھا۔ سیاست بے ایمانی کا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ سارے ملک میں لیڈروں کی بجلیات اور رشتے داروںٹ کھوٹ پر اتارے ہوئے تھے۔ شہری حکام اور فوجی افسر بھی اخلاقی بدعنوانیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ فلسطین کی جنگ کے نئے فوج کو ایسے ناکارہ ہتھیار تقسیم کئے گئے تھے جنہیں فلسطینی مقتدر افراد نے (جن میں بادشاہ کا نام بھی دیا جاتا تھا) اٹالیہ سے سستے داموں خرید کر کئی کروڑ روپے منافع حاصل کیا تھا۔ مال طور پر ملک بد حالی کے گوشے میں گرج چکا تھا۔ روٹی کی قیمت اتنی چڑھ گئی تھی کہ اسے کوئی خرید نہ تھا۔ جہاں مہنس پاشاؤں کی

آمدن کئی لاکھ روپے سالانہ تھی۔ وہاں عام لوگوں کو دو وقت کی روٹی کے لئے جان توڑ محنت کرنا پڑتی تھی۔

سیاست میں ایک پُرانا کھیل اقطاعوں کے وقت سے کھیلا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب قوم ملکی حکومت سے اس کی بدعنوانیوں کا محاسبہ کرنے کی فکر کرے تو اس کی توجہ کسی اور مسئلے کی طرف لگا دی جائے جتنا پختہ مصری عوام عرصے سے انگریزوں کے جنگوں سے خلاصی حاصل کرنے کی بے درجہ میں اُلجھے ہوئے تھے اور انہیں اس امر کا پوری طرح اندازہ نہ تھا کہ ان کے مصائب کی ذمہ داری خود ملکی عناصر پر کس حد تک عاید ہوتی تھی۔ اس خزان کی آنکھیں کھلیں اور وہ بادشاہت جس کی بنیاد محمد علی پاشا نے سترہ سو اسیں رکھی تھی چند جیسے فوجی افسروں کے ہاتھوں ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء کی رات کو تاریکی شب میں نابود ہو گئی۔ اور مصری عوام مجھ ہزار سال کی زبوں حالی کے بعد پھر اپنی تقدیر کے مالک بن گئے۔

صالح حسین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: مصر کی تاریخ میں کوئی واقعہ اس انقلاب کی اہمیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم نے چار ہزار سال تک فرعونوں کی طاقت کی۔ پھر یونانی حملہ آور ملک پر چھا گئے۔ پھر رومیوں کا عہد شروع ہوا۔ ان کے بعد رومنوں کی باری آئی۔ پھر عرب فاتحین نے مصر کی اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔ ترکیہ کے عروج پر ہم آلی عثمان کے زیر نگیں ہو گئے۔ ان کے انحطاط پر پہلے فرانسیز پھر انگریزوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ پھر غریبوں کا دور شروع ہوا۔ ہر زمانے میں

کوئی مذکور فی مصیبت ہم پر حاوی رہی۔ لیکن خادوق کا عہد حکومت تو ہماری ملی بے برائی کا فتنہ تھا۔ اگر ہم اس کا خاتمہ ذکر دیتے قرآن نے دلی مصیبتیں عورتِ افس کے مفہوم کو سمجھنے سے ہمیشہ پہلے نامزد جاتیں۔ سوچئے اس سے بڑی تذلیل کیا ہو سکتی ہے۔ کہ یہی زمیں اپنے ملک کے ناموس کی حفاظت کے لئے دشمن کے مقابلے پر اترتی ہیں۔ اور آپ کی سپاہ کے بہترین آدمی محض اس لئے گاجرمونی کی طرح کٹ کر ڈھیر بچلتے ہیں کہ ان کے پاس جو اسلحہ ہے وہ چوہوں کو مارنے کے قابل بھی نہیں۔ خدا کو سہ آپ کے ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو ملکی استمال کی کسی چیز کو خریدتے وقت اپنے ذاتی منافع کی خاطر ان جانوں کا سودا کر ڈالیں۔ جن کے ذمے ناموس و وطن کی حفاظت کا فریضہ ہے ؟

جہنم سے باہر نکلنے پر مجبور سے صالح حسین نے پوچھا کہ ان کے دفتر کو دیکھنے کے بعد میں کہاں جانا چاہوں گا۔ مجھے دو مقامات کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ جامعہ اذہر اور اہرام۔ جامعہ اذہر کو میں یہ جاننے کے لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے جو طلباء تحصیل کی خاطر یہاں آتے تھے۔ ان کی فہمی حالت کیا تھی۔ اور اس درگاہ میں تدوین کا اندازہ کیا تھا۔ اپنے ملک کی مذہبی درسگاہوں کے ہم نہاد باغ تھیں لوگوں کو دیکھنے کے بعد میں ان اداروں اور ان کے سد یا منتجان سے کچھ مایوس سا تھا۔ مجھے ہمیشہ یقین ہوتا تھا۔ کہ مذہبی تعلیم انہیں کا رآمد اور بہتر انداز بنانے کی بجائے عموماً کٹا اور بے معنی فرد بنا ڈالتی ہے۔ ان درسگاہوں سے پڑھ کر نکلنے کے بعد

ان میں تنگ خیالی، کوتاہ بینی، غرور و تکبر اور کئی قسم کی افسوسناک کمزوریاں جن سے عام تعلیم یافتہ لوگ اکثر معصون و محفوظ رہتے ہیں۔ جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ یہ لوگ جنہیں عوام الناس "ملا" کے طنز یہ لقب سے یاد کرتے ہیں کسی مقتول گھرانے میں شادی یا بیاہ یا ولادت و موت کی تقریبات کے علاوہ کبھی دیکھنے میں نہیں آتے ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے باوجود کوئی سنجیدہ مقتدی ان کا نام جاننے یا ان سے ہاتھ ملانے کی آرزو نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے ان آج ملا یا کٹ ملا محض عیب و غریب خلیے کے آدمی ہی کا لقب نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت کا نام بھی ہے۔ جس کے لازم تعصب اور تنگ دلی کی گہمی اور بے خبری، نخوت و عزت یا وہ گوئی اور ہٹ و حرمی ہر وہ عیب ہے جس سے مقتول انسان کو سوں بھاگتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ملا تو وہی فرض اور کرتا ہے جو مسیائیں میں پادری کے ذمے ہوتا ہے لیکن جہاں پادری ایک خاص تکریم اور عزت کا مستحق ہوتا ہے۔ وہاں ملا اس احترام سے عموماً محروم رہ جاتا ہے جو اپنے منصب کی وجہ سے اس کے استحقاق کا جزو تھے۔ پادری اپنے گرجے میں شریک عبادت ہونے والے تمام نفوس کو ذاتی طور پر جانتا ہے۔ وہ ان کی خوشی اور غم میں برابر کا شریک ہوتا ہے ان کے مسائل کے حل تجویز کرتا ہے۔ ان کی معاشرتی گفتنیوں کو سمجھاتا ہے۔ حدیہ ہے کہ وہ ان کے گھروں میں اُسی طرح داخل ہوتا ہے۔ جیسے وہ گھنے کا فرد ہی نہیں۔ "باپ" بھی ہے۔ لہذا نادار کے رشتے سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ یہی

دہر ہے کہ مغرب میں اگر کسی کہنے میں پانچ لڑکے ہوں تو وہاں ایک فوج میں،
 دوسرا سیاست میں اور تیسرا تجارت میں شامل ہونے کی تیاری کرتا ہے۔ وہاں ایک
 غالباً پادری جتنا بھی چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں شاید ہی کوئی معقول گھرانہ
 ایسا ہوگا۔ جسے اپنی اولاد کے کسی رکن کو مسجد کا پیش امام یا خطیب بنانے کی خواہش
 ہو۔ چنانچہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جامعہ اہل ہر کے اساتذہ اور طلباء کس رنگ میں رنگے
 ہوئے تھے۔ اور ان پر لفظ کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا تھا یا نہیں۔

میر عندیہ معلوم کر کے صالح حسین نے ماسٹ کے ساتھ کہا: آج جامعہ کا دن ہے
 اس لئے مجھے افسوس ہے کہ تعطیل کی وجہ سے جامعہ بند ہے۔ چونکہ کل آپ میرے
 ہمراہ اسکندریہ جائیں گے۔ اور پرہوں آپ کو دوسری ضروریات ہوں گی۔ اس لئے
 جامعہ اہل ہر کو کٹنا ہی پڑے گا۔ البتہ پانچ بجے کے قریب ہم اہل ہر کی سیر کو ضرور
 چلیں گے :

سپر کو جب ہم غزہ کی طرف روانہ ہوئے تو قاہرہ کے بازاروں اور سڑکوں
 پر بڑی گھاگھنی نظر آ رہی تھی۔ غیر ملکیتوں کی بجائے ہر طرف مصری عوام کی افراط
 تھی۔ سڑکوں پر قہقی کاریں دوڑ رہی تھیں۔ جن میں مصری کہنے دکھائی دیتے تھے۔
 اس کے بارونق بازاروں کی کھول دوکانوں کے گردیم کے دھانے شیشے کی
 دیباہیں، فلورڈ سنٹ روشنیاں مصریہ کی تجارتی جاذبیتوں کی نمائش کر رہی تھیں۔
 ٹھیکر اور آپا، سینا اور تارخانے، شینہ بلیں اور قص گاہیں شام کی آمد کے

ساتھ انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ بالی مٹکے ذہن میں
 کبھی مہذب شہر کا جو نقشہ ہے۔ وہ قاہرہ میں اس وقت ہر طرف جلوہ فرما رہے مگر
 اس قتل کے ساتھ اس غربت کے آثار بھی جگہ جگہ اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔
 جنہوں نے فوجی انقلاب کے امکانات کو روشن کیا تھا۔ اور سڑکوں پر خوش پوش افراد
 کے آگے پیچھے کیس کیس ایسے خستہ حال لوگوں پر بھی نگاہ پڑ جاتی تھی۔ جن کے ننگے
 پاؤں ہسیدہ ٹرپیاں تار تار فیضیں اُس عہد کا حال سنارہی تھیں جو ابھی ابھی ختم
 ہوا تھا۔ پھر حجب نوٹے پھوٹے سامان کے بوجھ کے نیچے بانپتا ہڑا کوئی مرل گدھا کبھی
 پاشا کی چکیلی اور تیز رفتار کار کے پاس سے گزرتا تو وہ تصویریں نظر کے سامنے آ جاتیں
 جو امارت اور غربت کا فرق واضح کرنے کے لئے ماسکو چھاپ چھاپ کر غریب ملکوں
 کو بھیجا کرتا ہے۔

ہم ایک بادلت بانار میں سے گز رہے تھے تو ہمارے بائیں جانب کے
 علاقے کے اندر چھپی ہوئی کسی مسجد سے عصر کی نماز کی اذان کے آخری جیلے میرے
 کان میں پہنچے۔ اور میرا دھیان فوراً ان مساجد کی طرف گیا جو جدید و قدیم قاہرہ میں جگہ
 جگہ نظر آتی ہیں۔ اور جن میں سے بعض کو میں اپنے سابقہ سفر کے دوران میں دیکھ چکا
 تھا۔ اس شہر میں حضرت عمرو بن العاص کی تاریخی مسجد سے لے کر عبد جبار کی نئی
 تعمیر شدہ مساجد تک ہر غناء خدا ایک عجیب شان دکھاتا ہے۔ حضرت میدہ زینب
 بنت فاطمہ الزہرا کی مسجد اور حضرت امام شافعی کی مسجد جس کے اسٹے کے ساتھ

سلاطین اور بیگیاں کا قبرستان ہے۔ وہں پر ایک لکھی ملاوی کرتی ہیں لیکن تلے کے اندر سلطان نصیر اور محمد علی پاشا کی مسجدیں اور شرمیں سلطان یرموق اور سلطان حسن کی مسجدیں کچھ اور ہی کیفیت رکھتی ہیں۔ گویا ان سب میں خود بصورت اور نظرواں مسجد تو وہی ہے۔ جو محمد علی پاشا سے منسوب ہے۔ جو اپنے جھاڑوں، ناز و نعل، بھلی کی روشنیوں، رنگین ستونوں، منقش نمروں اور فرش کے تائینوں کی وجہ سے بالکل دلہن کی طرح بھی برائی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حسن آرائش کچھ اسی مسجد سے مخصوص نہیں۔ قاہرہ کی بیشتر مسجدیں ایسی آلات اور مختلف ہیں کہ وہاں سے اٹھ کر جانے کو بھی نہیں چاہتا۔ ان مسجدوں کو دیکھ کر مجھے اپنے ہاں کی بعض مساجد یاد آئیں جن میں عیدین کے دو گنا زادہ اکرنے والوں کو اکثر بھاگ جانے کی ترغیب ہوا کرتی ہے کبوتروں اور چمکاڑوں کی بیٹیوں سے اٹے ہوئے فرش، نمائندوں کے عطری مزاج اور دکامی کیفیت کے نماز حوض، کانٹے سے رنگے ہوئے غسل خانے، استنجے کے ڈھیلوں سے اٹن ہوتی تالیاں، خود تلاجی کی غلاخت پسندی، اس کے دخل کی پریشان خیالی۔ اس کی تقریر کی غیر ضروری طوالت۔ اس کے بعد بھی اگر بارے وطن کی مساجد اس امر پر مرثیہ خرواں ہوں کہ نازی نہ رہے تو شکایت کس سے کی جائے۔

پھر ہم اذکبیر باغات کی طرف بڑھ گئے جس کے مغرب میں قاہرہ کی غیر ملکی آبادی کے ایک ہیبت بڑے جھٹے کی رہائش ہے۔ اس علاقے میں سرکاری دفاتر، جدید رنگ کی دکانیں اور یورپین طرز تعمیر کی اماست گماہوں کی افراط ہے۔

اور یہاں زندگی اپنی گمراہی سے مقامی قوتوں و اثرات کی ایک مستقل نائنس میں مضبوط نظر آتی ہے۔ اذکیہ سے گزر کر کئی بار دفنی سڑکوں کو طے کرتے ہوئے ہم قصر النیل کی حسین شاہراہ پر جانکے جوشرو کو اس دریائی جزیرو سے جالماقی ہے۔ جس پر اسمیل پاشا کا محل اب ہوٹل کی صورت میں موجود ہے اور جس میں کمیوں اور گھوڑوں کے ہربالے میدان اور محکمہ زراعت کے پُرسکھ دفاتر ہیں۔ یہاں سے یہ پُرنضا سڑک دریا کے مغربی کنارے پر اتر کر عزہ کے اصل راستے سے مل گئی۔ جس کے دونوں طرف حسین سایہ دار پیریلوں کی دو دوریہ قطاریں اہرام کے قرب تک چلی گئی ہے۔ جو یہاں سے چھوٹی چھوٹی مخروطی عمارتوں کی طرح خاصے کی دھند میں تیرے اور ملتے نظر آ رہے تھے۔

چڑیا گھر اور پھر محاب خانے کے قریب سے گزر کر ہم عزہ کے قصبے کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارے ایک طرف دریا کا اونچا کنارہ اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض ویرانہ میدان ہوا تھا۔ جس کی اوجھل میں اونٹن اور بکریاں ادھر ادھر تنگی بڑھیں اور خاردار جھاڑیوں کو چوم رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ساتھ ٹرام کی پٹری بھی چھوٹی تھی۔ جس پر مسافروں سے بھری ہوئی گاڑیاں شاہراہ سے عزہ کی جانب اور عزہ سے شاہراہ کی جانب آ جا رہی تھیں۔ وہ ایک طرف دریا سے فدا ہٹ کر جدید عزہ کے ہوٹلوں، آرام گاہوں، دفاتر اور دوکانوں کی سنگی عمارتیں سودج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ اسان سے پرے قدیم قصبے کے مٹاے

مجھ پر چڑوں کے اوپر سے کھجور اور مٹاؤ کے وزخوں کے سر نظر آ رہے تھے۔ ان کے مقابل
صحرانے کے بہتے پہاڑ کے مینار بڑھتے اور ابھرتے میری دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ
وہی کھیل کھیل رہے تھے جو سمندر میں گزرتے ہوئے جہاز کا نظارہ کرنے والوں کی قہج
کے ساتھ کھیلایا کرتا ہے۔

شام کے اڈے سے گزر کر کار ایک ریٹوران کے مقابل ٹک گئی۔ جیسے ہی ہم
باہر نکلے وہاں ہیر لوگ جن میں زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی۔ دوکانوں کے سایوں میں سے
نکل کر ہم پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ اور عربی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تندہ
ماترہ کے لازم از قسم جیسا ہلکے لٹاف سے دوزخ چاکلیٹ، سگریٹ، سانس کی
مال کو ٹھٹھا کر لے والی گولیاں، چھنے کی مٹھائی اور ایسی ہی دوسری چیزیں بیچنے
کے لئے چلائے گئے۔ ان خزانچہ فروشوں میں دو تین لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اس
احساس کمتری کی وجہ سے چپ چاپ ہمارے سامنے اپنے مال لئے کھڑے تھے
کہ ان کے پاس ڈبوں میں بند کی ہوئی کھجور اور ترکی راحت، الحلقوم جیسی ویسی چیزوں
کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان خزانچہ فروشوں کو لاتے بھڑتے چھوڑ کر ہم آگے بڑھے۔ اور آخر
ایک سال خردہ اور استاد زمانہ سے گھسی ہوئی سنگی شرک کر کے دیت میں
سے گزرتے ہم ان میناروں کے سامنے جا پہنچے۔ جو چٹانوں پر سے اٹھ کر آسمان
تک جا پہنچے تھے۔

جن لوگوں نے اہرام کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ کسی بیان اور تقریر

سے ان کی حقیقی شان اور شکوہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح لاہور کی بادشاہی مسجد کے متعلق کسی زبانی تفصیل کسی تحریری یا عکسی تصویر سے اس کی اصل عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح انہیں یا کم از کم ان قیمنوں اہرام میں سے ایک۔ یعنی مینارِ کبیرہ کو دیکھنے بغیر یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے کیونکر پہاڑوں کا جگر چیر سکتا ہے۔ اور اپنے فانی ہاتھوں کی بادی تخلیقات سے کس طرح مظاہرِ قدرت کا دل دہلا سکتا ہے۔

بصر کی پُراسرار زمین پر جو عصرِ حاضر کی پہیم تعبیریں اور تحقیق کے باوجود ابھی تک نیم دریافت شدہ بھید ہے۔ تاریخِ انسانی کے اولین تہذیب و تمدن کے بانی فرمانرواؤں نے ایسی ایسی پر شکوہ عمارات ارفعِ اشلان مندرِ عظمت ماب مہبد اور تختِ اُفریج تہتے تعمیر کئے تھے۔ جن کا کوئی جستہ جواب آج کی مذہب دنیا اپنے تمام فنی کمالات کے باوجود پیش نہیں کر سکی۔ اور جن کا شاہانہ دستار ان کی موجود و بربادی کے عالم میں بھی ان سے جدا نہیں ہو سکا۔ ان تمام عمارات میں سب عظیم تعمیرِ مینارِ کبیرہ ہے جو پتھر اور مصالحے کی صورت میں عہدِ قدیم کے بے مثال علم و فضل، فنی استعداد اور کسبِ کمال کا ایسا زندہ جاوید ثبوت ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عہدِ جدید اپنے سائنسی فنی اور ٹیکنیکل ترقی کے باوجود عہدِ پارینہ کی مہماتِ علم ہندسہ حساب، نجوم اور فنِ تعمیر اور اس کے کمالِ نقاشی صناعی اور سنگ تراشی کو پہنچ نہیں سکا۔ چھ ہزار برس سے یہ عمارت سینہ زمین

پر غیب کا ڈرے پشیمانی فلک سے سر بھڑانے محکم و قائم کھڑی ہے اور انسان کے اپنے تباہ کن بافتوں کی غارت گری کے ماسوا وقت اور عناصر قدرت کی کوئی تخریبی کوشش اسے فنا کرنے اور اس کی عظمت کو مٹانے میں کامیاب و بامراد نہیں ہو سکی۔ اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جو آدم سے لے کر اس وقت تک قدرت کے عناصر اور کائنات کی طاقتوں کو مطیع و منقاد کر کے خلافتِ ارضی کا نام اپنے سر پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے عزائم میں کس بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔ مینا یکہیر جو تھے شاہی خاندان کے دوسرے بادشاہ خوف نے اپنے مقبرے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ چونکہ قدیم مصریوں کے عقیدے کے مطابق مردے کا تمام اساس البیت اور ساری وطن و دولت اس کے ساتھ دفن کی جاتی تھی۔ اس لئے خوف کو اس پیش بہار و مال کی حفاظت کا بہت خیال تھا۔ جو سالہا سال کی فوج کشی اور ہمہ فتوحات سے اس نے ذاتی املاک کے طور پر تاراج شدہ اور باجگزار ملکوں سے اکٹھا کیا تھا۔ اس گنج گرانایہ کو لٹیروں کی دستبرد سے مصنون رکھنے کے لئے اس نے اپنے مرقد کو ایک سنگین حصار کی صورت میں تعمیر کیا۔ جس کی ساخت میں قدامت پتھر کے کئی لاکھ تیس تیس چالیس چالیس من وزنی ٹکڑے استعمال کئے گئے۔ یہ عمارت اپنی بنیادوں پر مربع فٹ چوڑی اور چوٹی تک ۵۵ فٹ بلند ہے۔ اس کے قرب میں اسی خاندان کے دو اور بادشاہوں خائفراع اور منکاراع کے دو اہرام بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ دونوں اسی مینا یکہیر

کی نقل ہیں۔ اور اپنی بلندی، وسعت اور فنی کیفیت میں اس سے کتر ہیں۔
 مینار کبیر کی تعمیر پر ایک لاکھ انسان جو مصر کے مختلف علاقوں اور اس کے
 زیر نگین ملکوں سے خاص طور پر اس کام کے لئے لائے گئے تھے یہیں سال
 تک محنت مزدوری کرتے رہے۔ ان میں سے ہزاروں تعمیر کے دوران ہی میں
 مرٹ گئے۔ اور ہزاروں جو اس کی بنیادوں کے کھداتے وقت عنفوانِ شباب
 میں تھے۔ اس کی تکمیل پر جانکاہ مشقت کے باعث پیش از وقت کمالت اور
 بڑھاپے کو پہنچ گئے۔ شاید دنیا کی کسی عمارت پر آج تک اتنے انسانوں نے
 اتنی مدت تک ایسی جفاکشی سے کام نہیں کیا۔ اس عمارت کے لئے سنگِ خارا
 کی چٹانوں کو صحرائے فریہ میں تراشا جاتا تھا۔ پہلے یہ عظیم ٹکڑے پہاڑوں پر سے
 کاٹے جاتے۔ پھر انہیں نیل کے رستے کشتیوں میں ڈال کر غزہ میں چاروسل نیچے
 دریا کے ہاؤ پر لے جایا جاتا۔ یہاں انہیں رستوں اور ذخیروں کے ذریعے چمپی
 ہوئی ریت پر سے کھینچ ٹھسیٹ کر مینار کی جگہ تعمیر پر پہنچایا جاتا۔ پھر انہیں جبریل
 اور ہزاروں محنت جان غلاموں کے قوی ہاتھوں کے توسط سے اوپر کھینچا جاتا
 اور کسی نامعلوم مصلحے کے انسانی ناخن کی وہارت سے بھی باریک روے
 سے ایک دوسرے کے اوپر جوڑا جاتا۔

اس عمارت کے چاروں طرف ایک صیب اسرارِ اعلاہ کئے جانے دکھائی
 دیتا ہے۔ اور انسانی فہم حیران رہ جاتی ہے کہ کس طرح ایک زبردست شخص کی

ذاتی آرزو کے ایک مصیب خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی خاطر ایک لاکھ نوے دست
اشخاص ہیں بس تک اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہے۔ اس عمارت کا نظارہ کرنے کے
دوران میں نہیں غور کروں گا۔ کہ اپنی غریب تعمیر کے میں سال کے دوران میں اس عیار
نے نہ جانے انسانی ظلم و شقاوت، ذلت و بے آبروئی اور مذیت و دریکے کیسے
کیسے جگر خراش ایسے اور غائبش ثروت اور نو و شوکت کے کیسے کیسے و لغزب مناظر
دیکھے ہوں گے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کوئی شخص میرے پاؤں تلے کی منوں ریت کے
اندھ فون ان ہزاروں مزدوروں، مہاروں اور غلاموں کے دل کی کیفیت کو نہا پ
سکتا۔ جو سالہا سال تک اس عمارت کی تعمیر کی خاطر بھوک اور تنگ غنماہہ استکراہ
علاقت اور نقابہ تائیر اور ظلم کے با تھوں تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر گہر گر
دم توڑ پکے تھے تو وہ اندازہ کر سکتا کہ ہر وہ چیز فطرتِ انسانی نے جس کی آرزو
کی ہے یا قرائے انسانی نے جس کے حصول کی خاطر معائب جھیلے ہیں کسی یکسی
صورت میں اس عمارت کی تعمیر میں ضرور کار فرما رہی ہے عشق و محبت و حقیقت
و ایمان، الحاح و فرمانبرداری، خود و بقا کے بلند جذبات کے ساتھ ساتھ وہ
خواہشاتِ سفلی جن کی تکمیل کی خاطر انسان دوستوں سے فریب اور ساتھیوں سے
بے ایمانی کو اپنا شعار بناتا ہے یا جالب زرا و حصولِ انعام کا بندہ بن جاتا ہے
یا حرص و ہوس کی زندگی کا ماحصل سمجھنے لگتا ہے۔ اس عالی شان عمارت کی تکمیل
میں بارہ کے شریک رہے ہیں۔

اور پھر میرے چشم تصور کے سامنے وہ تمام انسان جو چھ ہزار برس قبل اس عمارت کی تعمیر پر مامور تھے زندہ اور متحرک نظر آنے لگے۔ غربت و افلاس اور محنت و مشقت کے مارے ہوئے سیاہ خام ننگ و طرنگ مزدوروں اور غلاموں کی بسیوں لمبی لمبی قطاریں تھیں جو آگ برسانے والے سورج کی جھلستی ہوئی شاعلوں کے نیچے تپتی ہوئی ریت پر پسینے میں شراب و تھکن سے چھوڑ دی گئی تھیں۔ شاہ خاں کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو رستوں اور ذخیروں کی مدد سے کھینچا تے ہوئے داخل اور مشقت سے پھولی ہوئی رگوں کے ساتھ کنارہ خیل سے جانب مسجد گھسیٹ رہے تھے۔ ان کے سر پر جلا دھشت کا رندے ہاتھوں میں دڑے اور چابکیں لئے لٹکا۔ لٹکا کر کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ اودان کے کورسے کی ممبروں سے خمیت و زار آدمی زخمی ہو ہو کر گر رہے اور لڑکھڑا کر کھڑکھٹنے کی کوشش میں دم توڑ رہے تھے۔ دریا کے کنارے سے لے کر اس کی چوڑے تک جو چٹان کے اوپر تھیرے کی کرسی کے لئے تعمیر ہو چکا تھا۔ ایک قیامت برپا تھی جس میں نفسا نفسی کی کیفیت آشکارا اور میدان حشر کا ہنگامہ نظر آتا تھا۔ کارندے اور منتظمین پیک پیک کر کارگیروں اور معماروں کے کام کا ہانہ لے رہے تھے۔ ہر طرف ایک بے پناہ شور بلند تھا جس میں احکامات کی صدا میں اور مہلبت کا کی ہدایت گونج رہی تھیں معلوم ہوتا تھا۔ کائنات کو خدا کے کسی عذاب نے آیا ہے۔ اور انسان کو عور و نگروں کی حالت اختیار کر گئے ہیں۔

ہر ایک کشت میں دکھائی دینے لگا۔ جیسے یہ تمام کاروبار چاہک تک گیا ہے
 اور دوسرا مل خلی کی طرف سے ایک غبار اٹھا ہے۔ جو تہہ و تک ہادی طرف بڑھتا آ رہا
 ہے۔ اب یہ قریب آ گیا ہے اور قریب آ گیا ہے اور اب اس غبار کے اندر سے
 ایک شاہانہ مجلس مصر قدیم کی تمام قدنی شرکت کے ساتھ ہماری طرف بڑھنے لگے
 تھامے پر سے سونے چاندی کے زیورات، زرخیز لباس، مہلت ہتھیار، امانتی دانت کے
 متورماندہ ماہان کی آب و تاب سوسج کی تیز روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔
 مجلس میں سب سے اگے پایادوں کا لشکر جرات ہے۔ اس کے پیچھے گھڑ چڑھی فوج کے
 رملے ہیں۔ ان کے عقب میں مسلح شتر بواہوں کے دستے ہیں جو بڑے شاہانہ تزئین و
 احتشام اور فوجی ضبط و انتظام کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ ان کے بعد دوبار مصر کے
 مقتربان خاص کی جماعت اپنے اپنے مرتبے کے طہرات زیب تن کئے آ رہی ہے
 ان کے عقب میں شاہی منبروں اور سامروں کی ٹولیاں ہیں جن کے پیچھے شاہی مسجد کا
 مہا پجاری اور اس کے پیلوں دیوتا آسن سع کے میل کا پڑا اکاہن اپنے اپنے منصب
 کے شاہی نشانات اٹھوں میں سے پجاریوں کی اس منڈلی کے سر کے اوپر بڑے وقار
 سے چلے آ رہے ہیں۔ جو دیوتاؤں کی مثل کے گیت گارہی ہے۔ ان کے پیچھے اٹھارہ
 دیوی کے مندر کی پچاس دیوہاسیاں اور ہماذیں ہیں۔ جن کی پشت پر مٹھ شاہی
 چوہا ہاتھوں میں جٹاؤ عصائے سینہ مانے سرواٹھائے بڑھے چلے آ رہے ہیں ان
 کے عقب میں ایک مصری و دشمنی اڑی کے پارچات پہنے گلے میں پوت کے

دو پٹے لٹکائے، سونے کے کرنید باندھے چٹوڑوں کے بار اور کھٹے پہنے بادشاہ کے راستے پر برگ گل بچھا رہی ہیں۔ حسن و جہانی کے اس سیلاب کے خاتمے پر خود فرعون کی پر شکوہ سہاری ہے۔ دوزخ سردوں کے دیار و امصار کا بادشاہ ایک بہت بڑے جڑاؤ تخت کے اوپر جسے امرا اور درباریوں نے کندھے پر اٹھا رکھا ہے سر پر انیس والا ٹکٹ رکھے، شاہانہ زیب و زینت کے جیش قیمت زیورات پہنے ہاتھ میں یوتاؤں کی قیمت و قدر میں کا عصا تھامے، سونے کی ایک عالی شان صندلی پر بڑے کبر و نفوذ سے بیٹھا ہے۔ اس کے جلو میں دربار کے بڑے بڑے اہلکار نامی امرا، عالی مرتبہ رئیس جلیل القدر حکام ہیں اور ان کے پیچھے لوٹدی غلاموں اور شاہی خدمتگاران کا ایک جم غفیر قدم بڑھاتا چلا آرہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ شکوہ انسانی کے اس ظاہری کدو فر کو دیکھ کر اگر مصر کے ساوہ دل لوگ خالق ارض و سما کے اقتدارِ اعلیٰ سے منکر ہو کر فرعون کو دیتاؤں کا قربت دار سمجھنے لگے ہوتے۔ تو یہ کون سے اچھنبے کی بات تھی۔

پھر شوکت انسانی کا یہ سمندر جو ایک برس سے دوسرے برس تک متکالم نغز آ رہا تھا۔ وقفہ حتم گیا۔ ہر فرد بشر نے اظہارِ عقیدت میں اپنا سر جھکا دیا اور فرعون غفور مصر کے دوسرے تاج دارا بادشاہ صندلی پر سے اتر کر پھولوں میں چھپے ہوئے راستے پہ سے ایسے فرود و کبر سے گزرا کہ بافرش زمین کو نہایت و حقارت سے ٹھوکر مار رہا ہے پھر وہ دربار اور کامیوں کے ساتھ خمیدہ سر خلعت کے انبرہ اور سرد و

فرج کے جرم میں سے گزرتا مقبرے کی عمارت کے اندر اس کی تعمیر کا جائزہ لینے کے لئے چلا گیا۔ غالباً وہ ہر مرے پر اس امر کی تسفی کرنے کی خواہش رکھتا تھا کہ اس کی سنگین و محکم مقبرہ اُس بیش بہا مال و منال کی حفاظت کا ضامن ہو سکے گا یا نہیں جو اس کی میت کے ساتھ اس کے اندر دفن ہونے والا تھا۔ نہ جانے اُس نے اس سٹل حصار کو اس دینے کی حفاظت کے لئے کس قدر قابل اعتماد سمجھا تھا کہ اس نے پورے اطمینان قلب کے ساتھ اپنی لاش کے علاوہ کروڑوں روپے کے ساز و سامان کا بھی امین بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اُسے کیا خبر تھی کہ اس کی تدفین کے چند سو سال بعد ہی ٹوٹ کھسٹ کا دلدادہ انسان اس کی مٹیسی نیند کی راحت میں یکایک غلہ انداز ہو جائے گا۔ اور وہ مال و دولت جس کی حفاظت کے لئے اُس نے ایسا محکم انتظام کیا تھا ان لبروں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو جائے گی۔ جو اس کی ڈیڑوں کو بھی مابوت کے اندر سے کھینچ کر فرش زمین پر کھیر دیں گے۔

صالح حسین نے کہا: کبھی عظیم عمارت فراخ منہ مصر کی شاہی سطوت کا ٹکڑا شہرت مٹی بلکہ آج اُس کے اندر چمکا ڈروں اور حشرات الارض کا بسیرا ہے۔ لولا یک پرہل تار کی اودھم کی ایک روح فرساؤ کی اس میں مستقل فرما نہ وائی ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس کے اندر چلیں :

اس شور سے پر جس وقت میں غور کر رہا تھا تو وہ جذبہ تحقیق جو حضرت آدم کے وقت سے آج تک ہر انسان کے لئے بشریت کا ایک کمزور پہلو ہے۔ میری قبست

اور دل چسپی کو اکسا نے لگا۔ کہ میں اس پر اسلحہ مقبرے کے اندھیرے کے اندر ہمارے
ایک نظریہ ضرور دیکھوں۔ کہ اس بربادی کے عالم میں یہ کس خوفناک جید کو اپنے
سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ میں نے اس عیار پر ایک نظر ڈالی۔ ایک بے پناہ
حسرت و یاس اس عظیم عمارت کے چہرے پر برس رہی تھی۔ اور پھر وقتاً اس عمارت
کی سونگاری کا احساس میرے دھیان کو ابرام غزوہ سے ہٹا کر سکندر کے قصبے میں
شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے حسرت آگئیں اور وہ انگیز مقبرے کی طرف مڑ گیا۔
میں سوچنے لگا کہ مغلوں کی تمام عمارات میں یہ تعمیر کس قدر سوگوارا اور اس اور افسر وہ ہے
کہ اس میں داخل ہونے والا کوئی شخص دیکھ کر پھر وہ ہوئے بغیر یہاں سے باہر
نہیں آسکتا۔ تاج محل بھی ایک عرق ہے۔ لیکن اُسے دیکھ کر ایک قلبی فرحت میسر
آتی ہے۔ ہاں اور جہانگیر کے مقبرے بھی مزیات ہیں۔ لیکن وہ دل پر افسر کی لاکڑی
اور چھوڑنے کی بجائے اپنے شاہد وقار سے نافر کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ مد یہ ہے کہ
ملکہ نور جہاں کا بے حیثیت مرقہ بھی اپنے اندر ایک غصہ کشت رکھتا ہے۔ لیکن
ہندوستان کے سب سے جلیل القدر شہنشاہ کی یہ آخری آرام گاہ اپنی عجیب طرز
تعمیر کے طفیل کچھ ایسی اور اس ہے کہ یہاں پہنچ کر مضبوط کھلیتا انسان اگر قفس
افسردہ نہیں تو کم از کم سنجیدہ ضرور بن جاتا ہے۔

میں نے صالح صین سے کہا: میں ان ابرام کو مرث باہر ہی سے دیکھنا
چاہتا تھا۔ اگر آپ میرے ساتھ آئیں تو ہم انہیں دوسری طرف سے دیکھنے کے

مہدی تباہہ کو ٹوٹ چلیں۔

ہم اُس چٹان سے بٹ کر جس پر ان میناروں کی بنیادیں ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے
 صخرہ داروں اور بحروں کے قریب سے گزرتے ہوئے، ابوالہول کے اس عجیب و غریب
 بُت کے پاس پہنچے۔ جس کا دھڑلہ کا اور سرعوت کا ہے۔ یہ بُت جو شاگ خارا کی
 پوری چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ ہزار ہا سال سے ان اہرام کی پاسانی کر رہا ہے
 لیکن ہزار ہا سال کی طویل مدت میں کوئی شخص یہ عقدہ حل نہ کر سکا، کہ اس بُت کے قیام
 کا صحیح مقصد کیا تھا۔ اور اس نے آج تک کیا مخصوص مذمت سر انجام دی ہے۔

ہم اس مجسمے کے عقب سے نکل کر اس کے سامنے آئے تو میں نے اس کے عجیب
 غریب چہرے پر غور فرمایا۔ اس کی بے لورائیں کائنات کے کسی سریتہ راز کو بڑی
 انسانی دلچسپی کے ساتھ تک رہی تھیں۔ اور غالباً اس کی دید کی وجہ سے ایک پراسرار
 تجسم اُس کے ہنڈوں پر کھیل رہا تھا۔

صالح حسین نے کہا: نہ جانے اس مجسمے کو کس رعایت سے ابوالہول کہا جاتا
 ہے۔ لیکن اگر کسی نئی حینہ کے چہرے پر وہ ناک جس کا ایک حصہ طویل مدت گزری
 عمری سرگرمیوں کے باعث توپ کے ایک گولے سے ٹوٹ گیا تھا، سالم ہوتی تو آپ
 کو اس حقیقت پر تعجب ہوتا کہ اپنے خدو خال کی وجہ سے آج کل کی مصری لڑکیوں
 اس سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں۔

ریت کے تودوں اور چٹان کے پتھروں پر آگے بڑھتے ہم اس بت کے

اور قریب اُسے تو میں نے دیکھا اس کے اگلے بازوؤں کے درمیان ایک جھرو سا بنا ہوا تھا۔ جس کی نصف ننگی چوڑکٹ اس ریت سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ جس نے ابوالہول کو ایک تنہائی ڈھانپ لکھا تھا۔

صالح حسین نے کہا: یہ مجسّمہ ننگی چٹان کے اوپر بنایا گیا تھا۔ لیکن تین چار صدیوں کے بعد صحرا کی طرف سے آنے والی آندھریوں اور جھکڑوں نے ریت کو اٹھا کر اسے یوں ڈھانپ دیا کہ یہ انسانی نظروں سے قطعاً اوجھل ہو گیا۔ ایک روایت مشہور ہے کہ فرعون ثامث میں چہارم ایام ہنزادگی میں شیر کا شکار کھیلتے ہوئے اس چٹان کے سامنے میں ٹھاک کر سر رہا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہوتا ہے اس سے کہ رہے ہیں کہ اگر وہ اس ریت کو صاف کر دے جس نے ابوالہول کو ڈھانپ دیا ہے تو اس کے محلے میں دینا اُسے دونوں مصروں کا دہرائاج بخشیں گے جب ثامث میں تخت پر بیٹھا تو اس نے پہلا کام یہی کیا اور پھر جب دیوتاؤں نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا تو اس نے اس مجسمے کے قدموں میں ایک مندر تعمیر کروایا جس کی دیواروں پر اس نے اس واقعے کو درج کیا۔ پسنگی و بھیر جس کا اوپر کا حصہ آپ کو سامنے نظر آ رہا ہے اُسی مندر کے دروازے کی چوڑکٹ ہے۔“

پھر ہم سابقہ راستے پر سے چلتے اس مقام پر پہنچے۔ جہاں ہماری کار کھڑی تھی اور جہاں ایک مرتبہ پھر مہدوبید کے عوامات سیات کو فروخت کرنے والے خزانچہ بردار اپنا اپنا سامان لے کر ہم پر چھپے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھنے لگے تو میں نے

خمار گر دہیں بڑے اشتیاق سے کسی قریبی منڈی کی طرف، ٹھار کھی قیں خود رو رو
 نیل کے ٹیلے پانیوں پر روئی اور گئے سے لے ہوئے مصری سفینے ملاحتوں کے
 اہنگ دار گیتوں کی خوش آئند صدا ازل کے ساتھ جہا سے تنے ہوئے بادبانوں کے
 زور پر اسکندریہ کی طرف پھیل رہے تھے۔ اور دیر کے قریب کی بستی کی خستہ حال
 دوشیزائیں قدیم طرز ساخت کے ٹھکے سروں پر اٹھائے ایک دوسرے کے سائے
 سے چھٹی ہوئی نیل کے حیات بخش پانی کے حصول کے لئے گھاٹ کے نشیب میں
 اتری چل جا رہی تھیں۔ ان کے عقب میں میا قی ہوئی بکریوں کا ایک سرکش ریوڑ
 پٹے مال بھول کی قہپیوں کے آگے آگے کبھی بھاگتا اور کبھی ٹوکتا چلا آ رہا تھا۔

اس دلفریب پس منظر کے بالمقابل دریا اور ریگستان کے درمیان وہ طویل
 وعر فیض کھیت تھے جن کے اندر مصر کا سب سے جفاکش فرزند نطاح اپنے پانچ ہزار
 سال پانے ہل کو مٹی کے سینے میں گھاڑے آگے کو جھکا ہوا سیاہ جیلوں سے عربی
 میں مصروف کلام تھا۔ ہزار سال سے یہ نطاح اس کے بیل اس کا ہل بڑے
 نیل کے پانیوں کی طرح مصر کے معیشت کا سب سے اہم جزو رہے ہیں مگر ہزار
 سال سے اس فرد کی محنت شاد، اس کا پیہم عمل خود اس کے ابدی نکبت
 افلاس کے چنگل سے خلاص نہیں دلا سکا۔ اور وہ آج بھی اسی طرح غرہت اور
 رہوں حالی میں گھرا ہوا مصر کو زندہ و قائم رکھنے وال پیداوار کے حصول کے لئے
 زمین کا سینہ کاٹ رہا تھا۔ جیسے ہزار سال قبل اس کے ابا و اجداد فراعنہ مصر کے

رمانے میں اسے لٹا کرتے تھے۔

اسکندریہ کی طرف دوڑتی ہوئی کار کے نیچے اسفالٹ کی سیاہ ٹکر پانی کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ ننھی ننھی مبیناں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں تیزی کے ساتھ پیچھے کو غائب ہوتے چلے جا رہے تھے جنہیں غلامین نے کجور کے دیو قدریڑوں کے سائے تلے گاڑے اور پتروں سے بنے ہوئے گھروں سے بھرا کھاتھا۔ ان چھوٹے گاؤں کی منڈیروں اور کھیتوں پر سفید و سیاہ کپڑاؤں پہنے تھے۔ اور سامنے مرغیاں ڈھیر ڈھنگ دیں گدھوں اور بکریوں کے آگے پیچھے پڑے ہوئے غلامت کے ڈھیر میں سے دانہ ڈنکا گھنٹے کے لئے پاؤں مار مار کر اسے ادھر ادھر کھیر رہی تھیں۔ کچھ نڈر پتے اونٹوں کی مہاریں کپڑے نیل کی غلیانوں سے مرضی دھو دیں آنے والے ان جوہروں پر انہیں پانی پلا رہے تھے۔ جن کے اندر رنگ و طرح رنگ کسان جانوروں کی صدا اور اپنے گانے کی آہنگ کے ساتھ بھینسوں کو بھلا رہے تھے۔

میں نے بائیں طرف نظر ڈالی تو اس سرسبز علاقے کے مقابلے میں حدنگاہ تک پھیلا ہوا صحرا کسی چاکلہ دست مستور کی کچی ہوئی تصویر کا رنگ دکھا رہا تھا۔ سنہری رنگ کے وسیع خلیے پر تیز ہواؤں کے بنائے ہوئے دلغزب لہریں اُن پر ادھر ادھر کھڑے ہوئے ریت کے تودے اور ان سے دُور صبح کی کمر اور دھند میں چھپی ہوئی چٹیل پہاڑیاں اور ان سب کے اوپر گہرے نیلے رنگ کا صاف آسمان اور اس کی

پہنائیوں میں مات کے سرداروں کی تلاش میں اڑتے ہوئے گیدھ یا صحرائی چوہوں کی کھوج میں پردہ زکرتی جلیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ خدا کی اتنی بڑی کائنات بظاہر اس ذمی حیات کے وجود سے کیسے تھی نظر آ رہی تھی۔ جو اپنے نقص سے اس خوفناک سکوت و جہود کے غلسم کو توڑ سکتا۔

میں نے کہا: اس صحرا کی رنگ کے فداات سمندر کے قطروں سے کم نہوں گے۔

صالح حسین نے سڑک پر سے نظر اٹھائے بغیر کار کے سٹیرنگ کے اوپر ہی سے جواب دیا: مصر کے مکمل رقبے میں سے موت وں فیصدی اس قابل ہے کہ وہ آبادی اور کاشتکاری کی کفالت کر سکے۔ باقی لن و دن صحرا ہے۔ جس میں چند تھلستانوں اور جھیلوں کے سوا آب و گیاہ، چمند و پرند اور حیات انسانی کا بہت کم ثبوت ملتا ہے۔ ان صحرائوں کے بعض حصوں میں جو یسٹیا سے لے کر دہلی سینا اور ریگستاناں فریا تک پھیلے ہوئے ہیں، ایسا جٹو کا عالم اور اس بلا کی تنہائی ہے کہ معلوم ہوتا ہے آسمان کے چشمِ حجاب کے سامنے زندگی نے دم توڑ دیا ہے۔

اس نے سڑک پر سے نظریں اٹھا کر ایک سامت کے لئے منجھے دکھیا۔ پھر سپاٹ راستے پر دوبارہ نظریں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولا: مگر اس رنگ نامیں بھی ایک بے پناہ حسن اور ایک بے حاشا و لغز ہی ہے۔ اسے محسوس کرنے کے لئے

اس گرم خون کی ضرورت ہے۔ جو ہم مصریوں کی رگ و پے ہی میں دوڑتا ہے۔

میں نے کہا: آپ نے اس صحرا میں ضرور سفر کیا ہو گا۔

کھنے لگا: کئی مرتبہ میں نے اسے جہنم کی آگ میں نہلتے ہوئے بھی دیکھا ہے

اور پھلوں کا تاج پہنے ہوئے بھی۔

پھلوں کے لفظ نے مجھے چڑھا دیا۔ میں نے پوچھا: کیا صحرا میں بھی کبھی گلزار

کی کسی صورت ہوتی ہے۔

صالح حسین نے شیر لنگ پر سے بائیں ہاتھ اٹھا کر اُسے پہلے بائیں اور پھر

دائیں جانب اشارہ کے طور پر حرکت دیتے ہوئے کہا: ہم میں سے بہت سوں نے

اس خشک صحرا میں اُس سرسبز زمین کا پرتو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ عام طور پر تو یہ صحرا

خشک اور ویران ہی رہتے ہیں لیکن پھر کبھی سال دو سال میں یوں بھی ہوتا ہے کہ

قدرت کا جذبہ نوا یک نیا رنگ دکھاتا ہے۔ اور وہ ذات جو انسان و حیوان اور شجر و

حجر کی زندگی کی محافظ اور اس کے ذوق کی کفیل ہے۔ صحرا میں گلزار کھلانے کا اہتمام

کرتی ہے۔ ایک ہم سرا میں بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کی جانب سے اُٹھ کر آنے والی

گھٹائیں صحرا کے وسیع و عریض ویرانے پر بچا جاتی ہیں۔ یوں تو شیریں پانی کی اولیں

بوندوں کے ساتھ ہی رنگینار کے سوکھے ہوئے رگ و پے میں حیات کی آوازیں دوڑنے

لگتی ہے۔ جگہ جگہ گھٹائیں برس کر کھل جاتی ہیں اور سیلاب کا پانی سطح سے نیچے

چلا جاتا ہے۔ تو جبر میدانی اور ویرانہ وادیوں خشک ٹیہوں اور ٹپیل پہاڑیوں میں

زندگی کی نمود کچھ اور ہی رنگ دکھاتی ہے۔ کروڑوں ننھے ننھے پودے مردہ زمین میں سے بلبلا بلبلا کر ابھرنے لگتے ہیں۔ اور سمرا پر گویا بہار آجاتی ہے۔ بہار ط چلائی کی ہریا دل اور گھاس کا سبزہ فرش کو ہری فخل میں بدل ڈالتا ہے۔ بنار وار جھاڑیاں شباب کی سرستی سے لپکنے لگتی ہیں۔ ببول کے پودوں، خار وار جھاڑیوں اور جنگلی جڑی بوٹیوں میں عنابی اور قرمزی آدوے اور سینتی سفید اور گلابی قسم قسم کے اور رنگ رنگ کے پھول پھلنے لگتے ہیں۔ اور کیوں وہ پربار بناتا قی دنیا جلدہ ممکن ہو جاتی ہے۔ جس کی مدت حیات چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وقت وہ پرانی اور سخت جان جھاڑیاں بھی، جن کی تنگی اور جلی ہوئی ٹہنیاں سموم کا مقابلہ کرتے کرتے تھل ہو چکی ہوتی ہیں۔ ہری بھری نظر آنے لگتی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ساری کائنات سیر ہو کر پاس بھا چکی ہے۔ اور اب کھلکھلا کر سنس رہی ہے پھر جھاڑیاں اور پودے، اس سے پیشتر کہ آنے والے ایام کی حدت و تازت ان کی نازک انگڑو جڑوں کو بھلسا کر موت کی قیند سلاوے، جلدی جلدی اپنے بیج اور تخم زمین میں پھپھنے لگتے ہیں۔ تاکہ اس جلی ہوئی نباتات سے آئندہ ایک اور کائنات جنم لے اور زندگی ایک مرتبہ پھر موت کے نصیب کار و بار کو کچھ عرصے کے لئے بر باد کر سکے۔“

منظ کے خضر میں ہاما ماستہ او پنے او پنے میار والی مساہد اور حسین گنبد دل والے مزارات کے پاس سے ہو کر نکلا اور ہم پرانی طرز کے مکانوں کے

کے سایوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے پھر کھلی فضا میں آ گئے۔ یہاں سے دمنور کے شہر تک آبپاشی کی نہروں کا ایک وسیع سلسلہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا جن کو عبور کرنے کے لئے ہم چھوٹے چھوٹے ٹیڑھوں پر سے گزرتے ہوئے کوئی پتھر یا پل میل کی رفتار سے سکندریہ کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اہانک صالح حسین نے ایک چھوٹے سے گھاؤں کے سامنے کار کو روکا۔ انجن کو بند کیا اور دروازہ کھول کر ابر نکلنے ہوئے کہنے لگا: اس گھاؤں کا نہروں میں بہانا دوست ہے۔ میں اس طرف سے جب بھی نکلتا ہوں اس کی وضعداری اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ایک پیالی قصبے کی ضرورتوں پر۔ اس دم کی پابندی چونکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ضروری ہے اس لئے آئیے میں آپ کو شیخ الفریح سے ملاؤں۔

کار کے رکتے ہی چند نیلے کچیلے بچے جن کے معصوم چہروں پر دلچسپی اور استعجاب کے آثار بڑی شدت سے نمایاں تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر رک کر ہمیں گھورنے لگے۔ ان میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ جن کے چہرے کے اندر حال قدیم مصری دیویوں کی صورتوں سے ملتے تھے۔ اور جن کے کان کچھ دمیسی ہی بالیوں کے بوجھ سے دوہرے ہو رہے تھے۔ جو شاید صدیوں کی شہزادیاں مصری ثقافت کے زمانہ عروج میں بڑے فخر سے پہنا کرتی تھیں۔ ان کس مصریوں کے گرد سے خدا پرے سہٹ کے ایک چھوٹی سی سیاہ نام بھی سر پر سوکھی مکڑیوں کا ایک گٹھا لئے ہمیں حیرت اور شبہ کے ساتھ ٹک رہی تھی۔ ہم اس کے پاس سے گزرے تو میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا

معا مجھے اس کی سیاہ آنکھیں لگنے ابرو اور لمبی لمبی چمکیں کچھ ایسی ہی حسین اور دلفریب نظر آئیں جیسے انہیں میں نے ہمیشہ عینی کے چہرے پر پایا ہے۔ مجھے ایک ساعت کے لئے یوں محسوس ہوا گویا بوجھ کے نیچے دبی ہوئی یہ معصوم رشک نیل کی مٹی نہیں بلکہ اُس پاکستانی کی بچی ہے جو اس وقت راولپنڈی سے اپنا ٹک اس گاؤں میں وارد ہوتا ہے۔ میں پلٹ کر ایک مرتبہ پھر اس بچی کے معصوم چہرے پر نظر ڈال اور مجھے کچھ لمبوں محسوس ہوا جیسے شرارت سے وہ مجھ پر مسکرا رہی ہے۔

شیخ القریہ ایک بڑی عمر کا آدمی تھا جو کھاتے پیتے غلامین کے انداز کا ایک اُجلا لباس پہنے ہاتھ میں سیج لئے ہماری پیشوائی کے لئے اپنے دو منزلہ کچے مکان کے سامنے کھڑا ہوا دلفریب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ سلیک سلیک کے بعد جب ہم اس بد وضع مکان کے اندر داخل ہوئے تو میں اُس کمرے کی ظاہر حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جس میں اُس نے قہوے کے لئے ہمیں مدعو کیا تھا۔ اس صاف ستھرے کمرے میں رنگین پردے پٹے ہوئے تھے۔ فرش کے درمیان میں مصری انداز کے ایک خوشنما قالین کا چھوٹا سا ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چھتے کی دو کھالیں پڑی تھیں۔ اور سامنے دیوار کے ساتھ چار پانچ کرسیوں کے مقابل ایک گول میز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

اس گدڑی میں محل قسم کے کمرے کو دیکھ کر مجھے فوراً اکرم خاں کا گھٹاں کا نور ڈھیری یاد آ گیا۔ جو پشاور سے دس بارہ میل باہر ایک برسے علاقے میں

واقع ہے۔ اس گاؤں کے قطع مکانوں کے درمیان ٹیڑھی ترہمی فلیٹ گلیوں کے
 بچوں بچ گندی نالیاں اور بدبودار پانی کے گشتے ہیں۔ ان گلیوں میں لیٹنے والے
 بد حال گتے بڑی خوفناک چمنیوں میں ہر اجنبی کی آمد پر قصیدہ اور دھاپی پر نو مکنے کے
 عادی ہیں۔ لیکن ان مایوس کن حالات سے گذر کر جیسے ہی آپ اکرم خاں کے مکان
 کی چار دیواری کے اندر ایک بہت بڑے صحن کوٹے کر کے حجرے میں داخل ہوتے ہیں
 تو آپ کو ایک بالکل غیر متوقع وینا نظر آتی ہے۔ دروازوں پر قیمتی پردے۔ فرش پر
 نفیس فیل پتالین منبش دیواروں پر سنہری فریم میں جڑی ہوئی خوبصورت تصویریں
 چھت پر تلواریں جھاڑ۔ کمرے کے چاروں طرف کرسیاں اور صوفے۔ اماں دیوں میں
 قرینے سے سجے ہوئے قہوے کے دسی غروت اور دونا رسی کی کتابیں۔ ایک کونے
 میں جدید ماڈل کا طاقتور ریڈیو ریسیور۔ دوسرے میں اعلیٰ ساختہ کے پشادوری اور
 بیچیاں تھیں۔ اور پھر کمرے کے عین وسط میں نو کم کے پھولوں کے ساتھ قرینے
 سے سجائے ہوئے مشرقی ذوق کا ایک بہت بڑا گلدان۔

اس مجھے کوٹے کے آپ دوسری طرف صحن میں نکل جائیں تو آپ فوراً محسوس
 کریں گے کہ آپ چمنستان میں آگئے ہیں۔ آپ کے سامنے مٹلیں گھاس کا ایک بہت
 وسیع خلد ہر گاہ جس کی سطح کو اس اہتمام سے ہموار رکھنے کے لئے شاید رولر کا بانا ہوا
 استعمال ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف صندی کے پودوں کی ٹیٹیاں اندر موزوں
 مقامات پر موسم کی رعایت سے رنگ رنگ کے خوشنما اور علمبر بیز پھولوں کی کیاٹیاں

اُن سے ایک طرف کو ہٹ کر رنگتے، ملے، آڑو، آلو بخارے اور خوبانی کے پیڑ اور ان ب کے درمیان میں شگل مسند لیوں والی ایک پختہ شاہ نشین جس کے عقب میں انگوڑ کی گھنی بلیں۔ اس پر متزاہد صاحبِ خانہ کی عیالِ معقول مہمان نوازی میں کدو خان کے عہد میں کئی مرتبہ جا چکا ہوں۔ اور وہاں ایک مرتبہ پھر جانے کی آرزو بھی سرور نہیں ہوئی۔

شہد کے لذیذ پرائیڈوں اور پودینے کے عمدہ تنوع کیلئے شیخ الفریہ کا فکر یہ ادا کرنے کے بعد ہم دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ اور بہار راستہ پھر حسین کھیتوں اور ہرے بھرے علاقوں میں سے گزرنے لگا۔ اب سورج چڑھ آیا تھا۔ اور اس کی چمکیلی دھوپ میں ان مصنوعی جوہروں اور بڑے بڑے تالابوں کا گدلا پانی چمک رہا تھا جو دریا سے ہٹ کر کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے۔ اور جن میں نل اپنی طغیانی کا پانی فلاحین کی زرعی ضروریات کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ ان جوہروں کے کناروں پر جگہ جگہ وہ بیاں گڑھی ہوئی تھیں جن کا ایک سرآمدن دار پتھروں کے بوجھ سے نیچے جھکا ہوا تھا۔ اور دوسرا جس پر مضبوط رسیوں سے پانی کھینچنے کے بڑے بڑے ٹول بندھے ہوئے تھے اور کواٹھا ہوا تھا۔ کیس کیس وہ دھبے بھی کھیتوں کی بہاری کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جو مشرقی دنیا میں قدیم ایرانی طرزِ آب پاشی کی یادگار ہیں۔

کوئی دس بج رہا تھا کہ ہم سکندریہ کے شہر میں داخل ہوئے۔ اسی شہر میں

کہیں پتھروں کے نیچے وہ شخص ابھی زندہ رہا ہے جس نے ۲۵ برس کی عمر میں اپنے زمانے کی نصف دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ آج اس کے نانی جسم کی حفاظت کرنے والی قبر کا کسی کو پتہ نہیں اور کوئی نہیں جانتا کھمصر کے بادشاہ طوہلی دوم نے اس کا تابوت بابل سے ملگرا کر اس شہر کے کسی گھٹے میں لیمیم خاک کو سونپا تھا۔ شہر کے ایک جھتے میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جو حضرت دانیال کے نام سے منسوب ہے اور جس کے قریب میں خود حضرت دانیال اور حکیم لقمان کے مزار ہیں۔ اس مسجد کے باغ میں ایک روایت صدیوں سے یہ محل کو مقامی گائیڈ سناتے چلے آ رہے ہیں۔ جس کی رو سے اس مسجد کا معنہ اس قبر کے اوپر تعمیر ہے۔ جس پر سکندرا عظم کا جسدِ خاکی دفن ہے۔ یہ روایت شاید اس تحریک کا نتیجہ ہے جو مسلمان ناختمین کو بدنام کرنے کے لئے مغرب کے ڈور و ذور مصنفوں نے صدیاں گزریں ایک سنگین سکیم کے ماتحت جاوی کی حق صالح حسن کی معلومات کے مطابق یہ افسانہ طوہلی فی الحقیقت اس تاریخی مسجد کو جسے مصر کو فتح کرنے والی اسلامی افواج نے دانیال نبی سے اٹھایا عقیدت کے طور پر تعمیر کر دیا تھا۔ مسمار کرانے کی ایک سازش تھی۔ جو کامیاب نہیں ہو سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کے دل میں غلو بہ نام کے وقت، جگھاؤ آیا تھا۔ اسے فتوحات اسلامی نے ناسور کی صورت میں چول ڈالا۔ مسلمانوں کے عزائم کے سامنے جب متحدہ یورپ کی عسکری طاقت کی کوئی پیش نہ آئی اور مسلمان سپہن اور اسٹریٹجک پہنچ گئے۔ تو یہ بات بالکل فطری تھی۔ کہ اس

قی ہے اُردو اور قومی ہزیمت کا کوئی ردِ عمل ہوتا۔ چنانچہ وہ خود، اسکندریہ اور
 شلوک بڑھکتے ہوئے خود جماعت کو فاتح کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ان کا اظہار
 ساتویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے خلاف یورپی
 تحریروں میں مستند ہوتا رہا۔ یہ تحریروں جو یورپی حوام کو اپنی ورثے میں ملی تھی۔ اب ان
 کے دوسری صدیوں کا ایک مفردی حصہ ہیں چنانچہ آج قیصر اور رنگ ولی اور ترم
 حوامنی کے حالات کی پیداوار میں، مغربی قوموں کے ایمان و ایمان کا جزو بن گئی
 ہیں۔

اسکندریہ میں طوسی بادشاہوں نے ایک بہت بڑی لائبریری قائم کر رکھی تھی۔
 جس میں یونان کے علم و حکمت کی بیش بہا کتابیں جمع تھیں۔ اس لائبریری کو جلانے
 کا الزام عربوں پر لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لائبریری حضرت عمرو بن العاص کی فوجوں
 کی آمد سے کئی سو سال پہلے غالباً اس زمانے میں جل گئی تھی۔ جب سیزز کو اسکندریہ
 سے خارج کرنے کے لئے ایک مصری جرنیل ایلخس نے اس شہر کا محاصرہ کیا تھا اور
 سیزز نے اپنے بھائی جانا ز اور دوسرا سامانی حرب جلاؤا تھا۔ کئی صدیاں پہلے اس شہر
 میں فیروز کے جزیب پر جواب کھنڈروں کی صورت میں بندر لگا، کا ایک حصہ ہے۔
 منگب عمر کا کئی منزل اونچا روشن کا ایک مینار بڑا کرتا تھا۔ جس کی شمع مسندی
 تیاروں کو نہیں تیس میل تک دکھائی دیتی تھی۔ یہ مینار سلم محلے سے بہت عرصہ پہلے
 ایک زلزلے سے تباہ ہو گیا۔ لیکن اس کی بربادی بھی مسلمانوں سے غریب کی جاتی ہے

بلکہ کی جاتی تھی۔ جدید تحقیق نے ان فرضی افسانوں کی بڑی مذہب قلمی کھول دی ہے۔ اور یورپ میں ایسے انصاف پسند مصنفین منظر عام پر آنے لگے ہیں جو حقیقت حال کی تہ تک پہنچنے کے لئے بڑی کاملاً تحقیقات کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔

دو پہرے کے کھانے کے بعد جب صالح حسین کی سمیت میں میں نے اسکندریہ کو چل پھر کر دیکھا تو مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا کہ یہ مصری شہر اپنے خند و حال اور اپنی غریب علی آبادی اور اپنی ثقافت اور معاشرتی کیفیت کی وجہ سے کس قدر غیر مصری نظر آتا تھا۔ چونکہ اس بندرگاہ کے راستے مصر کی اصل دولت یعنی شکر اور روٹی باہر کی دنیا کو بھیجی جاتی ہے۔ اور اس سٹی یا سکی براہ آواز سیر فریو تانی تاجروں کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان شاہانِ خلق کی اتنا مست ٹھامیں اور کاروباری کوٹھیاں اور گودام اور دفاتر سارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کاروفیش کے خوبصورت علاقے میں میلوں تک جو نفیس مکانات اور حسین باغات قطار اندر قطار نظر آتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر انہیں کی ملکیت ہیں۔ بندرگاہ کے علاقے میں سے گزرنے والے کو یہ شہر اپنی سنگی ٹرکوں، جہازوں، محلوں اور بندرگاہ میں کام کرنے والی دوسری مخلوق کو دیکھ کر گمان گذرتا ہے کہ وہ کسی مصری شہر میں نہیں بلکہ نیل پریا مارسیلز میں ہے۔ اور اگر وہ اس کی بچوں یعنی ریلی گھاٹوں پر جانگلے تو معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرانس یا اٹلی کے اُس ساحلی علاقے میں پہنچ گیا ہے جسے ریویا کہتے ہیں۔

صالح حسین مجھے جدید اسکندریہ کا منظر دکھانے کے لئے اُس حسین مضافاتی

علاقے میں بے گئے جسے اول بار بیٹے کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہم شارع خاص پاشا کی حسین شاہزادہ پر سے گزرتے ہوئے چوک نرائن پاشا کے راستے اس علاقے میں داخل ہوئے تو ہم نے پہلی مرتبہ کسی مشرقی سرزمین پر مغربی تہذیب و تمدن کی گرفت کا وہ گہرا اثر دیکھا جس نے اس کی فطرت اور جبلت کو کسیر بدل ڈالا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چھتہ یورپ کے کسی ساحلی شہر سے کاٹ کر یہاں پہنچ کر دیا گیا ہے۔ کارنیش کی پندرہ میل لمبی سڑک پر بس کے ایک طرف بحیرہ روم کے نیلے پانیوں کی کف آوے اور دوسری سیلاب دار تھیل بھی تھیں اور دوسری طرف طرز نو کی بلند و بالا عمارتیں اپنے معماروں اور کیمینوں کی ثروت شوکت کی داستان دہرا رہی تھیں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے ہم نے وہ بابہ بیچ ملے گئے۔ جن کی ریت پر ہزاروں نیم برہنہ یورپی مرد اور عورتیں غسل آفتابی کے لئے اپنے عریاں جسموں کی نمائش سے کم مہذب قاشانہوں کے جذبات میں ہیراں و خفیان پیدا کر رہے تھے۔ پھر صالح حسین شہنشاہ کی بیچ پر کار کو ایک طرف روک کر سندھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: یہی وہ مقام ہے جہاں کھوپڑا اور انطونی کی وہ رومان انگیز ملاقات ہوئی تھی۔ جس نے پھر انطونی کو رومٹر انگریزی واپس جانے کے قابل نہ چھوڑا۔

میں نے سامنے سمندر پر نگاہ ڈالی۔ بحیرہ روم کے نیلگوں پانی پاس وقت اسی قسم کا دلفریب ہلکا ہلکا توجہ نظر آ رہا تھا۔ جیسا غالباً آج سے دو ہزار سال قبل اس سانی سر پہر کو سلج آب پر موجود تھا۔ جس میں انطونی اور قلوپسیرہ کی

ملاقات رومان انگریز مصری بھرے میں ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا وہ کیا منظر ہو گا جسکی
 دید سے متاثر ہو کر رومن جرنیل کا دل کھرا یا پسپا ہو گا کہ وہ کشور کشائیوں اور بیواؤں مائیں
 کے آبائی کیل سے بیزار ہو کر حیات کی اُن رنگینیوں کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور
 ہو گیا۔ جو بعض اوقات قلب کی سرد ہوتی ہوئی چٹکاری کو ایسا شعلہ بنا دیتی ہے
 جس میں احساسِ فرض تک کو خاکستر بنا ڈالنے کی قدرت پنہاں ہے۔ مجھے یوں
 دکھائی دے رہا تھا گویا میں اس مقام کے قریب کھڑا ہوں۔ جہاں سے شکست خوردہ
 قتلہ پھرہ، خداج انطونی کو جو فی الحقیقت روم کے زیر نگین بناتے مصر کی اس نوخیز ملک
 کو رومن احکام کی پھیم خلافت و رزویں کی سزا دینے کے لئے اسکندر یہ کے قریب
 پہنچے بھری بیڑے کے ساتھ دوادو ہڑا تھا، اپنے گیسوؤں کا ابدی اسیر بنانے کے
 لئے حشرہ بھار پر سوار ہوئی تھی۔ اور پھر مجھے وہ بھرا اپنے سامنے سے نکلتا ہوا دکھائی
 دینے لگا۔ کشتی پر سوار ہونے کی جھول چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا غائبی باد بان ہوا
 میں یوں پھیلا ہوا تھا۔ گریا یہ وہ جال ہے جس میں انطونی کی سیاسی بصیرت، اس کی
 بالغ نظری، اس کا بیدار ذہن، اس کا تیز دماغ اس کا ہوشمند قلب سب پھنس
 کر قتلہ پھرہ کے قدموں میں گر پڑیں گے۔ مجھ کے کناروں پر مصر کی پری چہرہ
 کنیزی۔ جن کے متناسب اجسام کا حسن اُن کے باریک ریشمی طبوسات سے
 چھن چھن کر باہر نکل رہا تھا۔ چاندی کے چتر ہاتھوں میں لئے موت اور تماشے کی
 ایک دلفریب تال پر پانی کو کہہ رہی ہیں۔ بھرے کے پچھلے حصے پر ایک سنہری شامیانہ

زری اور برتوں کی جہاز کا اُن جہنگ جہنگ کرتے جڑاؤ آستادوں پر کھڑا ہے جن کے بالائی حصے پر سرخ ریشم کے لطیف پردے نسیم بھر کے جھونگوں سے دف کی تال پر اپنا سر دمن رہے ہیں۔ اس شامیلے کے نیچے آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں تڑاؤ پیدا کرنے والے رنگوں کے مکلف فرش گئے ہیں۔ اور فرش کے اوپر ایک مطلقا مسند بھی ہے۔ اس مسند کے ایک طرف سونے چاندی کی تاروں سے تیار کئے ہوئے ٹکڑے رکھے ہیں اور درمیان میں تیش چرمیں برس کی ایک ساحرہ جس کے حسن کا جادو کائنات کے دل کو مہتا اور جس کی خوبصورتی کا سحر پاتال کی پریوں کو غش میں لاتا۔ سر پر سونے کا کھٹ گلے میں بیش قیمت جواہرات کے زیور پہنے مبارک مصر کی حسین ترین خواتین کے جھرمٹ میں یوں بیٹھی ہے۔ جیسے دیوی کو اسپرڈوں نے گھیر رکھا ہے۔ شامیلے کے پیچھے نیم برنبہ گائینیں ٹھنڈی میں موسیقی کے آلات لئے سازوں کے سربلایے اذن کی منتظر ہیں۔ اور یہ اندر کا اکھاڑہ پریوں کا اتارا عود و منبر کی جان پر درخشاں بونوں میں بسا ہوا اور دل میں ہیجان پیدا کرنے والی موسیقی کی تاروں میں دجا ہوا نسیم بھر کے جاں پر در اور کسی دوشیزہ کے پہلے پیار کی طرح تھر تھرتھرتے ہوئے جھونگوں کو جلو میں لئے آہستہ آہستہ اُدھر کو بڑھ رہا ہے۔ جہاں انطونی اس کی راہ تک رہا ہے۔

سکندریہ کی گھڑیوں کے مطابق کوئی پانچ بج رہے تھے۔ کہیں قاہرہ کی طرٹ لوٹنے کے لئے ہوائی جہاز پر سوار ہوا۔ اس سے پندرہ منٹ پہلے

صالح حسین جنہیں سرکاری کام سے ابھی چند دن ہیں ٹھہرنا تھا۔ مجھے الوداع کہہ کر واپس جا چکے تھے۔ ہوائی جہاز کی بلندی سے غالباً ہر شہر حسین نظر آتا ہے لیکن سکندریہ کی بہار بڑی دلنریب تھی۔ اس کے مینار اور ستون، مسجدیں اور گرجے، مزارات اور خانقاہیں، باغات اور عمارتیں جو طویل گھاٹ پر بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ دو تک پہنچ گئی ہیں۔ پر واز کی بلندی سے یوں دکھائی دے رہے تھے۔ گو یا کبھی بوجھل دیور میں بے شمار چھوٹے چھوٹے نیگینے جڑے ہوئے ہیں۔ خود کو فرش کی لمبی ٹرک کسی سیاہ رنگ کی خدا تر ظہار کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دریائے نیل کے وہانے کا مغربی حصہ آدھے اچھڑ کی انگلیوں کی طرح دکھائی دینے لگا جس میں آب پاشی کی سنہروں کا تاننا بانا شریازوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ پھر ہم چھوٹے چھوٹے شہروں کے اوپر سے گذر کر اس مقام کے اوپر اڑے گئے۔ جہاں سے نیل کی داوی واضح اور صاف نظر آنے لگتی ہے۔ مغرب کی طرف قمری ستاب صحرائے لیبیا کی خیر پہاڑیوں سے ایک دو ہاتھ اونچا سونے کے تھاں کی طرح دکھ رہا تھا۔ اور اس کی رخصتی کروڑوں سے دریا کے گہرے پانی کی رنگت گہری سرخ ہر رہی تھی۔ اس ملائی سیال پر کھٹے ہوئے بادبازل والی دریائی کشتیاں بادبازوں کے سامان سے لدی ہوئی، سنہروں کی طرح تیر رہی تھیں۔ اور پھر دریا کے بائیں جانب دوسورج کی نور و روشنی میں کوئی چیز آئینے کی طرح جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ چند فٹوں میں ہم داوی نروں کی کھاری پانی کی جھیلوں کے اوپر اڑ

رہے تھے۔ ایک شانیر میں جب جہاز ایک قطر آب کے اوپر سے گذرا تو اس کی
سطح پر سے آبی پرندوں کا ایک سیارہ بادل اوپر کو اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔
تھوڑی دیر میں جہاز کے نیچے سے قطبیوں کی وہ قدیمی خانقاہیں گزریں
جن کی تاریخ حضرت عیسیٰ کے زمانے سے جا ملتی ہے۔ لیکن وہ قصبہ کے
اندر جہاں ہر حریت بیابان کی کیفیت اور مجر کا عالم ہے۔ یہ سٹیالی خانقاہیں جہاز
کی بلندی سے یوں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے وسطیٰ سمندر میں کوئی سفینہ خشکی
پر اٹک کر بیٹھا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کس نشان اور بے آب و گیاہ صحرا کی
خاموشی راہبوں کے سنے تہائی کا کیسا وحشیانہ احساس پیدا کرتی ہوگی۔ اور
اسکندرید اور قاہرہ کے مہنگا مسر پر درشمنوں سے چند منٹ کی جوانی مسافت پر
بیابان کے اندر ان پر سکون مسجدوں کو دیکھ کر انسان کا دل کئی قسم کے
تقابل اور موازنے پر کیونکر مجبور رہتا ہوگا۔

یہاں سے ہم بائیں جانب قاہرہ کی طرف مڑ گئے۔ ایک لمحے میں مقلّم
کی سپاڑیوں نے خاموشی کی دھند سے اپنا سر نکالا۔ پھر دریائے دوسری جانب
اہرام اور ابوالہول صحرا کے سرے پر کسی کھلے ٹرے نیچے کے مجھلے ہوئے
کھلڑوں کی طرح پڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ مہما قاہرہ کے ہیروئے واضح
ہونے لگے۔ شہر کی حسین مساجد کے مینار اور گنبد سقلیہ کی چار دیواری پاشاؤں
اور خبا کی حرمیاں۔ بادشاہ کے محلات، فراخ اور کشادہ سڑکیں اور ان کے

ساتھ پٹے ہوئے عرب محقق۔ تاریک گلیاں، گنہاں بازار اور قاہرہ کا وہ علاقہ
 جو پرانی تہذیب کا امین کہلاتا ہے۔ اور پھر گجرات کے جھنڈ اور سرسبز
 کھیت۔ اور آخر کار برٹش سے آگے بڑھائی مستقر ۛ

رُومِ ناپچہ

(۱)

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ کہہ ہارا ہوائی جہاز تھامبر کے ہوائی اڈے سے روم کی طرف روانہ ہوا۔ اُسے اڑتے ہوئے اس وقت کوئی تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور میں اپنی نشست پر نیم دراز خلا میں ٹکٹل لگائے گری سوچ میں اپنے اُنکی کے سابقہ سفر پر غور کر رہا تھا۔

کمپنی بس گز رہے میں لندن جاتا ہوا اُٹلی سی سے گزرا تھا۔ مگر وہ سفر ایک اعتبار سے اتفاق تھا۔ اس زمانے میں ہندوستانی طلباء میں پی اینڈ اے "یا سٹی اینڈ ہال کے مقابلے میں لائیڈ ٹریڈنگ کمپنی کا بہت چرچا تھا۔ اس اطالوی کمپنی کے جہاز ہندوستان میں بہت سے چل کر ٹریڈنگ کی بندرگاہ بن گئے تھے۔ گریا اٹھتے ہوئے میں چونکہ مسافر باصلاح کو برٹش ویسٹ انڈیائی کمپنی ان تینوں میں سے ایک بندرگاہ

پر اتنا پڑتا تھا اور اٹلی کا کچھ حصہ بھی مسافر نہ کیفیت میں دیکھ لیتے تھے۔ میں چونکہ ملان سمانا سہا جاتا تھا۔ اس لئے میں ونس میں اُترا۔

یہ جہاں عظیم سے قبل اس زمانے کی بات ہے جب ایسے سینا کے قبضے کے بعد اٹلی کی دھاک ہر طرف بھیٹی ہوئی تھی۔ اور مسولینی کا نام یورپ کے اکثر ملکوں میں خوف و ہراس سے لیا جاتا تھا۔ اٹلی کو یا اس زمانے میں اپنے پورے عروج پر تھا۔ اور اس وقت شاید ہی کوئی شخص یہ کہنے کی جرات کر سکتا تھا کہ اس سے ایک برس بعد جو جنگ شروع ہونے والی تھی اور اٹلی کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کر کے رکھ دے گی۔

اس وقت اٹالوی لیڈروں کے ہنگامہ پر وہ ماورہ گیر پروپیگنڈے نے فسطائیت کو ایسی کامیاب سیاست بنا رکھا تھا کہ اس کی ہیر دنی روشنی کے سامنے گھر کے اندر کی تاریکی کا حال دکھاتا تھا۔ جب میں نے ونس میں قدم رکھا تو اٹلی کے سیاسی عروج کی ثمرت ہر طرف تھی۔ اور میرے لئے اٹالوی سرزمین پر قدم رکھنا کچھ انہیں کیفیات کا حامل تھا جن سے ایک انسان بعض اوقات ویاہم مغریت کے اس عالم میں دوچار ہوتا ہے جب اسے کسی ایسی پُشکوہ عمارت کے اندر سے گزرنے کا موقع پیش آئے جس میں اس نے پہلے قدم نہ رکھا ہو۔ یہ مشاہدہ عام طور پر ہیبت اور تحیر کے ایسے تاثرات چھوڑ جاتا ہے جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نظارے میں وہ عمارت ہیبت آور ثابت ہوئی یا دلفریب۔

وئس میں آنے والے غیر ملکی مسافر کی طرح مجھے بھی اس کی جلد مدارتوں پر مشکوہ
 گرجوں اور اعلیٰ فنی تعمیر کے متقہ دو دوسرے نو اور نے بہت رکھا۔ وئس کا حسین شہر
 پانی پر آباد ہے۔ یہاں غشکی کی سڑکوں اور گلیوں کی بجائے نہریں ہیں۔ جن پر حسین دو کشت
 کشتیاں جنہیں گندولا کہتے ہیں، آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں شہر
 میں سڑکیں بھی ہیں۔ مگر ان کی رونق وہ نہیں جو ان سیال شاہراہوں کی ہے۔ جن پر
 رنگارنگ گندولا سوار یوں سے لڑے ہوئے اور سر سے اوڑھتے جانے دکھائی دیتے
 ہیں۔ چونکہ شہر کے اکثر مقامات انہیں نہروں سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔
 اس لئے ساری گاڑیہ زیادہ تر کشتی ہی ہے، خواہ وہ دفعتی ہو یا چوس سے کہنے
 والی۔

جب میں گندولے پر پہلی مرتبہ بیٹھا تو میری ذہنی کیفیت نمنان کی حامل تھی ہوا ری
 نکا انوکھا پن اس کی تاریخی حیثیت اس کی ادبی شہرت ان کے احساس نے مجھ پر وہ
 کیفیت طاری کر دی جو بچوں کو ہاتھی پر سوار ہو کر یا مذہب آدمی کو زندگی میں پہلی مرتبہ
 رکشا میں بیٹھ کر محسوس ہوتی ہے۔ یہ لطیف اور رافیت کے بے جٹے جذبہ بات تھے۔ جن
 کی موجودگی میں سیٹے کرنا مشکل تھا کہ میں دوبارہ یہ سواری کرایہ کہ دل لگا یا نہیں۔ اور
 دو وقت ترمیرے لئے اور بھی سواریں روح تھا۔ جب شام کو میرے دلچسپی پر طارح
 نے زیادہ دام پانے کے خیال سے اپنی پوری پاٹھ ڈالنا ہمارے ایک مالک الاہنا
 شروع کر دیا۔

میں سوچنے لگا کہ دینس کا حسن دن کی نسبت رات کو کس قدر نکھر آتا ہے۔
 اس وقت اس میں ایک ایسی بے پناہ کشش پیدا ہو جاتی ہے جس کے سلسلے باہر
 سے آنے والا مسافر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس حسن کا تعلق برقی قوتوں
 یا تیز روشنیوں سے نہیں بلکہ اس تاریکی سے ہے۔ جو شام کے دھندلکے کے ساتھ
 ہی دینس کی نمرود میں اتنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور جوں جوں شام گزرتی جاتی ہے
 اس تاریکی کی گہرائی خود دینس کے حسین چہرے کو اس طرح پرکشش بنا دیتی ہے
 جس طرح بعض اوقات سیاہ پتوں میں لپٹی ہوئی شفاف انگٹوں کا جل کی سیاہی
 سے اُجھرتا ہے۔ دینس کے کئی ملائے رات کو اسی حسن افروز تاریکی میں پہلے ہونے
 بلکہ بے پناہ طور پر دلغریب دکھائی دیئے۔ سیاہی حسن کا کس قدر ضروری جز ہے اس
 کی تفصیل ملت کی تاریکی میں دینس کی تاریکیاں ہی بتا سکتی ہیں۔

مجھے خیال آیا۔ دینس میں بعض لوگوں کو نمرود کے بند بند نیلے پانی سے برآتی
 ہے۔ انیس اس تعلق سے یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا ان پانیوں کے نیچے ہزاروں گلی
 ٹری پھیلیاں پڑی ہیں۔ جنہوں نے پانی کو خواب اور فضا کو کتہہ کر دکھا ہے۔ مگر مجھے ان
 پانیوں میں سے ہر جگہ وہی جاں پورا اور وہی جاں نواز غم شیر آتی تھی۔ جو دیانے
 راوی کے مغربی کنارے پر کا حراں کی بارہوری کے قریب ان ٹیلے ساکت پانیوں
 سے آیا کرتی ہے۔ جو بارہوری سے تھوڑی دُور پہلی طرف کو دُور خشک کے اندر کھجوروں
 کے تاریک جھنڈ تک پہلے گئے ہیں

پھر ونس سے سبٹ کر میلا خیال روم کی طرف نکلتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی راقیہ دستوں کے چہرے میرے تصور میں ابھرائے۔ جن سے جلنے کی آرزو مجھے اس وقت روم کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ روم کی دیکشیں کی داستانیں عرس سے پڑھتا اور سنتا چلا آیا تھا۔ اُسے نہ دیکھنے کے لئے دل میں ہمیشہ سے ایک تڑپ تھی۔ مگر چند ہفتوں سے اس کی کشش میں یوں اضافہ ہو گیا کہ روم میں حسن اتفاق سے کچھ ہم وطن دوست بھی موجود تھے۔ عاشقہ اور سلم ملک کا مطالبہ تھا کہ میں ان سے ملے بغیر آگے نہ ہاؤں۔ اشفاق احمد اور زونہی کا مصرا تھا کہ میں نہ صرف روم میں رگوں بلکہ کچھ عرس سے ملنے ان کے ساتھ ٹھہروں بھی۔ چنانچہ آج صبح جب میں تاجرہ سے روم کی طرف روانہ ہوا تھا تو طبیعت میں ایک خاص دلدرد موجزن تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت ہمارا ہوائی جہاز ناطہ اوی کنارے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ ایک مرتبہ پھر میرے تصور میں وہی نظارے گھر سے لگے جن سے آج سے کئی برس پہلے میری نگاہیں دوچار ہوئی تھیں۔ تخیل کھینچ کر ونس کے اسی شہرہ آفاق آبوں کے پل پر پہنچ گیا۔ جس کی دیوالیہ کھلی مرتبہ میں نے شام کے دھندلکے میں اٹھایا تھا۔ اور پھر وہیں میں طمان کے عظیم الشان صنعتی شہر کی تصویریں گھومنے لگیں۔ جہاں قدیم اور جدید عرزیہ تعمیر کے ناقابل فراموش نظارے دیکھنے والے کو حیرت رکھتے ہیں۔ ایک نہج کے قریب ہوائی جہاز کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا کہ نیچے بحیرہ روم کے کنارے پر دور جہاں ایک سیاہ دھاری سی نظر آ رہی تھی۔ وہ کپری

کے اس حسین جزیے کا ایک کنارہ تھا جس کی خوبصورتی اور دلکش کی داستانیں یورپ کے ہستیاء کی زبان پر بولی ہیں۔ چند ساعتوں میں ہم کپری پور سے گذر کر اٹلی کی اصل سرزمین پہنچ رہے تھے۔ کوئی چند منٹ میں نیمپلز کا شہریت پرورش ہری ہری پارک کے سائے میں سے نکل کر ایک انتہائی خوبصورت کے سامنے آگیا۔ اس کے عقب میں مغرب کی طرف دوسریس کا پہاڑ تھا جس کے دہانے سے اب بھی اسی خوفناک دھوئیں کا غصیف سا بادل ہوا میں مغرب نظر آ رہا تھا۔ جس نے کوئی ساڑھے اٹھارہ سو برس پہلے پہیلی کے پھیلنے لگوں کو اچانک تنبیہ کی تھی۔ کہ ان کا وقت ہو گیا! ہمیں منٹ کے بعد ہماذیو کی گودی کے اوپر سے گذر رہے تھے۔ دوسری جنگ عالم کے آخری مرحلے پر جب اردائی کا پانسہ اتحادیوں کے حق میں ٹپ رہا تھا اٹالی مر رہے کی خبروں میں انڈیا کا تذکرہ بیت البیت رکھا تھا۔

انڈیا کے گزرنے کے دس منٹ بعد ہمیں دو درہندہ سے دو مہم کے عظیم اٹلانٹر کا میرلازمہ سرما کی دوسری دھوپ میں نظر آنے لگا۔ دھندلے دھندلے نقش دور تک چلتے چلے گئے تھے۔ ہری ہری کیتیاں سرسبز پہاڑ اور دلفریب وادیاں تیزی سے جھللاتی جوتی جہاز کے نیچے سے گذر رہی تھیں۔ اور پھر جہاز نے ایک آخری جھک دیا۔ معلوم ہوا ہم کہیں غلامیں چلے گئے ہیں۔ لیکن اب جو پلٹے تو روم کا شہر اپنے دھندلے میں سے یوں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے سینما کے پردے پر دھندلے نقش اپنا روپ بدل کر اصلی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ہم نے فضا

میں سے روم پر نظر ڈالی قریبوں معلوم ہوا۔ مگر یا بچوں کی کمائیوں کی کسی معتد کتاب کا ایک دفتر سب ورق کھل گیا ہے۔ روم کے فراع کے پہاڑ، وادیاں، بھیا، سمندر، خود روم کی حسین بندرگاہ، ٹھک پڑ کر جیسے، سنگین مملات، بیسبت آوردتیم مند رپوں دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کسی چابکدست متاع نے اُنہیں ایک خاص التزام کے ساتھ ایک ہی تختے پر اکٹھا کر دیا ہے۔ بچل جمل برائی جہان زحمینو برائی اوڑے کا چکر کاٹ کر نیچے ہتر رہا تھا، روم جس کسی زمانے میں ساری مذہب دنیا کا مسد مقام تھا اور آج بھی یونانی تاریخ کا ایک انزل عزیز ہے۔ اپنی سابقہ عظمت کی داستان اور انہی موجودہ اہمیت کو اور بھی طیندا بنگی سے دہرا رہا تھا۔

جہاز سے اترنے کے بعد ٹھم کے مراحل طے ہوتے ہی میں نے چادوں میں نظر پڑائیں۔ اسلم، اشفاق، انوولی کوئی نظر نہ آیا۔ حیرت مٹی یہ لوگ کیا ہونے۔ قاہرہ سے میری تارا نہیں نہیں ملی؟ یا میں نے ہی تاریخوں میں گڑ بڑ کر دی تھی۔ روم میں میرے اصل قیام کے لئے واپسی کے موقع پر جوتا رنگیں مقرر تھیں۔ ان کی دوسے مجھے تین ماہ بعد اپریل میں ایک ہفتے کے لئے یہاں رکنا تھا۔ اس مرتبہ مضبوطی کی کشتیوں کی کشتیوں کی کشتیوں کو لائی تھی۔ وہ مجھے قاہرہ سے سیدھا پیرس چلا جانا چاہئے تھا۔ مگر اس وقت وہ دوست غائب تھے اور اس انہی شرمیں ان کی تلاش ہے کا نظر آرہی تھی۔ تیس نیتا لیس منٹ گزر گئے۔ اڑے پر سے تمام مسافروں نے اپنی ماہولی۔ جسے کہ جہاز اپنے اگلے سفر پر روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اور آگے جانے والے مسافر اپنے اپنے جگہ اٹھائے

پھر بے سہری سے اس روادے کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں سے گزر کر انہیں سدا رہنا تھا۔ مگر میں اسی بے سہرے دوست اور تلاش میں تھا۔ اہل علم، اشتقاق اور زونہ کو آنا تھا۔ آگے اب روم میں مزید ٹھہرنا بحث و کجائی دے رہا تھا۔ سو میں نے امریکن ہوائی کمپنی ٹی بیو اس کے جہاز میں اسی روز چار بجے کیے پرس کی سیٹ لے لی اور ہوائی اڈے کے اس جھتے میں جا بیٹھا۔ جہاں سے اس کمپنی کے جہاز اڑتے ہیں۔

میرے جہاز کو چار بجے کے قریب روم سے روادہ رہنا تھا۔ اس وقت دو بجے تھے۔ اور میں ڈری بیزارہی کے عالم میں بیٹھا وقت کی کاہل رفتار پر غور کر رہا تھا کہ اچانک جیسے سے مجھے خالص پنجابی انداز کی آواز میں کسی نے پکارا۔ میں نے مٹ کر دیکھا تو اشتقاق اور زونہ آہنی سلاطوں سے لگے ہوئے شبہ اور تذبذب کے عالم میں مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے جیسے کی طرف دیکھا۔ اشتقاق کی چیخ ہوائی اڈے میں یوں گونجی کہ ایک ساعت کے مئے میں غرور ٹپٹا گیا۔ اور پھر اس پہنچ کے ساتھ ہی زونہ کو کپڑے اٹھادی سنتری کو دروازے پر دھکا دے کر وہ میری طرف دپکا۔ ایک ساعت میں اشتقاق اور زونہ باری باری مجھ سے جھٹ گئے۔ یہ خالص پاکستانی معافہ ہوائی اڈے کے اہل کاروں کو بھونچا سا لگ گیا۔ اور وہ کچھ ایسے شمشد سے رہ گئے کہ انہیں اس امر کا خیال نہ رہا کہ دونوں بزرگوار اس جگہ اندر پہنچ گئے تھے۔ جہاں کسٹم کے مراحل طے کرنے کے بعد صرت مسافر ہی ٹھہر گئے ہیں۔ مئے والوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

اشفاق اور زہلی کا اصرار تھا کہ میں روم میں چند دنوں کے لئے اپنے ساتھ پروگرام کے مطابق رک جاؤں لیکن میں پیرس کے سفر کے انتظامات کر چکا تھا۔ چار بجے کے جواز میں بڑی مشکل سے مجھے جگہ ملی تھی۔ اتنے تر دو کے بعد اُسے فروغ کر دینے کی بہت نہ پڑتی تھی۔ سو میں نے اشفاق اور زہلی کی مخالفت کے باوجود فیصلہ کیا کہ اب روم سے چل ہی دنیا چاہئے۔ ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وطن کے حالات اور وطن کے لوگوں کے بارے میں اشفاق اور زہلی کے سوالات کا سلسلہ بڑھتا چلا ہوا تھا۔ اس لئے ہم اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے برائی اوڑے کے قہرے خانے میں کافی چہنے کے لئے جا بیٹھے۔

پھر پلاؤڈسپکیہ سے مسافروں کو جہاز کا رن کر کے کی ہایت ہوئی۔ میں نے اپنا بیگ اور کراٹ اور کتابیں اٹھائیں۔ دونوں سے اُسی گرم جوشی سے معاف کیا اور بادل یا اس آگے بڑھ گیا۔ جہاز کے اندر سے میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اشفاق اور زہلی آکھٹا وہیں آہنی بار سے لگے جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر شینوں میں زندگی کی گولڈ اسٹ پیڈ ہوئی ٹیکسوں نے شور مچانا شروع کیا۔ جہاز میں حرکت ہوئی اور چند ساعتوں میں ہم آسمان اور کرۂ ارض کے درمیان فضا میں جیسے ملتے ہو گئے۔

(۲)

کئی مہینے گزر گئے بہت آہستہ آہستہ وہ کام بھی مکمل ہو گیا جس کے لئے میں مگر سے

کھلا تھا۔ اب وطن کو لوٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ سفر ختم ہوا۔ البتہ ایک روم کی سیر تھی۔ اور اسلام اور اشتقاق کے مجھے کئی خط آپکے تھے۔ وہ دو دن اب تک روم میں باؤنیری رہا تھا کہ رہے تھے اور مصر تھے کہ گھر کو لوٹنے سے پہلے میں ضرور ان سے مل کر جاؤں۔ چنانچہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۷ء کی ایک سہانی سہ پہر کو زیورج سے سیرا جہاز روم کی طرف روانہ ہوا۔ اور دن ٹھٹھٹے ڈھٹھٹے میں ایک مرتبہ چھ چھینپ ہوئی اسی پر جا اترے۔

جہاز سے باہر نکل کر جب میں دوسرے مسافروں کے ساتھ کسٹم ہال کی طرف ہل رہا تھا۔ تو رہ رہ کر میرا دل اس خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ کہ شاید اشتقاق اور اسلام اس مرتبہ مجھے جینے کے لئے ڈالیں۔ گلاب کے نہیں نے پیرس سے روانہ ہونے سے قبل روم میں اپنے محبوب کے ہوٹلوں کے پتے معلوم کر لئے تھے۔ اور ان میں ایک کو اطلاع بھی کر رکھی تھی۔ کہ شاید میں اسی میں اتر پڑوں۔ مگر دل امید اور مایوسی کے دو جز میں ہچکولے کھارہا تھا۔ چینی مقام پر جانا میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں اسی سفر کے سلسلے میں انس لینڈ تک ہوا تھا۔ جہاں شاید مجھ سے پہلے چند ہی پاکستانی گئے ہوں گے۔ لیکن روم کا سفر میں نے اس مرتبہ پھر زیادہ تر اسلام اور اشتقاق کی وجہ سے اختیار کیا تھا۔ اور ایک حد تک ان سے جینے کی آرزو ہی یہاں کھینچ لائی تھی۔ یہاں تک پہنچ کر ان سے نہ غنا ایک غنیمت کاوشہ معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی کسٹم ہال میں داخل ہوا۔ میری پریشانی ایک گنت مسرت میں بدل گئی۔ عائشہ اور اسلام میرے آتھا۔ میں موجود تھے۔

حادثہ اور اسلم کو دیکھ کر مجھے اپنے دل میں کچھ ایسی خوش اعتمادی اور اپنے عروس
 میں کچھ ایسی شگفتگی محسوس ہونے لگی۔ جیسے بعض اوقات دیرینہ بیمار کی گرتی ہوئی طبیعت کو
 کوئی کارگر ٹیکہ پھر سے تازہ دم کر دیتا ہے۔ مجھے ایک مرتبہ پھر محسوس ہونے لگا کہ میں اس
 اجنبی دنیا کی دوست میں اکیلا نہیں ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی مجھے فرآ کر بس
 کی اس سانی صبح کی یاد آئی۔ جس کے سپیے میں نیویارک کے آئڈل داڈ برائی ٹے
 پر پریشان حالی میں اترا تھا۔ اور نئی دنیا کی اجنبی زمین پر دور دورہ ہوتے ہی انہماقوں کے
 لشکر میں سے ایک پرانے رشتہ کو ڈھونڈنے کی سعی کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا۔ اس
 روز دن۔ م۔ راشد کو اپنے انتظار میں کھڑا دیکھ کر میرا دل کس طرح دوبارہ سرت سے مجھوم
 مجھوم اٹھا تھا۔ اور پھر پورا خیال مجھے لندن کی اس دوپہر کی طرف سے گیا۔ جس میں آج
 سے چند منٹ قبل انگلستان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتے وقت برائی ٹے
 پر امبا حسین اور مادر ملوٹا باوی مجھے الوداع کہنے کے لئے آئے تھے۔ مجھے یاد آیا
 اس دن اجنبیوں کی سرحدوں کی کوکس طرح نظر انداز کر کے ہم تینوں بلند آہنگی سے
 اردو میں یوں باتیں کر رہے تھے۔ گویا ہم لندن کے ساتھ کنسٹنٹن روڈ پر نہیں
 بلکہ نامرنگی ہی میں کھڑے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرا دھیان اپنے استاد پروفیسر
 حمید احمد خاں کے اس رقصے کی طرف گیا۔ جہاں انہوں نے میرے خط کے جواب میں
 مجھے کیرج سے برسٹل میں مکتا تھا۔ اور اُن کا یہ فقرہ اس وقت میرے کانوں میں گونجنے
 لگا یہ تھا را خط کیا آیا۔ یوں معلوم ہوا جیسے میں صحرائے افریقہ میں تنہا چلا جاتا تھا۔

کہ ناگیاں کسی دوست نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے مخاطب کر لیا۔
 میرا سامان دیکھنے میں شاید سٹم والوں کو دیر لگ جائے لیکن اسلم کا سرخ کام آیا۔
 اودیم چند منٹوں میں سٹم کے مراحل سے نارسا ہو کر پہلی نعل آئے۔ یہاں اسلم کی کاروبار سے
 انتظار میں کھڑی تھی۔ اب ہر شام ہر چکی تھی۔ مغرب میں بادلوں کے پیچھے بجلی چمک چمک کر
 بڑھتے ہوئے اندھیرے کا احساس دلا رہی تھی۔ ساحل سمندر سے ٹھنڈی جان پڑ رہا
 کے جھونکے طرک پر سے گذر کر وادی میں نہایت اچھل دوڑتے کی شاخوں سے ٹھیکیدار
 کر رہے تھے۔ ایک عجب سہانا موسم اور دلغریب کیفیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔
 جس میں شام کا رنگ اور نکھر گیا تھا۔

مگر دیار غیر میں شام میرے لئے ہمیشہ ادا رہی۔ بے کاری سے تنہائی کے
 لمحے بہت تلخ ہو جاتے۔ جن کے باعث قلبی افسردگی اور ذہنی پرمردگی سے دم الجھنے
 لگتا۔ دن میں تو مصروفیت کی وجہ سے گزرے ہوئے لمحوں کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن
 جیسے ہی شام کے سائے لے ہوئے گئے کام ختم ہو جاتا اور میں تھکا ہارا ہوٹل کا رخ
 کرتا تو شہر کے در و دیوار پر بڑے بڑے حروف میں یہ لکھا ہوا نظر آتا کہ اب کیا ہو گا؟
 ٹیلی ویژن، ریڈیو، سینما، تھیٹر، کتاب کئی شے بھی شام کی افسردگی اور ادا سے کو کم نہ
 کر سکتی۔ خیالات میں پھنسے ہوئے دوستوں اور عزیزوں کے نعوش ابھرنے لگتے۔ دین
 کے شاعر سے تصور کی دنیا بوجھل ہو جاتی اور دل یاس اور افسردگی میں ڈوب جاتا
 لندن، پیرس، نیویارک، میکسیکو، سمیرا یہ ہے کہ ہمارا اور میا می جیسے نظر فریب شہروں

میں بھی جن کے گوناگوں تفویک ہنگاموں کا سحر دل پر سے اپنی گرفت کو ایک ساعت کے لئے ڈھیلا نہیں کرتا۔ میرے لئے شام اکثر ادا رہی۔

روم میں آج میں نے شام ہی کے وقت قدم رکھا تھا۔ لیکن یہ شاید اسلم کی آمد یا اشفاق سے ملنے کی آرزو کا نتیجہ تھا کہ مجھے آج اس مٹنی کا مطلق احساس نہ تھا۔ جو شام کی آمد کے ساتھ ہی دل پر اثر انداز ہونے لگتی تھی۔ کارہنڑوں کو کاشتی، بازاروں کو طے کرتی، گھبیلوں میں سے گزرتی تیزی کے ساتھ اسلم کے غلیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اس وقت تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ مدام کی شرکیں اور بازار تیز رفتاری روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ عمارتوں اور مکانات کے سایوں میں لوگوں کے جھوم جھولوں کی طرح ادھر اُدھر نمودار اور غائب ہو رہے تھے۔ کہ اچانک میری نگاہیں روم کے نوادریں سے پہلی چیز سے دوچار ہوئیں۔ ہمارے سامنے چوک کے صین وسط میں چھپے ہوئے برقی قلموں کی شفات روشنی میں ایک عظیم الشان سنگی فرارہ پانی کے ایک دو صیا سپید و حارے کو مین پکس فٹ یوں اونچا پھینک رہا تھا۔ گویا آتش بازی کے کسی بہت بڑے نامہ کو کسی نے دیا سٹائی دکھا دی ہے۔ اور اس کے تابناک دہانے سے گھبیل ہوتی چاندی کا ایک ستون آسمان کو چھونے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ گھٹری اپنی تیز رفتار کے ساتھ چوک میں سے گھڑی۔ فرارہ پیچھے رہ گیا۔ لیکن جب تک میری نظر سے مستقل طور پر اوجھل نہیں ہوا۔ میری نگاہیں اس پر جمی رہیں۔ روم کی فنی عظمت سے یہ میرا پہلا تعارف تھا +

(۳)

اور پھر جب میں نے اپنے آٹھ روز کے قیام میں روم کو چل بھر کر مختلف مقامات سے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کس طرح تاریخ اور گزرتا ہوا وقت یکے بعد دیگرے یہاں اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی کیفیت جیسے چھوڑ کر آگے چل گئے ہیں۔ ان فنکاروں کے شاہدے سے جن کے فن کی پرورش کے لئے روم کی امارت اور رومنوں کا فطری میلان طبع ہمیشہ سازگار رہا۔ اندازہ ہوا کہ کس طرح خود کو اور دنیا کو سنوارنے کا جذبہ و منزل کی ترقی کا ضامن رہا ہے۔ اسی جذبے نے ساری دنیا کو ان کی تہذیب سے متاثر کیا۔ اور اسی جذبے کی ہمہ گیری نے رومن اقتدار کے ختم ہونے کے بعد بھی رومن سوسائٹی کو باقی اور رومن زبان کو عرصے تک زندہ رکھا۔

آج محققین کا روم ازمنہ وسطیٰ کا روم اور جدید روم یوں ایک جان اکٹھے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کی کوئی حیثیت باقی نہیں۔ بلکہ ایک کی دید سے دوسرے کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

قیصر کا شہر آج مٹ گیا ہے۔ اس کے کھنڈر ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن جب وہ زندہ تھا تو قیصر کے پایہ تخت میں باہر سے آنے والا اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ وہ شہر کے بانادوں میں سے گزرتا تو اس کی نظریں دونوں طرف ان سر بلند حسین عمارتوں کو دیکھ کر ٹھٹھاکتا جاتیں جن کی نہری چتیں اور مرمری

ویداریں سورج کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرتیں۔ تنگ گلی کوچوں میں کھوسے سے کھوسے
 چھلتا جھوم سے بازاروں میں ٹٹٹ کے ٹٹٹ نظر آتے۔ وہ ایک کے بعد دوسرے
 چہرہ فرسوں کی سیر کرتا ہوا چٹھین اور کلونیم کو دیکھتا، مہبذوں اور مندروں، تھیلوں اور
 کیبل کے میدانوں، محلات اور حماموں، لائٹوں اور محرابی دروازوں کے پاس سے
 گزر کر آنر کمپس، میڈیٹس کے ہنگامہ پرور چوک میں پہنچتا جہاں چھٹے بازاروں کی رونق
 سنگ موسیٰ کے فریشوں کی بہار، مہبتوں اور قصابیوں کے جھوم اُسے متحیر کر جاتے۔ اور
 پھر اس سے آگے کھلے میدانوں میں سدا بہار درختوں کے سایہ دار جھنڈوں سے ذرا
 بڑھ کر پیلا ٹائن کی پہاڑی سے ملحق سلطان شہر کے محل اور قلعے اپنی معیت سے اس کے
 دل کو کلپا پاتے۔ اور وہ اس پہاڑی پر سے اس دریائے ٹائبر کے آٹھوں طوں کا نظارہ
 کرتا جس نے اس عظیم شہر میں کئی تہذیبوں کو بھلتے پھرتے اور دم توڑتے دیکھا ہے
 اور نہ جاننے تاریخ کے کتنے اوراق خود اس کی موجوں نے اٹھ دئے ہیں۔ اس کی نظریں
 بھروسہ اور کشتیوں پر ٹرک جاتی ہیں۔ جن میں بے فکروں کے جھوم دریا کی سیر کا لطف
 اٹھانے میں مصروف دکھائی دیتے۔ اور پھر وہ چٹھتی ہوتی نظر سے سارے شہر کو ایک مرتبہ
 پھر دیکھتا تو اسے یوں معلوم ہوتا گویا عمارات کا ایک سیلاب تھا۔ جو بیاں دامن کر میں
 پہنچ کر ایک تخت رک گیا ہے۔ اور ان عمارات کے اندر سے لوگوں کے جھوم حشرات
 کی طرح ہر طرف پھیل گئے ہیں۔

اور پھر یہ عمارات خندم ہو گئیں۔ یہ لوگ مٹ گئے لیکن روم کی خصوصیت ہے

کہ یہ کسی فنا نہیں تھا۔ اس شرمی مختلف تہذیبیں پہلی پھولیں اور فنا ہوئیں لیکن ایک تہذیب کے فنا ہونے اور دوسری تہذیب کے ابھرنے تک اتنا زمانہ اور مدت نہ گذرے پائی۔ کہ ثقافت اور تمدنی ترقی کے تسلسل میں خلل پیدا ہو سکے۔ خرد و منوں کو ماقبل تاریخ عہد کی تہذیب زوال پذیر صورت میں ورثے میں ملی تھی۔ اور اس کی شکستہ بنیادوں پر انہوں نے پھر ایک نئی تہذیب کی شاندار عمارت کھڑی کر دی تھی قبا میں کاروم بر باد ہوا۔ تو اس نے اپنے خرن سے نئے روم کی آریاری کی۔ آج قرون وسطیٰ اور زمانہ جدید کی مذہب علامتوں اور بآزاروں کو لئے جو روم سورج کی روشنی اور تازہ ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ اسی کے بچے عہد قدیم اور قیصر کا روم صدیوں سے دفن ہے۔ نئے روم کی تکمیل کے لئے پانے روم کے کھنڈروں میں نے ایٹ۔ پتھر اور عمارتی سامان میا کیا۔ جو چند یاد نگاریں اس پر شکوہ عہد کی بچ گئی ہیں۔ وہ دراصل کلیساؤں اور مقبروں میں منتقل ہو گئی تھیں۔ اور مذہبی تقدس نے ان کو تباہی سے بچایا۔ مدفن پرانے روم کی ٹوٹ کھوٹ روم کے باشندوں کے لئے کچھ ایسی بات ہو گئی ہے کہ آج روم میں کلم و بیش ہر پائیں باغ قدیم معبروں سے مزین ہے۔ اصحاب ثروت کے مکانات کی سیڑھیوں پر قدیمی بُت نصب ہیں۔ ہر مہر میں مہر میں خدائے اور ستون پرانے و قترس کی یاد دلاتے ہیں معمولی معمولی گھر بھی مہر میں سلوں اور دہلیزوں سے محروم نہیں۔

مگر عہد متین اور لازمہ وسطیٰ میں اگر روم امرا کا شہر تھا تو اب اس کی تلگ لگیوں

اور محلوں میں زیادہ تر ایسے خاندان جیتے ہیں۔ جن کی آمدنی اپنی ضرورت سے کچھ بہت زیادہ نہیں۔ بلکہ روم یورپ کے ان چند شہروں میں سے ہے۔ جن میں اب تک بھکاری دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس گروہ کے وجود کے لئے پوپ کا وہ لنگر اور کلیساؤں کی وہ خیرات ذمہ دار ہے جس پر سالہا سال تک شہر کے غریب پٹے رہے ہیں۔ جب یہ اعداد وچانک بند کر دی گئی تو بھکاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد روم کے سڑکوں اور بازاروں میں پھیل گئی جس نے نہ صرف لوگوں سے خیرات چوری کرنا شروع کر دی۔ بلکہ نئے میں بزم کے باتاروں میں مائیں اور گلیاں بیک وقت گونجی تھیں اور خیرات کی وصولی اور انکار پر پاپس کی قربانی تھی ایسا تو آج بھی کہیں ہوتا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان اسٹول میں بیٹھ بھکاری بکے بکے مسافر کا ہاتھ روک کر کھڑے ہر جاتے ہیں اور ہر دس کے بیٹھے پر بند مٹ تان کر اپنے سر سے اتاری ہوئی ٹوپی کی طرت اشارہ کر کے لمبا جت کے انداز میں کہتے: "حضور راہ مولانا اس میں کچھ خیرات ڈالتے جائیے۔"

مگر روم میں کوئی گلیبرگ کالونی، کوئی جی۔ او۔ آر۔ سٹیٹ، کوئی ایسا علاقہ متبعین نہیں جو املا کی رہائش یا افسروں کے قیام کے لئے مخصوص ہو۔ صدیوں سے اس شہر میں غریب اور امیر ایک دوسرے کے مہائے میں رہتے چلے آتے ہیں چنانچہ گلیبرگ کے غریبانہ علاقے میں کتور بے کے لوگوں کے خاکت زدہ مکانات کے دوش بدوش اگر خاندانی املا کے قدیم محل کھڑے ہیں تو کورس کے فیشن ایبل جھتے میں صاحب ثروت افراد کی سبیل القدر قیام گاہوں کے سائے میں کم حیثیت لوگوں کے گھٹیا مکان بھی موجود ہیں۔ ادارت اور غربت کے اس قرب لے آج تک کوئی ماسٹر قی فتنہ کھڑا نہیں کیا۔ لیکن

کے میل جول میں کسی بیزرگی کا رنگ آنے دیا ہے۔

(۴)

اتوار کا دن گزارنے کے لئے جب ہم روم سے باہر کپکپ پر گئے۔ تو ہمارے کار
 بیگن کی فسیل کے ساتھ ساتھ گذرتی ہوئی ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی تاریخی عمارت کے پاس
 سے نکلی۔ ہم سے جس کا عمارت، اسلم نے روم میں پانچ لاکھ کرکریا۔ اب اس عمارت کی سرت
 چند دیواریں کھڑی تھیں۔ باقی سب کچھ ڈھسے گیا تھا لیکن ان دیواروں کے ساتھ ساتھ دور
 تک اصل عمارت کے آثار پہلے گئے تھے۔ اور اس وسیع میدان کو دیکھ کر بچہ چلتا تھا کہ یہ
 حمام اپنے وقت میں کتنا بڑا ہو گا۔ بعد میں جب میں نے ایسے ہی حماموں کے اور کھنڈے
 دیکھے تو مجھے اندازہ ہوا کہ رومن تہذیب میں یہ حمام عوام کی زندگی کا کس قدر اہم جز
 تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روم کے حکمران نئے نئے ڈھب اور نئی نئی جگہوں پر حمام بنوانے
 کی فکر میں رہتے، آج بھی نیرو، تائیس، تراجن، کراسا، دیو کلیشن اور دوسرے شہنشاہوں
 کے بنائے ہوئے حماموں کے آثار ان کی اصل عمارت کی عظمت کی یاد تازہ کرتے
 ہیں۔ — ایک دیو کلیشن ہی کے حمام جن کے جھتے میں اب سانپ مارا یا کاغذ بھرت۔
 گر جاتویر ہے، اسارے سے تین ہزار سے زائد نہانے والوں کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔
 کراکلا کے حمام جہاں اب اقوام متحدہ کے ادارے الیف۔ اسے ایک عظیم الشان عمارت
 واقع ہے۔ دو ہزار نہانے والوں کے لئے کفالت کرتے تھے۔ ان حماموں میں بڑے

بڑے ہل بکیلوں کے لئے کچے سمن، موسیقی کے کمرے، تفریح گاہیں، کتاب خانے اور کئی قسم کے حجرے تعمیر تھے۔ اور پھر ان کے گرد اگر دو خوب صورت باغات بڑا کرتے جہاں پھلدار درختوں کے سائے میں مرمری مجستے اور مہربان پتھروں کے تختوں کے وسط میں سنگی فوارے اپنی بہار دکھاتے، یہاں ضیافتوں کا اہتمام ہوتا۔ موسیقی کی مجلسیں آراستہ کی جاتیں۔ فن خطابت کے مظاہرے کئے جاتے بکیلوں کے مقابلے ہوتے چنگے انتظام کے لئے خدمت گاروں اور غلاموں کا ایک پورا لشکر ہر وقت کام پر مامور رہتا۔ چند میل کی مسافت کے بعد ہم کھل نضا میں آگئے اور ہماری کار ایک خوب صورت شڑک پر سے گزرنے لگی جس کے بائیں ہاتھ سمندر کی لگے نیلے رنگ کی چادر چڑھ گاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور دائیں طرف نامہ دار سطح پر سبزے اور ہریا دل کا وسیع و عریض تختہ موزہ تک چلا گیا تھا۔ کار تیز رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور دروم کے مصافحات کا حسن اپنے رنگ بدل بدل کر سامنے آ رہا تھا۔ ریتوں کے جنگل، انجیر کے باغات، ہری بھری چراگاہیں، امداتی کھیتیاں، سینا کی کلینز رفتار سے ہماری بائیں جانب پیچھے کود رہی تھیں۔ اور ان کی دوسری طرف بحیرہ دروم کی سیلاب صفت لہریں تھیں۔ جو سنگی ٹپاڑوں سے سر ٹپکتی ہوئی پیچھے پشتیں تر ساحل کے ساتھ ساتھ سیلوں تک ریت کے چاندی جیسے ذرے دھوپ میں جھلبل جھلبل کرتے دکھائی دیتے۔

ساحل پر دو پہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم دروم سے پچاس میل دور مانا مارگریشا کے ایک حسین گاؤں میں جا پہنچے جو دیوار چٹیر اور ساگران سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں

کے دامن میں واقع ہے۔ اس گاؤں کی سنگی سڑکوں پر سے گزر کر ہماری کار آخر اس بھیل کے کنارے رگ گئی۔ یہاں ہمارا رادہ کشتی چلانے کا تھا۔ تازہ پانی کی اس شفاف بھیل کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ پھولوں سے لدے ہوئے باغیچے حسین سبزہ زار چلدار درختوں کے خورد و خجندہ عطر بیز ہوا سے لعلدار ہے تھے بھیل کے کنارے جیسویں لوگ قومہ خاڑی میں میٹھے کھلی فضا کا طعنت اٹھا رہے تھے۔ خوش پوش عورتوں اور بے فکر بچوں کی ٹریاں دودھ اور مہموم رہی تھیں۔ ایک ایسی کیفیت ہڑت جھائی ہوئی تھی جس سے شبہ گزرتا تھا کہ اس خطے کے لوگوں نے آج تک کبھی فکر اور پریشانی کا مزہ نہیں دکھیا۔ گواٹلی کا وہ حصہ جس میں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ دوسری جنگ عالم کے ہنگامے میں اتحادی فضائی حملہ آوروں کی توجہ کا مقصد مرکز رہا تھا اور سمندر کے کنارے کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اس غارت گری کی ایسی نذر ہوئی تھی۔ کہ ان کی شکل خرواروم کے قدیم آثار سے ملتے لگی تھی۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے بشرے پر کچھ ایسی بے فکری اور تین آسانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے جن سے شبہ گزرتا تھا کہ اس دوہا بتلا میں یا قریہ اٹلی میں نہ تھے۔ یا پھر یہ ماضی کی یاد سے حال کے اطمینان کو پرانہ نہیں کرنا چاہتے۔

ایک گھنٹے کی کشتی رانی کے بعد جب ہم اس حسین علاقے کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے روم کی طرف لوٹے تو دوں ٹرلر رہا تھا۔ ہر ایک خوشگوار ہو گئی تھی۔ دیہات کے لوگ گھروں سے نکل کر چل قدمی کے لئے سڑک پر آ گئے تھے۔ عورتیں ہلوں کی منڈیوں

سے مکی اُن شریعوں کی نگرانی کر رہی تھیں جو شرک کے کنارے اس ہمارے گناہ پر پھینکے گئے
 کوشش کر رہے تھے۔ جس کے لطیف اور خشک مجھ کے شرک سے گذر کر ملگرتے کے
 باغات اور باغوں کی بیلیوں میں سرسبز رہے تھے۔ ہماری کارفرمائے بھرتی ہوئی ان میں سے
 گذری تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے جو بھی ہماری جانب دیکھا وہ سترت سے ہوا میں
 ہاتھ لہرا کر ایک اطلاوی لفظ سپاؤ عصبے اختیار زبان پر لے آتا۔ اشتقاق احمد نے اس
 جامع اور معنی پر وہ لفظ کا ترجمہ یوں کیا کہ ”مجھے اپنا غلام سمجھئے“ اور اس کی تفسیر یہ کہ
 اطلاوی مجلسی آداب کے مطابق یہ لفظ اس وقت ادا کیا جاتا ہے۔ جب مہمان کو الوداع
 کہنی جاتی ہے۔

(۵)

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مکی مکی بوندیں برس رہی تھیں۔ یہ شاید بادش
 کا اثر تھا یا کمزیم کی سابقہ متواتر سیر کہ اسلم کے ہی میں اندر جانے کی تحریک نہ ہوئی۔
 میرے ساتھ عائشہ گاڑی سے آئیں اور کمزیم کی بیرونی سنگی دیواروں میں گذر کر سیم اندر
 پہنچے۔ ہر سو سے جس عمارت کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا جس کی متعدد تصویریں دیکھی
 تھیں۔ اور سینا کی غلوں نے جس کی عظمت کا احساس ہے وہ پے دلا یا تھا ایک پر شکوہ
 کھنڈ کی صورت میرے سامنے تھی۔ چھ ایکڑ زمین پر واقع اس ایک برساتی فٹ بلند
 عمارت میں جس کا قطر ایک تہائی میل کے قریب ہے اور جس میں کبھی ستاسی ہزار مقاشائی

بیک وقت بیٹھ سکتے تھے، آج بھی ایک ایسا ہیبت اور رعب نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا اس کی اس عظمت کا اندازہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی شکستہ دیواروں کی گری ہوئی ممبروں، ٹوٹے ہوئے جھروں اور تباہ شدہ نشیمنوں پر تاریخ کی ان گنت صریح ثابت ہیں۔ اور یہیں معلوم ہوتا ہے۔ مگر یا اس کی گری ہوئی غلام گردشوں کے تاریک سالیوں کے پیچھے ان عظیم الشان شخصیتوں کے میوے اب بھی چل پھر رہے ہیں۔ جو اپنے وقت میں دیوتاؤں کے ہم پل تصور ہوتے تھے۔ اور جن کے حلال اور ہیبت سے دنیا کا ڈھیر آب آب ہوتا تھا۔ میں اس صیب اور پُر شکوہ عمارت پر کھڑا تعجب کر رہا تھا کہ کیسے اور کس طرح لوگ محض تماشاخیوں کی خوش وقتی اور تفریح کے لئے اس چار دیواری کے اندر چار سو سال تک اپنی جانیں نکت کرتے رہے۔ ﴿۵﴾

* اور پھر اسی تعجب اور حیرت کے عالم میں آنکھوں کے سامنے سے تاریخ کے پرے اٹھنے لگے۔ کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی بے جان دیواریں گویا پھر سے جی اٹھیں۔ عمارت پر پھر سے زندگی کا رنگ و روغن ابھرا یا اور اس کی غلام گردشوں، زینیل اور ممبروں میں حیات کی وہی لہر دوڑ گئی۔ جو شاہانِ روم کے وقت میں اس کی چل پھل کی ضامن تھی۔ مجھے ایک ساعت کے لئے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا میں ساٹھ ستر ہزار روہن مرد و عورتوں کے ایک پُر جوش جہوم میں گھرا ہوا ایک خونی ڈولے کو دیکھ رہا ہوں۔ کہ بیسیوں گلیڈی ایٹر، بھڑکیلی رنگوں کی رختوں پر سوار منہ زور گھوڑوں کی لگامیں منسوبی سے ہاتھوں میں تھامے، اسلحہ سے لیس دور سامنے کے دروازے سے اپنی سواری کے

پہلوں اور گھوڑوں کے سروں سے خاک کا عوفان برپا کرتے ہوئے وہاں پہنچ کر یک نشست روک گئے ہیں۔ جہاں قصر کی نشست ہے۔ انہیں دیکھ کر سارا مجمع جوش و خروش سے چلا رہا ہے۔ اب یہ شور بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ دوسرے دروازے میں سے بڑے بڑے اپنی پنجرے اندر لائے جا رہے ہیں۔ جن میں کچھ ایسے لوگ بند ہیں۔ جنہیں عداوتوں سے موت کی سزا مل چکی ہے۔ ایک پنجرے میں رہنروں کی ایک ٹولی ہے۔ دوسرے میں دو جاکل مہوس ہیں۔ ایک میں لٹیروں کا ایک گروہ ہے۔ اور ایک میں چند عورتوں اور مردوں کی جماعت بند ہے۔ جن پر عیسائیت کے پیرو ہونے کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔ پنجرے ریتیلے میدان کے وسط میں روک دئے گئے ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ماشافی شور مچا رہے ہیں غل غپاڑے سے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ عمارت کے سب سے اونچے مقام پر نے فوڈیا محلوں میں تڑنا پکڑے شمشاد کی طرف نظریں جلائے اشارے کے منظر کھڑے ہیں۔ شمشاد نے اتھا اٹھا کر کچھ اشارہ کیا ہے۔ تڑنا پکڑ گئی۔ جس سے ساری عمارت پر خاموشی چھا گئی ہے۔ سامنے کے بلند دروازوں کے چپے سے فوجی انداز کا ایک جلدوس نکلا ہے اس جلدوس میں مختلف طبقوں اور قبیلوں کے لوگ شامل ہیں۔ وہ اپنے ماتحتوں میں اپنے اپنے منصب کے مطابق بجاے اور تیز خنجر اور تلواریں اکھاڑیاں اور تیرکان ڈھالیں اور گرز پکڑے کھڑے ہیں۔ اکھاڑے کا پورا پکڑوے کر یہ جلدوس وہاں جا کر روک گیا ہے۔ جہاں شمشاد کی نشست ہے۔ اب سب بیک زبان یہ اعزاز عبادت بلند آواز سے کہہ رہے ہیں تبصرہ

تجھے وہ لوگ سلام کرتے ہیں جو تھوڑی دیر میں تیرے سامنے موت سے ہم آغوش ہونے

واسے ہیں بشنشاہ نے پھر کوئی اشارہ کیا ہے۔ دھتیں پھر کے اور تیغ زن انہی راستوں
 سے واپس لوٹ رہے ہیں جن سے وہ اندر آئے تھے۔ عمارت پر بالکل تباہ چھا گیا ہے
 مگر ایک ساعت کے لئے اب پھر قرنا پک رہی ہے۔ سانے کی دیوار کے زیرِ حلقے
 میں ایک حجرے کا آئینی دروازہ کھل رہا ہے۔ کوئی سیاہ بھری ہوئی چیز باہر آ رہی ہے
 ایک رتا بھینسا چھانگیں لگانا اپنے سون کی ٹاپوں سے خاک اڑاتا میدان کے وسط
 تک آ گیا ہے۔ اب ایک دوسرے حجرے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ ایک اور سیاہ چیز باہر
 آ رہی ہے۔ ایک قد آور خوشنما ریچھ بھینسے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے دونوں
 مردوں کے درمیان زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ تماشائی چلا رہے
 ہیں۔ نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ان کے شور میں بھینسے کے اپنے کی آواز دیکھنے کی جارہی
 ہے۔ دیکھ کر رہ گئی ہیں۔ بھینسا آخری سانسوں پر ہے۔ لڑائی سے جی چار رہا ہے۔ موت ہار
 چکے ہیں۔ دیکھنے والے آخری وار کیا ہے جس سے بھینسا ڈھیر ہو گیا ہے۔ پھر نکل پڑا ہے
 مسرت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ بستر ہزار لگے ایک آواز کے ساتھ چلا رہے ہیں مسرت
 سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ دھندہ ایک طرف کھڑا غصہ و غضب کے عالم میں زمین سے خاک
 اڑاتا ہے۔ اور اب ایک درجن کے قریب تیار بند چلوان میدان میں آ گئے ہیں۔ پرانا کو
 آگے بڑھ رہے ہیں۔ تیرہ ہزار اپنے بھالوں اور بھجیوں سے گینڈے پر چھپٹ رہے
 ہیں۔ اسے کچل کے دے رہے ہیں۔ دھندہ اس قدر تھک گیا ہے۔ کہ وہ میدان سے
 جاگ جانا چاہتا ہے۔ اس کھیل سے اسے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ مگر انسان درندہ

کو بارتنگ کئے چلے جا رہے ہیں۔ لگاؤ پر لگاؤ لگا رہا ہے۔ زندہ گر گیا ہے۔ اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر گر گیا ہے۔ پھر اُٹھ رہا ہے۔ پھر گر گیا ہے شاید نہیں اُٹھے گا۔ دم توڑ چکا ہے۔ اب نمرؤں کا شور مگوزیم کی دیواروں کو ہلکا کر سامنے کی پہاڑیوں سے ٹکرا رہا ہے۔ میدان صاف کیا جا رہا ہے۔ اب گلیڈی ایٹر اکٹھا ہونے میں آئے ہیں۔ تماشاؤں کی طبیعتیں چمک اٹھیں ہیں۔ وہ انسانی کشت و خون کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ سامنے کی محراب میں کچھ خاک سی اڑ رہی ہے۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں خون آلودہ ہتھیار لئے دوڑ رہے ہیں۔ وہ سامنے آگئے ہیں۔ بارہ گلیڈی ایٹر ہیں۔ جو انعام اپنے یا موت سے ہم کنار ہونے کی سگند کھا چکے ہیں۔ تو یہ انداز ہی شروع ہو گئی ہے۔

حریفوں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ اب ہتھیار چنے جا رہے ہیں۔ اب سب داڑھی دار ہیں۔ میدان میں صرت دو حریف رہ گئے ہیں۔ شہنشاہ کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی دار شروع ہو گئے ہیں۔ لوہے پر لوہے کی ضرب کے آگ کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔ متشانی حریفوں کو قتل کے لئے اجاڑ رہے ہیں۔ ایک قیامت خیز شور و برطوت برپا ہے۔ ایک تیغ زن زخموں سے چر ہو کر گر گیا ہے۔ نالچ اس پر ضربوں کی بارش کر رہا ہے۔ اب اس نے ہاتھ دھوک دیا ہے۔ شاید اس کا دم مقابل مسیہ کے لئے سٹنڈا ہو گیا ہے۔ پھر غل پچ رہا ہے۔ تماشاؤں خوشی سے نالچ رہے ہیں۔ ان کی داو سے مگوزیم کی دیواریں بل رہی ہیں۔ فتوح کی لاش کو میدان میں چھوڑ کر فاتح انعام اپنے کے لئے شہنشاہ کی

نشست کی طرت بڑھ گیا ہے۔ دور سے غلاموں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ سب سے پہلے ایک شخص باقاعدہ میں گزرتے ہوئے ہے۔ گرسے ہوئے پہلوان پر وہ جھک گیا ہے۔ دیکھ رہا ہے۔ اس میں زندگی کی رمت باقی ترضیں۔ شاید اس نے پوری طرح دم نہیں توڑا مگر زہوا میں طہنہ ہوا ہے۔ وہ زور سے نیچے آیا ہے۔ اس آخری ضربے زخمی کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے۔ کچھ غلام کھلی ہوئی لاش کو شریح پر لا دو کرے چلے ہیں۔ جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ اکھاڑے کو خون اور ٹوٹے ہوئے ہتھیار کے ٹکڑوں سے پاک رہے ہیں۔ میدان پھر صاف ہو گیا ہے۔ اب دو اور تیغ زن میدان میں آئے ہیں۔ رٹائی شروع ہو گئی ہے۔ مگر ایک پہلوان فوراً ہی زخمی ہو کر زمین پر آ رہا ہے۔ زخم گہرا آیا ہے۔ تراب رہا ہے۔ قاتلانہوں میں پھر شروع کیا ہے۔ مار دو۔ مار دو۔ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ خراج اس کا قصہ پاک کرنے کے لئے جھپٹا ہے۔ لیکن اس کا ہاتھ رک گیا ہے۔ کیونکہ زخمی نے جان بخشی کی التجا میں اپنا ہاتھ قیصر کی نشست کی سمت اٹھا دیا ہے۔ چہرہ ٹاچھا گیا ہے۔ قاتلانہوں کے فرار کا اٹھنا قیصر جہم کی دس درخواست پر غور کر رہا ہے۔ سوچ رہا ہے۔ قاتلانہوں کے فرار کا اٹھنا کیا ہے۔ فیصلہ زخمی کے غلات ہن ہے شہنشاہ نے اپنا انگوٹھا زمین کی طرت جھکا دیا ہے۔ اس اٹھنے پر دوسرا تیغ زن زخمی پر پیکا ہے۔ اس کے خنجر کے پے پٹے اڑوں نے اسے ہمیشہ کی نیند ملا دیا ہے۔ پھر غل پٹ گیا ہے۔ پھر سرت کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ میدان کے صاف ہوتے ہی دو اور پہلوان سامنے آ گئے ہیں۔ اس جنگل کے بعد

اور ڈنکل، پھر اوڈنکل۔ اور پتے چڑھ کر ہو چکے ہیں۔ چھ پہلوؤں کی کھلی ہوئی لاشیں پھیل چکی ہیں۔ لیکن قماشائوں کی طبیعت سیر نہیں ہوتی ہے۔ وہ ابھی اور کشت و خرابی دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ اب قیدیوں کا پھرو میدان میں لایا گیا ہے۔ قیدی کھینچ کر باہر نکال لئے گئے ہیں۔ خالی پھرو واپس چلا گیا ہے۔ کمزیم کے زیریں حصے سے ایک مصیب آہنی دروازے کے کھلنے کی آواز آرہی ہے۔ جس کے ساتھ ہی شیروں کے غرائف کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ شیر میدان میں آگئے ہیں۔ قیدیوں پر چھٹ رہے ہیں۔ مرنے والوں کی دلدوز پکار و حکیم کی پہاڑی تک سنائی دے رہی ہے۔ لیکن اب رجم کے قہقروں نے اذیت اور تکلیف کی الی جگر پاش جھجھج کو دبا دیا ہے۔ ایک قیامت خیز شور برپا ہے۔ اس قدر ہنگامہ ہے کہ سراسر حکمران لگا ہے۔ میں پسینے میں ڈوب گیا ہوں۔

معاذ میں چونکا۔ عائشہ کہہ رہی تھیں: "بارش تیز ہو گئی ہے۔ ہمیں واپس چلنا

چاہئے۔"

(۶)

اس سے قبل میں نے سینٹ پیٹرک کی شہر تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ مگر ان تصویروں سے اس عظیم الشان گرجے کی عظمت کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن مجھے اس کی اصل شان کا اندازہ صرف اسی وقت ہوا۔ جب عائشہ اور اسلم کے ساتھ میں اسے دیکھنے پایا زوی سلن پیٹرو

میں پہنچا۔ مرغزوں اور پیل پاویں کی ایک عظیم اٹلان ووسط تقاریریں گھبرائے ہوئے اس
چوک کے وسط میں نیز کی رستہ لاکھٹے۔ جو عیسائیت کے عروج سے قبل متدیم
روم میں خود نیز کی جولا نگاہ کی زینت ہوا کرتی تھی۔ جب ہماری کارہیلا زاموسی سماں پترو
کے چوک میں اس لاکھٹے کے پاس سے گزری تھی تو میں نے دیکھا کہ روم کے واقعہ
کھنڈرے پتے بیسیوں گپ نواز عورتیں اور متعدد بے فکرے صحراؤں کے نیچے پیل
پاویں کے سارے بیٹے یا بیٹے اپنی خوش گفاری یا کھیل کود میں مصروف ہیں۔ ہماری
کارہائے عمارت کے بائیں بازو میں وہاں رک گئی۔ جہاں پاپا کے سوس و سستے کا
ایک محافظ اپنی رچھا رنگ درون میں پرے پر کھڑا تھا۔ ہم کار سے اتر کر ایک بہت
وسیع و عظیم دالان میں سے گزرتے ہوئے کلیسا کے آہنی پھانک سے عمارت کے
اندرواغل ہوئے۔

سینٹ پیٹرز و نیا کا سب سے بڑا گرجا ہے لیکن اندر مابا کما انسان کو اس کی
صیب و صحت اور بلندی کا احساس نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی قوج قربان گاہ اور بجیل کے
بیش بہا ساز و سامان جناب پطرس کی تربت، حضرت مری کے مجسمے، تاجی عجائبات
غریب تبرکات دیواروں کی قصیریوں، چھتوں کے لغوش اور فنی فراز میں کچھ اس طرح گم
ہو باقی ہے۔ کہ وہ اصل کلیسا کی وصت و بلندی سے یکسر بے خبر ہو جاتا ہے اور حقیقت
اسے دنگ کر دیتی ہے۔ کہ اس عمارت کی دلکشی اور اس کا فنی حسن محض ایک شخص کے
افرق الفطرت استداد اور قابلیت کا مرہون منت ہے۔ گو سینٹ پیٹرز کی دیواروں

کی تصویر کاری پینٹل کے قلم کی شرمندہ احسان ہے لیکن اس کے علاوہ سنگ تراشی بھرتی اور فنِ تعمیر کے باقی تمام ذرا اور صرف ایک شخص مائیکل انجلو کے کسبِ کمال کی معراج ہیں ان کا فہم کی دید سے ناظر کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ انسان جو اپنے اہراک و ذکاوت سے فن کے ایسے ابدی نمونوں کی تخلیق کر سکتا ہے۔ بڑا ہی خود قدرت کا کتنا بڑا شاہکار ہے۔

یہی روم کی ابتدائی کیفیت اسی طرح پردہ راز میں ہے جس طرح تسلیم روم کی حقیقت۔ نیازِ سب شروع شروع میں کمزور ہے کے لوگوں میں پھیلا بشرق سے گناہ منتقل اسے کہ روم میں آنے۔ پطرس کی آمد پر ایک چھوٹی سی جماعت مسیحیوں کی پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد پال بھی پطرس سے آئے۔ اور خفیہ خفیہ نے مذہب کا پرچا دور دور تک پھیل گیا۔ روم کی حکومت شاید نے مذہب کے قرض نہ کرتی لیکن اس نے روم کے سلاطین و تاجران کے لئے قربانی دینے سے انکار نہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد نیرو کی امید یا اطلاع سے روم میں لگ لگ گئی۔ اور آدھا شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ موقع نیرو کے لئے قیمت تھا اور اسے اس نئی جماعت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا ہاں ہاتھ آ گیا۔ جن مسیحیوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے لئے دنگین کی پاڑی کے نیچے موت کی سزا مجوز کی گئی اس سزا کا ڈھنگ نیرو نے ایجاد کیا۔ اس مات بہت بڑے پھینے پر روم میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ شہر کے تمام گلی کوچوں میں جشن کی کیفیت پیدا کی گئی۔ اور پھر جب یہ ہنگامہ اپنے جہنم پہنچ گیا۔ قیدیوں کو صلیب پر آٹا لٹکا کر ان کے جسموں پر تیل اور

مسلمے چھڑکنے کے بعد انہیں آگ دکھا دی گئی۔ ان انسانی مشنوں کی خوفناک روشنی میں رتوں کی دوڑیں ہوئیں۔ رووے نے ضیانت اڑائی۔ اور عوام جہنم کے ہنگاموں میں کھڑے گئے۔

اس قتل گاہ سے کچھ فاصلے پر پطرس کی لاش وہاں دفن ہے۔ جہاں سینٹ پیٹر کا کلیسا واقع ہے۔ اس سے ملحق وٹیکن کی پہاڑی ہے۔ جہاں وٹیکن کا مختصر سا شہر آباد ہے۔ چار دیواری کے اندر گہری جوتی دنیا کی اس سب سے چھوٹی ریاست کے ایک ہزار نفوس پر پاپائے روم کی حکومت ہے۔ اس ریاست کی اپنی ٹمنگیاں، اپنا ٹاک اور تار گھر اپنی ریل، اپنا ریڈیو سٹیشن، اپنی پولیس اور اپنا نظام حکومت ہے۔

روم میں کلیساؤں، خانقاہوں، مذہبی درس گاہوں، طہاسب خانوں کی اس قدر افراط ہے کہ اس پر بعض اوقات خالصتاً مذہبی شہر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ شہر کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ ہو گا۔ جہاں کوئی مذکورئی ایسی مذہبی عمارت موجود نہ ہو۔ جس کا تعلق مسیحیت کی ابتدائی دور سے مذہبوں، کلیوں اور بازاریوں میں جا بجا حضرت مسیح اور مقدس مریم کے مجسمے کھجوں پر آویزاں ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ پادریوں، طہاسبوں، جنوں اور مذہبی پیشواؤں کی ٹولیاں آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ شام کے وقت جب سورج کی رد پہلی کرنیں سینٹ پیٹرک کے امتداد زمانہ سے سنولہنے ہوئے گنبد کی بیرونی لکیر کو سرخ دھاری میں بدل دیتی ہے۔ تو کب کنت کہیں دودھ سے شہر کے ہنگاموں پر ترقی ہوئی گھنٹی کی ایک خوش آمد آواز کانوں میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سیکڑوں

چھوٹے بڑے گھنٹے اس آواز کا ساتھ دینے کے لئے ہاگ اٹھتے ہیں۔ اور گھنٹوں اور گھنٹیوں کی حسین دو لکشاں، نرم و نازک، بلند اور مدھم آواز اپنی ہم آہنگی اور یک جہتی سے ایک دھواں نغمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اوپر تیل کے اس چمکیتے ارتعاش پر گریبا نضا کا دل اور کائنات کی روح رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ اور پھر اسی طرح نغمے کا یہ طوفان تدریجاً کم ہوتا ہوا دیرپائے مائیکر کی لہروں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ شر پر سکون اور خاموشی کا تسلط ہونے لگتا ہے۔ اور مصفاغات کے باغوں میں انگور کی پیلیں، انجیر اور انار کے درخت اور وہابی میں زمیں کے پڑی نغمے کی صدائے بازگشت سے پٹ کر غید کی تیاری کر لے گئے ہیں۔

ہم ایٹمیاتی عام طور پر اپنے آپ کو مذہب کے ہیبت و لداوہ خیال کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ مادہ پرست مغرب کو مذہب کے کوئی سروکار نہیں۔ اور وہاں کے لوگوں کے طوں میں دھانی اطمینان کے لئے کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ یہ خیال کس قدر بے صحنی ہے۔ اس کا اندازہ مغرب میں جا کر ہی ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مغرب میں گرجوں کی رونق اور مذہبی محاسن کا اثر و دام ہمارے ہاں کی نمازوں اور محاسن سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں مذہب حکومت کا ایک اہم جزو متصور ہوتا ہے۔ جہاں کلیسا کے پیشواؤں اور پادریوں کی تعیناتی اور تقرری اس طرح ہوتی ہے جس طرح دوسرے ادب و حکومت کی دہاں کے لوگ تبلیغ مذہب کے لئے ہم سے کہیں زیادہ چندے دیتے ہیں۔ بیلٹوں کو دینا گئے گوشے میں بھیجا جاتا ہے۔ مذہبی کتابیں چھپو، چھپو اگر مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ اور

پھر ہمارے ہاں کے ملا کی نسبت ان کا پادری کہیں زیادہ عزت و توقیر کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ دینی کتب کا تقدس ہمارے ہاں صحائف کی نسبت وہاں کہیں زیادہ ہے اور وہ صحائف اور دعائیں اور مناجاتیں، تسبیح اور گنڈے وہاں بھی ایسی شد و تدر سے چلتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں۔ وہاں بھی مذہبی پیشواؤں کی کہ امتوں اور مجازوں کی حکایتیں ویسے ہی سننے میں آتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں۔ بیسواد اور ولادت و عزت کے موقع پر پادری کی ضرورت وہاں بھی محسوس کی جاتی ہے۔ جس طرح ان مواقع پر ہمارے ہاں ملا کی حقیقت میں مذہب کے توہم سے خود آزار و ہنس نہ ہم۔ بلکہ تعلیم کی فراوانی کے باوجود اگر وہ اپنی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی میں ہم سے کم نہیں تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں مذہبی حرف عمل ہماری نسبت کہیں زیادہ ہے۔

ہمارے ملک میں تو بہات کا حال ناقابل بیان ہے۔ خدائے بزرگ سے بدعتوں سے بدعتوں سے بدعتوں کے بدلے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ضعیف الاعتقاد لوگ عزالت پر جاتے اور بڑا راست بڑا گناہ فراغے دعائیں مانگتے ہیں۔ کوئی اولاد کے لئے خزانوں سے منت کرتا ہے۔ کوئی روزگار مطلب کرتا ہے۔ اور اس طرح مسائل کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ ہمارے بزرگ گاہی دین نے بھی اس کو بدعت ٹھکرے بنا لیا ہے۔ اسی طرح توفیروں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ لوگ بچوں کے گلوں میں آدھ آدھ سر کے قریب دذنی کاغذوں کے ڈھیر باندھ کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تمام آفات ارضی و سماوی کی حفاظت کی دستاویز حاصل کر لی ہے۔

غرضیکہ ضعیف الاعتقادی کچھ شدتی ممالک ہی سے مخصوص نہیں مغرب میں بھی اس کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے روم میں ایک ایسے کلیسا کو دیکھنے کا موقع ملا جہاں حضرت یسے کا ایک ایسا مجسمہ دکھایا تھا جس میں انہیں بچے کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ اس مجسمے کے نام دنیا کے گوشے گوشے سے روم کی عیسوی کلیسیوں کی طرف سے تیار اور خط و نشان وصول ہوتے ہیں۔ پچھلے دو تین روز کے خطوط کا ایک ٹھاسا انبار اس کے سامنے رکھا تھا۔ کچھ خطا ندرتوں میں۔ تھائی لینڈ۔ برازیل۔ چلی تک سے آئے تھے۔ ان میں خوش عقیدہ لوگوں نے اپنے گھر پر مسائل اور کامیابیوں کی شکایات میں اپنے آسانی باب سے استمداد چاہی تھی مجھے کے قریب ہی ان مخالف کاٹھیر بھی موجود تھا۔ جو احسان مند افراد نے اپنی مشکلات کے حل ہو جانے پر بطور شکریہ بھجوائے تھے۔ ان میں سولے چاندی کے زیور گھڑیاں۔ پارچات بھی کچھ شامل تھے۔

مگر میرا یہ خیال کہ مغرب کے مقابلے میں ہم ایٹمیاتی زیادہ مذہب پرست واقع ہوئے ہیں۔ روم کی سیر سے تین ماہ قبل اور جنوری ہی کو بدل چکا تھا۔ اس دن میں نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا جس کی دید سے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ خدا کی یاد کچھ ہمارا ہی حصہ نہیں۔ وہ دن جنرل آئزن ہاؤر کی مندر نشینی کا تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ مندر نشینی میں جو امریکہ کی سیاسی زندگی اور اس کے بلوی معاملات کا ایک حصہ ہے۔ مذہبی رنگ کس قدر دخل ہو گا۔ اس دن میں نے واشنگٹن میں عقیدت اور شعور و حضور کے جن جذبات کے اظہار کو دیکھا وہ میرے

لئے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔

حقیقت میں منشی سنی کی اصل اور آئینی رسم تو محض یہی ہے کہ چھپ جٹس کے روپ و بخیل پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا جائے کہ نیا صد رہنے عہد میں ملک کے زمین کی لمبائی کرے گا۔ اپنے وطن اور ملک و ملت کے مفاد کی نگہداشت کرے گا۔ اور ان لوگوں کی خدمت کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھارے گا۔ جنہوں نے مخفیہ طور پر اسے اپنے ملک کے سب سے بڑے منصب کا منزاوار ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس آئینی رسم کی ادائیگی کا آغاز چھپ جٹس کے الفاظ سے نہیں بلکہ شیگلٹن کے روسن کیتھلک لاٹ پادری کی اس ٹوٹا سے ہوا جس کا ایک ایک لفٹ خدائے بلند و بالا کی بزرگی اور برتری اس کی قدرت اور قادریت کا معترف تھا۔ جب لاٹ پادری نے خدائے اس شخص کی کامرانی اور کامیابی کے لئے دعا کی۔ جو چند سامعوں میں امر کیہ کی صلاوت کی بعد غیر فوسہ داریوں کو سنبھالتے والا تھا۔ تو مجھے اس مجمع میں شروع و حضور کی ایک ایسی بے پناہ کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔ جو مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے لوگوں کی جماعت ہی میں پہا پر سکتی ہے۔ یہ وہ جہوم تھا جس کے افراد کے جھکے ہوئے سر اپنے احساس جدگی سے اور جس کے خورد و ٹکریں ڈوبے ہوئے چہرے اپنے اعزاز بے چارگی سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ اس وقت کیسٹل کے وسیع و عریض علاقے میں نہیں بلکہ کسی اور ایسی دنیا میں ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں وہ سب اپنے ملک و ملت کی طاقت اور امارت کے باوجود ایک ان دیکھی بستی کے سامنے چپ چاپ کھڑے اس کی مدد کو پکار رہے

ہیں۔ اس کی برکت کو طلب کر رہے ہیں کہ ان کی زندگی کا یہ اہم دن آسنے والی نعمتوں کا
 پیش خمیہ ثابت ہو۔ اس موقع پر میری نظریں بے اختیارانہ طور پر سابق صدر رٹو دین کے
 چہرے پر گئیں۔ مجھے یوں دکھائی دیا کہ یادہ غور کر رہے ہیں کہ کیا ان کے عہدِ حکومت کو
 بھی خدا کی برکتیں میسر آئی تھیں۔ اور پھر میں نے آئزن ہاور کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ عددِ درجہ
 بے چین اور مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ یادہ بے حد متفکّر اور پریشان ہیں۔ کہ کیا خدائے
 ذاتِ ان کے لئے منصب کے فرائض کی ادائیگی میں اُن کی نامرور سامی ہوگی۔ اور جب
 پادری نے کہا کہ خداوند تیرے روبرو اس مجمع میں تیرا حقیر بندہ آئزن ہاور کھڑا ہے
 تو جانتا ہے اسے ملک کی قیادت کے لئے منتخب کرنے میں تیرے سوا کوئی دوسرا
 نے کتنے غور و غور کتنی سوچ بچار سے کام لیا ہے۔ لیکن اگر اس انتخاب کو تیری برکت
 نے نہیں فوٹا تو ہم تیرے حضور گڑگڑاتے ہیں۔ کہ تو اپنے رحم و کرم سے ہمارے فیصلے
 کو اب ہمارے ملک و ملت کے لئے فرومبابت کا موجب بنا دے۔ ہم اپنی کم نہیں
 کے اعتراف میں اپنے سر کو تیرے حضور میں جھکائے تیری مدد کو پکارتے ہیں کہ تو اس
 فیصلے کی لاج رکھ لے۔ خداوند اگر تیرے اس ملک کی سوا کوئی دوسرا آدمی میں ایک بھی
 ایسا خوش نصیب فرد ہے۔ جس کے کسی ایک عمل نے تیری خوشنودی حاصل کی ہے
 تو ہم تجھے اس نیکی کا واسطہ دیتے ہیں کہ تو اپنے اس حقیر بندے آئزن ہاور کو اپنے کرم
 اور اپنی عنایات سے سرفراز فرما تاکہ اس کے ہوش و خرد میں ایسی تیزی اور اس کے
 قوا میں ایسی طاقت پیدا ہو سکے کہ وہ نیکی اور شرافت، عزم اور جرات سے مصائب

اور قیادت کے اس تاریک دور میں تیرے بندوں کی سیج بنائی کر سکے؟ تو مجھے یوں محسوس ہوا گو یا یہ تمام مجمع تمام واشگلاہی تمام امریکہ تمام کائنات اس قمار مطلق کے حضور میں بھی برائی کھڑی ہے جس کے نام ہی سے ہر کام کا آغاز ہوتا ہے جس کے حکم ہی سے ہر کام سرانجام پاتا ہے۔ اور جس کی خوشنودی ہی سے ملکوں اور وقتوں کی قسمتیں حکمتی ہیں۔ اور پھر میں سوچنے لگا کہ خدا کو مدد کے لئے پکارنے میں کچھ اہم اشیائیں بھی کا اجارہ نہیں۔ اور میں نے جب ایک مرتبہ پھر امریکہ کے ان عوام پر ایک نظر دوڑائی، جہاں وقت پادری اور مسٹر آڈن ہاور کے ساتھ خدا کے حضور میں ہر چھ کائے کھڑے تھے تو یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ کہ حسبِ لمبی موقع اور مل نازک ہوتے ہیں تو انسان کا شعرو بخود خالق کے حضور میں کیوں جھک جاتا ہے۔

(۷)

میری دلہی سے ایک دو روز قبل شام کے کھانے کے لئے اسلم کی تجویز کے مطابق ہم ایک اطالوی ریستوران میں چلے گئے۔ طعامِ خاں کچھا کچی بھرا ہوا تھا۔ اس قدر مہمانِ جمع تھے کہ ذرا صوف کھانے کی کوئی میز خالی نظر آتی تھی۔ بلکہ کئی لوگ اس انتظار میں کھانے والوں کا منہ تک رہے تھے کہ وہ کب کھانا ختم کریں۔ اور کب یہ ان کی جگہ پر قبضہ جمائیں۔ غالباً مغرب کی اسلم سے جان پہچان تھی یہیں دوا دے میں کھڑا دیکھ کر وہ ہماری طرف دوڑا ہوا آیا۔ اور ہم سے مصدرت چاہنے کے بعد ہمارے لئے جگہ

کی تلاش میں کمروں میں گھوم گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی واپسی پر معلوم ہوا کہ اس نے پہلے
 سے ایک میز تلاش کر کے مخصوص نوکر دی ہے۔ لیکن میں ابھی پہلے مسافروں کے اُتر جانے
 تک چند رہا میں منت تک انتظار کرنا ہو گا۔ وقت کو کاٹنے کے لئے اسلم بھی طعام خانے
 کے دیوے جیسے میں اس جگہ گئے۔ جہاں حمد مفتی کا ایک روم کنواں ایک اندھیرے
 جھبرے کے اندر اس ریٹورنٹ کے غیر ملکی گاہکوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ تاریک کنواں
 جو شاید اٹھارہ انیس صدیوں کی پرانی یادگار تھا۔ اب تک اسی حالت میں تھا جس میں غالباً
 دو منوں نے اسے چھوڑا تھا۔ اس کی منڈیر پر جو امتداد زمانہ سے کیرسیا ہو چکی تھی۔ پانی
 کھینچنے کی روپے کی چوخی جوں کی توں گڑھی ہوئی تھی۔ اور کسی نامعلوم دھات کے چند ٹپٹے
 ہوئے سیاہ برتن ایک کونے میں بکھرے پڑے تھے۔ ایک غوثناک قسم کا روشن دان جواب
 زیر زمین آچکا تھا۔ اس داستان کی غمازی کر رہا تھا۔ جو اس کنوئیں سے وابستہ تھی۔
 اور جس کی رو سے اس کا قلع میسائیت کے اس ابتدائی دور سے تھا جس میں نئے مذہب
 کے پیروؤں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے تھے۔ اس کنوئیں کی موجودگی سے کمرے
 کے فرش میں نمی آگئی تھی۔ اور دیواریں کچھ اس طرح سیلی ہو رہی تھیں کہ ان کا پستر اور
 قلعی جگہ جگہ سے اڑ گئی تھی۔ یہ بھی شاید ہم ہی کا اثر تھا۔ کہ کمرے میں ہلکی ہلکی غیر خوشگوار
 باس برطون سیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے سنے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔
 ایسے نیشن اہل طعام خانے میں متعلق کنوئیں کی موجودگی کو دیکھ کر مجھے لندن کا
 مشہور شراب خانہ ڈورٹی ٹوک یاد آ گیا۔ اجماد شاہی کی افسانہ طرازی نے اس سڑ خانے

کی مدد نامی حیثیت کو اس قدر جاگرو یا تھا کہ میں اس کی زیارت کا شرف حاصل کئے
 بغیر ذرہ سکا۔ اس دن ہم دونوں پر ونسیہ حمید احمد خاں سے کیمبرج میں مل کر شام کی ٹرین
 سے بورپل سٹریٹ کے ریڈے اسٹیشن پر اتارے تھے۔ چونکہ یہ شراب خانہ اسٹیشن کے
 بالکل قریب ہی ہے۔ اس لئے ہم اس کا پتہ پوچھتے پوچھتے منزل مقصود پر جا ہی پہنچے
 اس جگہ سے متعلق ساری داستان قریبے یاد نہیں رہی۔ مگر اس کے مندریٰ اجزاء یہ ہیں۔
 کہ سو سو سال قبل ایک شخص ٹوک اس شراب خانے کا مالک تھا۔ اتفاق سے اس سے
 کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا۔ وہ تعزیر کے خوف سے یورپ کے کسی شہر کو بھاگ گیا۔ شراب خانہ
 مہینوں اسی طرح بند پڑا۔ آخر ٹوک کے مرنے کی اطلاع اس کے لواحقین کو پہنچی۔ اور
 انہوں نے پرانے کاروبار کو چلانے کے لئے شراب خانے کو دوبارہ کھولا۔ اندر مکڑیوں میں
 غلامت کے انبار لگے تھے۔ جگہ جگہ مکڑیوں نے دیواروں اور چھت پر جالے بن رکھے
 تھے۔ فرش مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹوک کا تانا اور دوسری جانب اس کی بقی غافروں
 کے ہاتھوں سے پڑے تھے۔ ان کے ادھر ادھر کچھ مری ہوئی چمچاؤٹیں لٹری تھیں اس
 شراب خانے کو شرف دینے کے لئے ٹوک کے لواحقین کو ایک تجویز سوچی۔ انہوں نے
 اس تمام غلامت اور مردار جانوروں کے ڈھانچوں کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اور اس جگہ
 کی غلامت کی رعایت سے شراب خانے کا سابقہ نام ڈکس سے بدل کر ڈورٹی ڈکس
 رکھ دیا۔ یہ شراب خانہ آج اسی نام سے لندن میں مشہور ہے۔ اور اس میں مرے بہنے
 کتے اور بقی کے ڈھانچے مردار چمچاؤٹیں۔ فرش کی غلامت۔ دیوار کے جالے لوگوں کو

پیشانی کہنے کی بجائے ان کی توجہ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ اور شراب کے دسیا اس کے
اس غیر معمولی ماحول کو اس کی تاریخی حیثیت کی وجہ سے کچھ ایسا مروجہ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ
اندن کے شہر شرب خانوں میں شہد بولے گئی ہے۔

ہم اس کنوئیں والے کمرے سے نکل کر اوپر ڈانٹک باں میں پہنچے۔ تو جہاں سے
میز خالی برچکی نکلی۔ اور صبح ہماری مادہ مک رہا تھا۔ جب ہم کھانے پر بیٹھے۔ تو یہ دیکھ کر کچھ
حیرت ہوئی۔ کہ ہم سے خوراک تھامنے پر مضمینوں کا ایک طائفہ ہاتھوں میں آلات موسیقی
تھامے کھانے والوں کی ایک جماعت کو جھڑپ میں لے پوری ٹینڈر ہنگی سے موسیقی کی
تانیں ڈارہا ہے۔ گانا ختم ہوتے ہی گویے ہماری میز کی طرف پکے ادا نمود لے جاوے
کہ جاگ دکھڑے ہو کر ایک گیت چھیڑ دیا۔ یہ گانا سیری نیڈ کی ایک شعل غنی۔ اور گویے عشق و
فراق کے وہی مرد و گیت گارہے تھے۔ جو حیدر گدشت کے۔ وہاں پر و آیا ہم میں عشاقی
اپنی محبوبوں کی کھڑکیوں کے نیچے انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے گویا کہتے تھے
لوگوں کے غل اور چٹائیوں پر چھری کانٹے کے ٹوڑے کے باوجود مضمینوں کی خوش آندہ آوازیں
اور سازوں کی نظر اڑانی نے اس گیت کو مد ورجہ پر کشش بنا دیا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا
نازنینیں کس قدر ملک دل ہوں گی۔ جو ان بکشی گئیوں سے متاثر ہو کر مضمین پر پھپھروں کا
گلدستہ پہننے کی بجائے اس کے سر پر اوپر سے گلدان ٹپک دیا کرتی تھیں۔ کچھ دیر میں یہ
موسیقی ختم ہو گئی۔ ہرادو۔ ہرادو کی داد کو سے ہی گویا۔ اور مضمینوں نے اس سانس کے
جواب میں احسان مندی سے اپنے سر جھکا دئے۔ پھر وہ ہماری میز سے ہٹ کر ایک دوسری میز

پر چلے گئے۔ اور اب ایک دوسرا گیت فضا میں گونجنے لگا۔

(۸)

اقبال صوبہ روم میں وارد ہوئے تو انہیں اس شہر میں عجیب و غریب خلعت پہنی شادی۔ وہی
وفا دینی نظرائی جو دلی کے تاج پختہ شہر سے مخصوص ہے۔ لیکن جب میں نے روم کے
باشندگان کو دیکھا تو مجھے ان میں کچھ وہی بے کاروں کے ہجوم خوش ٹھکان کی فراوانی
تن آسانی کی خواہشیں، آرام طلبی کی آرزو وہی فراخ دلی وہی صفا فانی، وہی
رواداری، وہی اسرار، وہی توکل نظر آیا۔ جو میرے ہم وطنوں کی خصوصیت ہے اور مجھے
قدم قدم پر یوں محسوس ہوا گویا میں اپنے ہی لوگوں میں سانس لے رہا ہوں۔ میرے
اور گرد جو عورتیں اور مرد چل پھر رہے ہیں۔ اپنی عادات و اطوار و جذبات و احساسات
میں وہی ہیں جن سے بھڑک کر میں یہاں آن پہنچا ہوں۔

روم میں میں نے کئی ایسے مناظر دیکھے اور میں کئی ایسی کیفیات سے دوچار ہوا
جنہوں نے لاہور اور دہلی پٹنڈی کی یاد سے مجھے کئی بار تڑپایا۔ میں نے دیکھا کہ روم میں
آسمان کی نیلاہٹ اسی قدر گہری و صوبہ اتنی ہی شگفتہ اور زمین ایسی ہی سرسبز تھی۔
جیسے لاہور میں نظر آتی ہے۔ بلکہ جب میں جوانی اٹھنے کے ایک جیسے نکل کر دوسرے
جیسے کی طرف جا رہا تھا۔ تو میری ٹکسی راستے میں کچھ ایسے باغیچوں اور کوٹھیلوں کے سامنے
سے ہو کر گذری جن کو دیکھ کر مجھے ایک ساعت کے لئے یوں محسوس ہوا۔ گویا میں

مردم میں نہیں لہجہ میں ہیں اور میری گلاشی لافس روڈ پر سے گزرو کہیں کہیں روڈ کے
 اس حصے پر چل رہی ہے جہاں گلف روڈ کے دو بانے سے جاملتا ہے۔ اور پھر جب فٹ
 طے کرنے کے بعد ہم کھلی سڑک پر آگئے تو چانک ایک ایسی غیر متوقع بات پیش آئی جس
 نے ایک مرتبہ پھر میرے دل میں وطن کی یاد تازہ کر دی۔ ٹیکسی کے ڈائریور نے بظاہر بغیر
 کسی وجہ کے گاڑی کو سڑک کے ایک طرف روک کر چھوٹا ٹک گاڑی اور نکل کر بے بے
 ڈگ جبرتا سڑک کے دوسری جانب وہاں ہا پہنچا جہاں ایک سائیکل زمین پر گری ہوئی
 تھی۔ اور کچھ آدمی اس کے سامنے کھڑے بظاہر جھگڑ رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے
 کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ اور پھر میں دکھائی دینے لگا جیسے ایک ہنگامہ
 برپا ہو گیا ہے۔ اور لوگ دو ذریعوں میں تقسیم ہو کر کسی مسئلے پر توجہ میں پر اترائے ہیں
 اسی ہٹا بخشی میں وقت گزرنا لگیا۔ دس منٹ پندرہ منٹ میں منٹ آدھ گھنٹہ آخر خدا
 خدا کر کے جمع چھٹنے لگا۔ لوگ اپنے اپنے بستے ادھر ادھر کچھ گئے۔ ایک شخص نے
 سائیکل اٹھائی اور سوار ہو کر سمت مخالف کو چلا۔ اب میرا ٹکڑا خود رو سے میری طرف
 آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اب تک غصے میں کتا جھکتا چلا رہا تھا۔ میرے قریب آیا تو
 وہ اسی طرح بلند آواز میں گرج رہا تھا۔ گویا مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے۔ اور
 یہ ہنگامہ میری وجہ سے برپا ہوا ہے۔ یہ ساری بات مجھے عجیب و غریب معلوم ہو رہی
 تھی۔ سو جیسے ہی ہم ہوائی اڈے پر پہنچے تو اپنے استعجاب کو دور کرنے کے لئے میں نے
 ایک انگریزی ماں اہل کار کے توسط سے اس سارے ہنگامے کی کیفیت ڈھائیڑ سے

دربانت کی قمر سلوم ہوا کہ سائیکل دے اور پیدل راہ گیر کے دریاں جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس جس شخص کے کان میں اس بحث کی آواز پڑی وہ بھی اس میں شریک ہو گیا۔ جتنے کہ دو فریق بن گئے۔ ایک سائیکل سوار کی حمایت میں جھگڑا ہوا تھا۔ دوسرا پیدل شخص کا حامی تھا۔ ڈائریہ سے بھی رہا نہ گیا۔ وہ گاڑی کو چھوڑ کر اس بحث میں شامل ہو گیا۔ یہ ادا مجھے خاص پاکستانی نظرائی اور اس احساس سے مبرا دل بہت افسردہ ہوا کہ میں نے اطالوی زبان نہ سیکھی تھی۔ وہ دن میں بھی اس بحث میں ایک ذایک فریق کی طرف سے اسی شد و مد سے شریک ہوتا جس سے میرے اکثر ہم وطن ایسے جھگڑوں کو اپنا پسہ کہتے ہیں۔

یہ بھی اسی دن کا واقعہ ہے جب میں چند گھنٹوں کے لئے کھپلی مرتبہ روم کے ہوائی اڈے پر روک گیا تھا۔ وقت کاٹنے کے لئے زوقی، اشفاق احمد اور جی آئی اے کے قہوہ خانے میں کافی پینے کے لئے جا بیٹھے تھے۔ اس قہوہ خانہ کی صفائی اور پاکیزگی کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ اسے کس قدر مصفا کر رکھا گیا ہے۔ اور اس کی صفائی کو برقرار رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ لیکن جیسے ہی قہوے کی پیالیاں ہماری میز پر رکھی گئیں۔ قہوہ خانہ کی صفائی اور پاکیزگی کے باوجود بھنبھنائی ہوئی کھینچوں کے ایک طرف خاک لٹکے ہم پر لٹا کر دی۔ نہ مانے یہ لکھیاں کہاں سے ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اس جانی پہچانی چیز کو دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا میں اس وقت روم کے قہوہ خانہ میں نہیں بلکہ دارلینڈی کے راجہ بانٹا

کی کسی دوکان پر کھڑا کھڑیاں خرید رہا ہوں۔

وقت کا تھوڑا دیر میں بھی وہی ہے۔ جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک دولت خدا و پاکستان میں ہے۔ اگر کسی تقریب یا ملاقات کیلئے کیا رہنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ تو یہ تقریب یا ملاقات ایک بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتی۔ اگر آپ کو کسی دعوت میں چھ بجے شام کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ تو آپ کی شرکت سے بھی توقع کی جائے گی۔ کہ آپ جملے مافسوں کی طرح خود ہی آٹھ بجے سے پہلے ماحضہ سے علیک علیک کرنے سے احتراز کریں۔ یہ خاص پاکستانی عوامی عروج کے لئے بہتر ذرا مکی۔ سفر پر روانہ ہونے سے قبل لاہور میں ایک دوست نے مجھے اور میری بیوی کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا۔ ہم اس خیال سے کہ کھانے کی دعوت پر شیک وقت کی یہاں پہنچنے کی تاخیر سے جانا پڑے۔ کوئی سراسر آٹھ بجے کے قریب ان کے جنگلے پر پہنچے۔ سارا گھر تاشے میں پٹا کسی ٹھری فینڈ میں مدبوش پڑا تھا۔ باہر کے کی جتنی کے سوا گھر میں ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ آخر کے لوگ ترکیب و کر چاکر بھی غائب نہ تھے۔ پہلے تو ہمیں شبہ گذرا کہ شاید ہم غلط مکان میں گئے ہیں لیکن باہر جا کر میں نے اس امر کی نشانی کر لی کہ گھر کا نمبر وہی ہے۔ جہاں ہم مدعو ہیں۔ مگر پڑا ہی یہ گمان گذرا کہ شاید دعوت نامے پر ہم نے تاریخ کو غلط پڑھا ہے۔ یہ وہم بھی غلط ثابت ہوا۔ ناچار میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ تانے میں کو اثر پٹنے کی آواز شاید محلے کے بر گھر میں

گرنج گئی لیکن سر نہیں ہونے تو ہمارے سیزبان میں نے پھر دستک دی۔ اور اب کچے
 کوششیں بیکار نہ گئیں۔ اور ایک خوشخوار قسم کے کتے کی خرقا کو خراست سنائی دی جب
 نے ہم دونوں کا زہرہ آب آب کر دیا۔ پہلے ترجم نے دہاں سے جاگ جانے کی سوچی
 لیکن پھر اندر کے کمروں میں روشنیاں برتنے لگیں۔ مکان میں ایک سخت زندگی کے آثار
 دکھائی دینے لگے۔ اور آخر کسی کے اندر سے باہر کی طرف آتے ہوئے قدموں کی بھاری
 چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ اُس نے دائرے صاحب کے دہیز ہی میں سے ہماری جانب
 حیرت و مستجاب سے دیکھتے ہوئے پوچھا: فرمائیے۔ میں نے ہی کڑا کر کے جواب دیا
 مسات کہنے کا۔ مگر ہوا خیال تھا۔ آج شام میں یہاں شیخ صاحب نے کھانے پر بلا
 رکھا ہے۔ اہان صاحب کے متھے پر حیرت کی ٹلکٹیں اور مچھرائیں۔ کچھ خفگی کے سے انداز میں
 بڑے: گردہ تراٹھ بے کے لئے ہے۔ میں نے گڑی دیکھتے ہوئے کہا: اس وقت
 پونے نو بج چاہتے ہیں؟ وہ صاحب جھنجھلا اٹھے کہنے لگے: ٹھیک ہے لیکن یہ میں
 آج ہی سنا کہ اٹھ بجے سے مراد اٹھ ہی بجے ہوتی ہے۔ بہ حال تشریف لائیے۔ شیخ
 صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ آدھ پون گھنٹے میں آجائیں گے۔ یکم صاحب فدا ہر آخری کو گئی
 ہیں۔ ساڑھے نو بجے تک وہ بھی آجائیں گی۔ میں بھی اسے میں غسل کروں۔ آپ جب
 تک ان مسائل سے جی بہلائیے؟

جب مجھے اطلاوی ریڈیو کی طرف سے گیارہ بجے کے نئے دعوت نامہ موصول
 بہتر اشفاق احمد نے مجھے یہ کھانا ضروری بنانا۔ کہ اٹلی میں وقت کی پابندی تیزی خیال

کی جاتی ہے۔ اس لئے مجھے گیارہ بجے کی بجائے بارہ بجے سیکرٹری جنرل کے اہل جانا چاہئے۔ میں نے ریشورہ قبیلہ کی کیا بلکین اشفاق کے چلے جانے کے بعد اس مشورے میں مجھے کچھ مبالغہ آمیزی کا شبہ گذرا۔ پھر جی میں نے دانستے آدھ گھنٹے کی تاخیر کر دی اور کوئی ساڑھے گیارہ کے قریب اٹھادی ریڈیو کے صدر دفتر میں پہنچا۔ اس کے بعد دفتر میں میری پیشوائی کے لئے کوئی شخص خاص طور پر مامور نہیں تھا۔ یہ مجلس اور مجلسوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ لیکن شام کو جب اشفاق احمد نے تودہ بہت خفا ہونے کو میں نے اسی کے مشورے پر عمل نہ کر کے سارے کئے کرانے پر پانی پھیر دیا کیونکہ میرے غیر مقدم کے لئے اشفاق احمد کی سامی سے ریڈیو کے ارباب اقتدار نے ایک معقول پروگرام مرتب کر رکھا تھا جس کے لئے بارہ بجے کا وقت مقرر تھا لیکن میں اس وقت سے آدھ گھنٹہ قبل دفتر میں پہنچ گیا۔ جس سے یہ طے شدہ پروگرام منسوخ کر کے جلدی میں جو کچھ ممکن تھا۔ ریڈیو کے ارباب کو اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

ہماری طرح روم کے باشندوں کو سڑکوں کا سیر ساما اور سڑکیں پر قبضہ بہت پسند ہے۔ انہیں خدا سا بہا بذیل چلنے۔ تو گھر کا ساما سامان سڑک پر گھسیٹ لاتے ہیں کہ یاں کھانے کی میز۔ برتن دھونے کا ٹب تو کھڑی مقامات پر مستقل طور پر شرک کی عزت بنے رہتے ہیں۔ سڑکوں سے رہنوں کو کچھ ایسا افس ہے کہ کھانا سڑک پر پکاتا ہے اور سڑک پر کھا یا جاتا ہے۔ کچھ سڑک پر دھلتے ہیں۔ سینے پر دھونے کے مشغفے کی تعمیل سڑک پر کی جاتی ہے۔ مگر جی بھی سڑک پر بیٹھا ہے۔ لڑھکی میں اپنے اوزار لے کر سڑک ہی پر اپنے

کاروبار کو فروغ دیتا ہے۔ جہاں جی سڑکوں ہی پر خط بناتے ہیں۔ گرمی کے ایام میں تواب بھی یوں برتا ہے کہ جہالت کی معقول دوکانوں کے ملازمین گاہکوں کی کرسیاں کھینچ کر سڑک پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چلتی چرتی دنیا کے دوہرا اپنے اُسٹرے کے کلمات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہمارے خالص مہاجر دوکانداروں کی ایک فہرست روم کے دوکانداروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہاں بھی کوئی سودا بحث کے بغیر طے نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ہاں اکثر دوکانداروں کو اپنے مال کی اصلی قیمت کا پتہ نہیں۔ دس کا مال پانچ میں دیدیں گے۔ پانچ کی بجائے دس کا مطالبہ کریں گے۔ روم کے دوکان دار دس کے مال کو سو پر بیچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر دوکانوں میں مقررہ دام کے الفاظ لکھے ہیں۔ لیکن دوکاندار گاہک سے یہی توقع رکھتا ہے۔ کہ دام چکانے میں بحث مزید ہونی چاہئے۔ اور اگر ممکن ہو تو خوب ہونی چاہئے۔ جنس اوقات ایک دوکانے کے لئے ایک ایک گھنٹہ بحث ہوتی ہے اور سخت کلامی تک کی قربت آجاتی ہے۔

روم کے محلوں میں ایک اور منظر یہاں بعض شوروں کے قدیم طرز پر ہافش کا رنگ دکھاتا ہے۔ یہاں بھی اونچی عریضیوں کی کھڑکیوں میں سے رسی سے بندھی ہوئی ٹوکرے بانڈا میں تھاری جاتی ہے۔ ٹیپٹو دے سے سودا خریدا جاتا ہے۔ اور پھر ٹوکرے درہر کی صوف بستریوں میں رکھ دیے جاتی ہے۔

مگر روم میں جس چیز نے مجھے سودا پر متاثر کیا وہ وہاں کے خوارے تھے۔

شہر میں بسیریں قسم کے قرارے جا بجا نظر آتے ہیں۔ کوئی گلی کوئی بازار جسے کہ کوئی پرانا مکان شاید ایسا نہ ہو گا۔ جہاں ایک نہ ایک قرارہ اس کے حسن کو دوبارہ لانے میں دل است مصروف نہ ہو۔ ان قراروں نے روم کے حسن کو وہی دلکشی دے رکھی ہے۔ جو ہمارے منظر شنساہوں کے بانعات میں شہروں کے اندر غراؤں کی ترتیب سے پیدا نہا کرتی تھی۔ پانی کے صحیح استعمال کا جو ذوق رومنوں اور یونانوں کو قدرت نے بخشا تھا۔ دنیا آج اس سے کبیر تہی نظر آتی ہے۔ یونانوں کو پانی سے کچھ ایسی محبت تھی۔ کہ وہ اپنا شہر ہمیشہ دریا کے کنارے بساتے اپنے قلعوں کی حفاظت کے لئے دریاؤں سے مدد چیتے۔ اور پھر انہی دریاؤں کو کھانکے پانی کی خبریں۔ پھروں کے قناتوں اور ہریاؤں کے فطروں میں کچھ اس طرح کبیر دیتے کہ بلخ میں فروس کی سی کیفیت آجاتی۔ مغلیہ بانعات میں آج ان کے اپنے باغیچوں کے ٹکڑے جوئے پھروں کے پورے اور پھلوں کے درخت ہمیشہ کے لئے مٹ چکے ہیں۔ لیکن اگر اب بھی ان کے بانعات کا حسن قائم ہے۔ تو اس کی وجہ ان کے ہاتھ کی کاٹی ہوئی خبریں ان کے گارڈے ہونے قرارے۔ ان کے تعمیر کئے ہوئے آبشار ہیں۔ جیسے کچھ تاجروں اور حکمرانوں کے قرارے چھینے جانے ہیں تو اس کے حسن میں خاصی کمی واقع ہو جاتے۔ ان قراروں کا کمال یہ ہے کہ ان کا پانی پرشیدہ اور ناصلازم شہروں سے دریاؤں میں نالیوں اور سوتوں کے ذریعے انسانی مدد اور تیار کے بغیر خود بخود کہیں سے آتا ہے۔ یہ چشمے اور ماہی کے سوتے روم میں شنساہوں نے ڈھونڈے تھے۔ آج ان کو مرے صدیاں گز گئیں ان کی بنائی ہوئی عمارتیں ان کی تہذیب ان کی زبان سب کچھ مٹ گیا ہے لیکن روم

کو جیسے ہوئے یہ قحطی دو ہزار سال کی عمر کو پہنچ کر بھی روزِ ناول کی طرح جوان اور توانا ہیں۔
 تریوی کے چوک کے ایک کونے میں نقش و نگار سے مزین ایک دیوار ہے جس کی
 اونچی ممبر کے نیچے پنہون دینا کا مجسمہ ہے جس کے ادا میں مندر و گھوڑوں کی نگاہیں
 ہیں۔ ان گھوڑوں کے اوگر و پتھروں کے ڈھیر میں سے کئی فارسے چھوٹے ہیں۔ جن
 کا پانی اچھلتا سر پھوٹتا گاتا چکاتا ایک قلعے سے دوسرے قلعے میں جاتا اس مرض میں
 جمع ہو جاتا ہے جو بذاتِ خود ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دیتا ہے۔

میں نے تریوی کا دلکش فوارہ دات کو ایسے وقت میں دیکھا۔ جب سلاواکار
 عزیز ہنس رہا تھا۔ اور اس کے کنارے کھڑے ہو کر اس کے اچلتے ہوئے پانیوں اور اڑتے
 ہوئے گھٹ کے حسن کا لطف اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن اس کو اس قدر افسوس کہ میری آمد کے
 یادگار کے طور پر مجھ یہاں اپنی تصویر ضرور ترعائیں گے۔ اسلم نوٹو گرانز کی تلاش میں نکلے
 اور عائشہ اس تیز بارش میں کھڑے کھڑے روم کے دروں کے اس اعتماد کا ذکر کرنے
 لگیں جس کی رو سے تریوی کے فارسے کے تالاب میں نقدی کھینکے والا روم سے
 جا کر پھر واپس آ جاتا ہے۔

مجھے اس اعتماد پر کچھ سنسی سی آئی۔ میں نے قاہرہ میں بھی سنا تھا کہ جو شخص ایک
 مرتبہ نیل کا پانی پی لیتا ہے۔ وہ مصر میں دوبارہ ضرور آتا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ بعض اہم
 انسان اپنی آمد و آمد سرت کی تکمیل کے لئے کیسے کیسے سارے ڈھونڈتا ہے۔ اور
 اس کا غرض مند دل حصولِ مقصد کے لئے کیسے بُت تراشتا ہے۔ چند ماحول میں

اسلم ناکام واپس آ گئے۔ اور ہم مایوس ہو کر گھر کی طرف لوٹے لیکن ابھی ہماری کارمشکل
 دس گز ہی گئی ہوگی کہ میں نے اُسے کسی غیر اداوی جذبے کے ماتحت رکھا دیا۔ اور پھر
 اسلم سے پوچھا: تمہارے پاس کوئی اٹھاری سکہ ہے؟ اسلم نے تعجب کے عالم میں میری
 طرف دیکھا اور پھر سکہ اگر میرے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دس دس میرے کے دو تین سکتے تھا
 دئے۔ میں کار سے اترا اور شرابہ کر دینے والی بارش کے تختہ پلٹے کھاتا تریوی کے
 کنارے جا پہنچا۔ سامنے فیچوچون کا مجھسا اور اس کے نیم غراب گھوڑوں کے بُت فوارے
 کی اڑتی ہوئی کُف اور برستے ہوئے پانی سے گویا سرگرم پکارتے تھے۔ دیوں دکھائی دیتا تھا
 جیسے یہ گھوڑے تریوی کے فوارے سے لڑتے بھڑتے فیچوچون کو لے کر کہیں دور نکل جانا
 چاہتے ہیں۔

بارش کا پانی میری مٹھی میں پکڑے ہوئے سکوت تک پہنچ گیا تھا میں نے مٹھی بلند
 کی اور سکتے پانی میں جھیک دئے۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا لیکن جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ
 دیر اور بیس ٹھہرا ہوں لیکن اسلم کی کار کے انجن کی آواز مجھے یاد دلا رہی تھی۔ کہ وہ میری
 واپسی کے فطر ہیں۔ لوٹنے سے پہلے میں نے آخری مرتبہ فیچوچون کے چہرے کی طرف
 حسرت سے دیکھا۔ مجھے تے کے بوٹ مجھے کچھ تھر تھرانے ہوئے نظر آئے۔ دیوں دکھائی دیا
 گویا فیچوچون کا بُت زیر ب ہنس رہا ہے۔ اور میں بارش کے تیز پانی میں جھلیکا آج واپس
 اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

آج سوچتا ہوں تو اس واقعہ کی ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن میرا دل مجھے بتا رہا

ہے کہ بچپن کی کلاست میں میرا عقاوب تک کم نہیں ہوا میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں
 کہ ان سیکڑوں کی برکت سے اس عینے میں تو اگلے عینے میں منور رہی ورم میں پہنچ
 جاؤں گا

برسپیل لندن

مارچ کی پچیس تاریخ ہے۔

میں لندن سے چودہ میل باہر ہیتھ روکے ہوئی بندر پر اس لباس میں اپنے سامان کو لے کر تاجروں کی دکانوں میں جا رہی ہوں۔ جو مجھے لندن سے پیرس کی طرف لے جانے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ اب سے کوئی ایک گھنٹہ قبل میں کیننگٹن ہائی سٹریٹ کے ہوئی اسٹیشن پر ان دوستوں سے ملنے کے لئے جا رہی ہوں جن کے ساتھ رخصت ہونا تھا۔ جن کے ہمراہ میں نے لندن کے قیام کا اکثر وقت بسر کیا تھا۔ اور جو موسم کی خرابی اور وقت کی ناموزونیت کے باوجود مجھے ان لوگوں کے لئے ہوئی اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔

میرے لئے لندن سے لاہور کی طرف روانہ ہونے کا یہ دوسرا موقع ہے اور میں مجرم کے طور پر روانہ ہوں۔ بے پرواہی اور روم کی عمارت کے ایک کونے میں تنہا کھڑا ہونے کا یہ موقع ہے۔ ہاتھوں سے باہر کی اشیاء کو دیکھنے

کی بے کار کوشش میں سرور ہوں تصور میں گزرے ہوئے زمانے کی تصویریں تیزی سے ابھرتی اور جیتی جلی جا رہی ہیں۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ سفر کے اس آخری مرحلے پر آج میرے دل کی کیفیت پہلے کی نسبت اس قدر مختلف کیوں ہے پچھلے مرتبہ میں جب ایسے ہی سفر پر لندن سے روانہ ہوا تھا تو وطن کی طرف لوٹنے کے احساس سے میرا دل فرط سست سے جھوم رہا تھا لیکن آج جب کہ میں ایک مرتبہ پھر لندن سے لاہور کی طرف بخصت ہو رہا ہوں تو وہ وہاں کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ گویا میرا دل کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔

مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے گویا ایروڈروم کی قبر میں دیواروں سے آگے وسیع و عریض سنگی فرش پر بارش کے پانی کی تہ سرسراہٹ ہوئی ہو کہ تیز بھونکنے کے سانے لرز لرز کر گھٹ آؤد ہوئے لگی ہے ہیتھرو کے ایروڈروم کا نامک بارش میں ڈوب کر یوں نکلنے لگا ہے۔ گویا یہ دو بار انگلستان کے سیاہ پانی کا وہی خوفناک حشر ہے جس کی پھری ہوئی لمبوں پر میرا جہاز میرے پہلے سفر لندن کی اس طوفانی رات میں ساحل فرانس کی تہیوں کو پیچھے چھوڑ کر بلوئن کی بندرگاہ سے فرسٹن کی بندرگاہ کی طرف اپنے آپ کو دھیرے دھیرے گھسیٹ رہا تھا۔

اور میں یاد کر رہا ہوں کہ وہ رات کس قدر خوفناک تھی — میں شام کے چھ بجے اور نیٹ ایکسپریس پر پیرس سے بلوئن پہنچا تھا۔ اور اس خیال سے بہت خوش تھا کہ اب سے چند گھنٹے بعد جب میں لندن میں قدم رکھوں گا تو وہ طویل سفر جو تین جہتے

قبل لاہور میں آغا پذیر ہوا تھا۔ اپنے خاتمے کو پہنچ جانے لگا۔ مگر جیسے ہی گاڑی اپنی آخری منزل پر رُکی اور میں بدین کے سب سائل و مدد کے شیش پر آواز مند مکی لٹ سے آنے والی برنائی ہوا کے تند و تیز جھکڑو شور مچاتے بیٹیاں بجاتے کشتیوں اور جہازوں کو بے مددی سے منہ بھر ڈرتے میرے من پر تھپڑوں کی طرح یوں برسے کہ میرا جوش کچھ سرد سا ہونے لگا۔ پھر جب اوائلی نومبر کی اس کپکپاتی ہوئی حالت کی خوفناک تاریکی میں بندرگاہ کی مدھم روشنیوں کے سارے میں جہاز کی جھکڑے کھاتی ہوئی سیرجی پر سے گذر کر سما ہوا عرشہ جہاز پر پہنچا۔ اور ایک الگ تنگ کونے میں جا کر ایک بچے پر بیٹھ گیا تو دل کا دلو کہ کچھ بکھو سا گیا تھا۔

جہاز کو رٹانہ ہونے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ اور بدین کی تباہ ابھی نذر سے اوجھل نہ ہوئی تھیں کہ طوفانِ باد و باران نے اس پر عرشے اور کپکپی کی ایک ایسی مستقل کیفیت طاری کر دی کہ منہ زور لوہروں کے ماسنے یہ بالکل بے بس دکھائی دینے لگا۔ پھر سے ہونے مند سے اس ڈر کو پانی کی گہری چادریں برطوت سے اس پر گہری تھیں اور سنسناتی ہوئی جہاز گاہ کی طرح اسے اندر سے اندر دھکیل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا آج کا سفر شاید خیریت سے ختم نہ ہوگا۔

میرے لئے سمندری طوفان کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس سے چند برس پیشتر میں ایک ایسے خوفناک بحری سفر کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ جس کی بادشاہِ بدین تک دل سے محض ہونگی۔ اگست کے دن تھے۔ بہادر جہاز دنگون سے سنگاپور کے سفر پر غلیجِ بنگال

کے وسطی حصے میں سے گذر رہا تھا کہ اچانک شام کے وقت تیز ہوا چلنے لگی۔ ہرن سون کا زمانہ تھا۔ بادلوں کی آواز اور ہوا کی تندہی کوئی غیر متوقع چیز نہ تھی۔ لیکن جب غٹوں میں ہوائے آندھی کی صورت اختیار کر گئی۔ اور بادلوں میں سے رعد کی گڑگڑاہٹ کی چمک ہر لمحہ بڑھنے لگی۔ اور جہاز کا حملہ اور حرارہ پریشانی میں دوڑتا ہوا نظر آنے لگا تو مسافروں کے سینے پر اندازہ لگانا مشکل نہ رہا کہ معاملہ دیگر گوں سے بخیر و بدی میں برطرف کھٹا ٹپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہوا، بارش، چمک اور گڑگڑاہٹ ان سب کے مل کر یہ ثابت کرنا کہ عناصر قدرت ایک دوسرے سے ہر سر پرکار ہیں۔ جس معرکہ کا رونا دہیں ہمارا جہاز گویا ان سب کے بیچ میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ پھر ایک طوفان نے مذاب کی صورت اختیار کر لی۔ سمندر کی لہریں سیاہ پہاڑوں کی طرح جہاز سے ٹکرائے لگیں۔ پانی کبھی اسے اپنے شانے پر لا کر آسمان کی طرف اچھال دیتا۔ اور کبھی یوں محسوس ہوتا گویا ہم ہمیشہ کے لئے پانی میں چلے گئے ہیں۔ اور پھر جہاز کی تباہی اٹل ہو گئیں۔ اندھیرے میں سب سے ہونے مسافروں کے پاگندہ حواس جہاز کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ایک ایسا شور و پاؤں اٹھا گویا کسی گہرے ہوئے جہنم پر غریبوں کا زور و زور ٹپ رہا ہے۔ ایک طوفان اندھیرے میں ایک سیال دیوار مجھ سے ٹکرائی۔ میں لڑھکتا اور ٹپٹپیاں کھاتا کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ جھینگے ہوئے کپڑوں کو دھکتی ہوئی آنکھوں اور کمرے سے منہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ سمندر کی لہریں نے اب اوپر کے عرشے پر قبضہ جمایا ہے۔ اور یہاں پر ٹھہرتے ہوئے مسافر بس کچھ دیر ہی کبھی وہاں ہیں۔ دفعتاً کسی کی جھمکاؤں اور ڈھنڈھوں کی آواز کے بے پناہ شور کے اوپر سے تیری

ہوتی یہ کتنی حسانی دہی کہ سب مسافر فرمائیے چلے جائیں۔ اور پھر طوفانی رات کی مصیب
تاریکی، باد و باران کی تندہی، لہروں کی خوں آشامی اور ٹڑپتے ہوئے جہاز کی پرخطرہ
جے تھری سے بے پروا ہو کر مسافروں کا صبح کو نعتی ہوتی بھلی کے سہارے سیر صوبہ
سے یوں نیچے لٹکھنے لگا۔ گریا انسانی جسم دہے کے بہت تھے جنہیں کسی متناطیس نے
اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

جب میں بس بے قابو رہیے میں الجھ کر نیچے گرا ہوں تو مردوں کے شور و غوغا اور
عورتوں اور بچوں کی مچھ دیکار سے ملی ہوتی کچھ عجیب و غریب آوازیں تڑپ تڑپ کر
میرے کان میں انسان کی خوشحال اعتقادی کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ مختلف مذاہب
اور معتقادات کے اس رنگارنگ مجمع کو طوفان نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کے
شریکِ حال کر دیا تھا کہ وہ اس سماجی دشمن سے خلا صی پلے کئے اپنی اپنی باؤل
میں دعاؤں اور نیتوں، ورد اور وظائف سے ایک جنگام برپا کئے ہوئے تھے بیڑی
عیسائی، بدھ، مسلم، ہندو اور دوسرے مذاہب کے مختلف پیرو۔ ایک وقت اپنے خداؤں
اپنے اپنے دیوتاؤں کو پکار پکار کر اپنے مصائب کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ایک ہی
وقت میں ان دیکھے خدا اور عجبتے دے اینٹ تھروں کے نام کی دوائی یوں مل رہی
تھی۔ گویا ایک بین الاقوامی مذہب وجود میں آ گیا ہے۔ اور سلوم ہوتا تھا ہلے جہاز
کی وسیع و عریض منزل ایک ایسا بین الہی عبادت خانہ ہے جس کے کھدو دے ہر
ایمان و اعتقاد کے آدمی کے لئے ایک سے کھلے ہیں لیکن جب درمیان میں کو طوفان

محم ہانے پر مندر کے منہ سے جھاگ کی تہ باریک ہو گئی۔ اور مات کے مردوں کو سپرد آب کرنے کے لئے ان کی قہیں عرشہ جہاز پر لا کر رکھی گئیں۔ قورات کے ساتھی پھر اپنے اپنے گروہوں اور جہازوں میں بٹ کر اپنے اپنے جہازوں کے سرانے یوں جا کھڑے ہوئے گویا دوسرے کے ایمان و ایمان سے انہیں گھن سی آ رہی ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے کہ برطانوی شہر کے بھاری دہل نے جہیں ساحل انگلستان کی آہکی غش آئندہ فیدوی میں نے وہیں نیچ پر سے سامنے کھڑے پورٹ ہول پر سراونچا کر کے نظر دوڑائی۔ سامنے فرکشن کی بند لگا دی روشنیاں اور پنیے چکولے کھا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک اور طوفان پھٹل گیا ہے۔ جب آدھ گھنٹے کے بعد میں لندن کی ٹرین میں سوار ہوا تو عبری سفر کی صورت نے اعضاء کو کچھ اس طرح سکند اور طبیعت کو کچھ ایسا پروردہ کر رکھا تھا کہ میں اپنی جگہ پر ہاتھ ہی یوں جمیٹ گیا۔ گویا ہفتوں کا مرضی ہوں۔

نصف شب کے بعد ٹرین ہاٹن کے سٹیشن پر رکی۔ اور میں اپنا مختصر سامان اٹھا کر پیٹ نام پر آتا مسافروں کو لینے کے لئے ان کے اصحاب اور رشتے دار پڑت جھپٹے سکراتے پھر رہے تھے۔ خوشی اور سرت کے کلمات اور قہقہوں کی گونج سے سٹیشن چمک رہا تھا۔ باس منکر کو دیکھ کر وہ پہلا احساس جس نے مجھے حدودِ جبرائیلہ کو دیا تھا وہی اہ غریب الوطنی کا تھا۔ اسی لاکھ ہائندوں کی دنیا میں جسے لندن کہتے ہیں۔ ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جسے نام یا صورت سے میں جانتا تھا۔

ٹیکسی میں جو محل کی طرف چلا تو موسم بدستور خراب تھا۔ بادش پریس سے کچھ
 اس طرح ساتھ ساتھ چلی تھی۔ کہ اب تک ساتھ تھی۔ ٹیکسی کے اندر سے جیتے ہوئے
 درختوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ تیز ہوا چل رہی تھی۔ کار کی روشنی کے سامنے بادش
 کا پانی ریشمی جھار کی طرح آسمان سے زمین پر متعلق نظر آ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ گلابی
 جازے کے اس سس میں لاہور کتنا حسین ہوتا ہے۔ شام کے وقت اس کے بازار
 اور گلیاں، باغات اور پارک کس قدر زندہ اور جاندار ہوتے ہیں۔ وطن کا خیال آتے
 ہی میرے کانوں میں مجید روزہ کے پل پر پنجابی بیت بازی دودھ کی دو کانوں پر
 بے نگرہوں کی خوش گلیاں۔ گنڈیری اور ریوڑی فروشوں کی خوش آئند صدائیں، تانگے
 والوں کے مخصوص نعرے گونجنے لگے۔ اور دل اس پُر ہل نگر میں ڈوب گیا۔ کہ آئندہ
 پانچ سال کا طویل عرصہ میں اسی لاکھ انسانوں کی اس پنجابی آبادی کے بھیا تک دریانے
 میں کس طرح بسر کر سکوں گا۔

کمرے میں سامان لکڑی کے مڑل کے لازم نے پوچھا: صبح کی پائے آپ کس وقت
 مینا چاہیں گے؟

میرا وہ بیان گھر کے معمول کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہا: ساڑھے چھ بجے پائے دل
 جاتے تو ٹھیک ہے۔ لازم نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا۔ پھر حیرت سے
 بولا: ساڑھے چھ بجے؟

میں جی میں کچھ کھسیا سا رہی۔ شاید لندن میں مجھے اس سے بھی سویرے اٹھنا پڑا

میں سرچنے لگا نئی دنیا میں اگر زندگی کو نئے اصولوں پر ڈھالنا ہی تھا تو روزِ اول ہی اس کا آغاز کیوں نہ کر دیا جائے۔ میں نے کہا: میرا مطلب ہے چھوٹے؟

علازمہ کچھ بے طرح ہٹھکا اور مزید تعجب کے ساتھ بولا: چھوٹے؟ اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اسی حیرت و استعجاب کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

صبح ٹھیک چھ بجے جب کمرے میں چائے آئی تو مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ راتِ لازم میری فرمائش پر اس قدر تیز کیوں تھا۔ یوں کہنے کو صبح کے چھ بج چکے تھے لیکن لندن میں رات جوں کی توں موجود تھی۔ اور شہر کے جنگلے صحنیں ابھی چند گھنٹے قبل میں نے نصف شب میں اپنے پورے جوہن پر دکھایا تھا۔ اس وقت تھک ہار کر گری نیند میں مدہوش پڑے تھے۔ ایک ہیبت ناک سناٹا مہرط مچایا ہوا تھا جس کے سکون کو کبھی کبھی بادش کے پانی کو چیرتی ہوئی کوئی اکا دکا ٹیکسی چند لمحوں کے لئے بہاد کر مٹے کی کوشش کرتی۔ لیکن سوا دشب سے لپٹا ہوا سناٹا لندن کے گلی کوچوں کو پھر اپنی آغوش میں سے لیتا۔

میں پیالی میں چائے اڈھلینے کے بعد دودھ کی طرت ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ پانک روشندان کے راستے کسی فنے کی ایک خوش آئند صدا میرے کان میں آئی۔ اپنے استعجاب کو رفع کرنے کے لئے کان لگا کر سننے لگا۔ کہ یہ آواز اتنی صبح سویرے کہاں سے آ رہی تھی۔ اور ایسے شہر میں اس کا وجود کیسے ممکن تھا۔ جہاں کے لوگ دوسروں کے آہام میں ضل انداز ہونے کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ یہ نغمہ جو باطن کے تاروں میں سے

کسی مشاقِ مثنوی کے ہاتھوں یا تو مرگ کے پار مقابل کی عمارت میں سے آ رہا تھا۔ یا پھر ٹرل کی بلانی منزل سے نیچے اتر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس پر چھانے لگا۔ غالباً میری اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ سے مجھے معلوم ہو رہا تھا۔ کیسی ایسے پریشان حال انسان کی جانگنا زچہ نہیں ہیں۔ جس کا دل فم کے تیروں سے چلتی ہو چکا ہے۔ اور جو کسی قید سے نجات پانے کے لئے دیراروں سے ٹکرا رہا ہے۔ نہ جانے یہ فقر کب تک جاری رہا۔ لیکن جب یہ ہند ہوا تو سیراول کچھ ایسا افسردہ اور اداس ہو چکا تھا۔ کہ پھر لندن میں مجھے دلچسپی اور جاؤتیت کی کوئی چیز دمِ آخر تک نظر نہ آئی۔

لندن کے قیام کے پہلے بھٹتے ہی میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس شہر میں عطرنا میرے لئے عذاب کا تہودن ہو گا۔ مسلسل بارش، میز ہوائیں، اوسے بہن، وحند اور کڑواں سب میری طبیعت کو کچھ ایسا مکدر کیا کہ میں یاں سے بھاگ جانے کے لئے ہائے ڈھونڈنے لگا۔ شہر کے لوگ کچھ ایسے گم گم نظر آتے تھے۔ جیسے اُنہیں کسی سے کوئی سروکار کسی سے کوئی مہر دی نہ ہو۔

لندن پر نیمورسٹی کے سکول آف جیازم میں مجھے داخلہ مل چکا تھا۔ لیکن کلاس میں گونگے اور بہرے ساتھیوں سے کچھ ایسا خون مساتا تھا۔ کہ لیکچر کے دوران میں کئی مرتبہ مجھے اُٹھ کر بھاگ جانے کی ترغیب ہوتی۔ بہنوں گزر جانے پر بھی اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی ایسا جاننے والا پیدا نہ ہو سکا۔ جو میرا تونس دو مساز ہوتا جس کے مشورے اور جس کی رفاقت میرے گرتے ہوئے دل کو سنبھال سکتی۔ شہر کے گلی

کو چوں میں مجھے جیسے ہوئے انسانوں پر زندہ لاشوں کا گلگان ہوتا۔ اور اس کے بارہائی
 باقاروں کے توتل پر ایک ناقابل فہم افسردگی چھائی ہوئی نظر آتی۔ میں ان دنوں یہ جھٹک
 پارک سے کراہ دہلی رو رو پڑا تھا۔ میرا معمول یہ تھا کہ میں ناشتہ کر گئے سنے نیچے
 جانے سے قبل چوتھی منزل میں سے اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر شیشے میں سے
 باہر نچرل میٹری میوزیم کی عمارت کی چھت پر بہت کی بڑھی یا گھٹی ہوئی شے سے
 موسم کا حال جاننے کی کوشش کرتا۔ اور پھر نیچے سڑک پر نظر دوڑاتا جہاں شاہراہ
 پر تیز رفتار بسوں اور گاڑیوں کے پیسے پانی کے چھینٹوں کو ہوا میں اٹا کر مجھے خبردار
 کرتے کہ موسم بدستور سوہاں روح ہے اور رہے گا۔ پھر میری نگاہ سڑک کے دوڑے
 دھتوں پر جاتی جن کے تپوں سے کیسے تہی کاغذی ہوئی شاخیں اور لرزہ بر اندام تھے
 موسم خزاں کی تباہ کاری کی داستان سناتے اس وحشت ناک منظر کو دیکھ کر میرا دل
 بیٹھ بیٹھ جاتا۔ اور اس خیال سے میرا دل گھٹنے لگتا۔ کہ قید و بند کی یہ طویل صعوبت شاید
 ابھی گئی برس اور جاری رہے گی۔

اور پھر کمرس کا زمانہ آیا۔ یونیورسٹی میں تعطیلات ہوئیں۔ اور میں تبدیلی منظر کے
 لئے فرانس کے سفر پر چلا گیا۔ میرے ایک عزیز جنوبی فرانس کے ساحل پر نہیں میں کچھ
 عرصے کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کی رفاقت میں کینز ناٹھی کا لورڈ مائیکو اور نیس
 کی ہنگامہ پر اور دل فریب زندگی نے مجھے ہر سنے دل کو پھر سے زندہ کرنے کی سعی کا اہل
 مجھے کچھ عرصے کے لئے یوں محسوس ہونے لگا کہ گھر سے نکلنے میں میں نے کئی ایسی حاکمات

نہ کی تھی۔ لیکن جب ہالینڈ اور بلجیم کی سیاحت کے بعد میں جزیرے کے پہلے ہفتے میں لندن میں دوبارہ وارد ہوا۔ تو پھر وہی پرغانی موسم وہی چپ سا دھبہ ہونے لگا وہی احساس نضا و غنا و رک کے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اور میرا دل سنبھلتا سنبھلتا ہمیشہ کے لئے افسردہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہاں کے لوگوں اور یہاں کے موسم کو کس انداز سے اُن یا ہے۔ شہر کے لوگوں کے پہرے کچھ ایسے تھے جو نئے کچھ ایسے سپاٹ تھے کہ اُن پر جذبات کا کوئی نقشہ نظر نہ آتا تھا۔ یہاں کا موسم ہی کچھ ایسا بے کیفیت تھا کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ بارش کا یہ پانی کہاں سے آ رہا ہے۔ آسمان پر ابوی کی بجائے ایک دھواں سا ہر وقت محیط رہتا تھا۔ جس میں سے کبھی پانی چمکنے لگتا۔ کبھی اوسے برسے لگتے۔ کبھی ہٹ گئے لگتی۔ اور کبھی ایک محروم قسم کی دم روکنے والی دُھند نیچے اتر کر سلق میں اُٹک جاتی۔

آخر فردی کے اختتام پہلے وہ ٹرڈہ بانفزا پہنچ گیا۔ جس کے حصول کے لئے میں نے نومبر سے اب تک کئی مہینے کئے تھے۔ حالہ میرے پیہم خطوط سے تنگ آ کر مجھے اس امر کی اجازت دینے پر رضامند ہو گئے۔ کہ اگر میری صحت انگلستان کے موسم کو برداشت نہیں کر سکتی تو میں گٹروٹ آؤں۔ خط کے ساتھ واپسی کے لئے کاڈرنٹ دیکھ کر میرا دل نہیں آچھا مگر یا ہفتہ بلجیم کی دولت میرے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر ایک صحت میں لاہور کی رہسپیان، کالج کی محاسن، برسٹل کے جنگلے نظروں کے سامنے گھوم گئے میں ٹرڈٹ کو ہاتھ میں کپڑے لندن کے بازاروں اور گلیوں میں سترت کے نشے

میں پتھریوں بے پروائی سے پل رہا تھا گویا انہیں بازاروں اور گلیوں میں سیرا بہن گزرا ہے۔ اور پھر جب ایک مہنت کے بعد میں واپسی کے سفر کے لئے بحری جہاز میں اپنی جگہ مخصوص کر کے حاس ملک کے دفتر سے ہکے سٹریٹ میں نکلا تو لندن کے ہجوم اور ہنگامے مجھے پہلی مرتبہ ایک بالکل مختلف رنگ میں نظر آئے۔ اس دن پکا ڈلی کی گھاگھی ریجنٹ سٹریٹ کی رونق اور گلفورڈ سٹریٹ کا شرارت مند مجھے اپنے صحن اور دفتر ہی کی تمام جزئیات کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا بھلا معلوم ہوا کہ میں دہلی زبان سے یہ تسلیم کئے بغیر ضرور سکا کہ لاہور کا کھانا کبشتش جہات بھی اس شہر میں بھی کچھ کچھ اسی کا سا رنگ نظر آتا ہے۔

میں نے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ان پتھروں پر نظر ڈالی۔ جن کی ٹہنیاں شگوفوں اور پتھروں سے لدی ہوئی آمد بہار کا خریدہ دے رہی تھیں۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ لاہور کے باغات کے سخن ہے پایاں کا ہلکا سا پڑتہ بیاں بھی موجود تھا۔ اور جب میں نے بازاروں اور گلیوں میں چلتے ہوئے لوگوں کو ایک نظر پھر دیکھا تو وہ مجھے یوں دکھائی دیئے۔ گویا یہ بالکل ہی بے جان انسانوں کے انبرہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے چہروں پر بھی حیات کی اس رونق کا اتالی مثال نقشہ نظر آتا ہے جو برے ذہن کے لوگوں سے مخصوص ہے۔

اور پھر میں ایسے وقت میں جبکہ میں واپسی کے دن کے لئے ایک ایک لمحے کو گن رہا تھا۔ لاہور سے میرے استاد ڈاکٹر تاثیر کا عند ہوائی ڈاک سے موصول

جنا انہیں میرے گھر والوں سے یہ پتہ چلا تھا کہ میں تین چار ہفتوں میں لندن سے واپس لاہور پہنچنے والا تھا۔ اور ان کا یہ خط مجھے میرے اداوے سے باز رکھنے کی آخری کوشش تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ انہیں یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا ہے کہ میں لندن کے موسم اور نامساعد حالات سے گھبرا کر گھر کی طرف چلا گئے کی نگر کر رہا ہوں۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ میں اب اپنے پھپھن کے عہد کو ختم کرنے کی کوشش کروں۔ اور سمجھوں کہ لاہور واپس جا کر میں کس حرج و مرج کی نظروں میں نہ گزروں گا۔ میرے ساتھی کس قدر مجھ پر مضیں گئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میری طالب علمانہ زندگی کا اہم وقت یوں کس بے دردی سے برباد ہو جائے گا۔ انہوں نے آخر میں لکھا تھا کہ دو مہینے عزیزوں کو مشورہ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو مجھے فوراً لندن میں رک دیا جائے۔

مجھے اس خط کو دیکھ کر خوف سا آیا۔ کہ مبادا میرے گھر کے لوگ تاثیر کی باتوں میں آکر مجھے کہیں لندن ہی میں زندہ رک دیں۔ اور میں پھر اسی قید خانے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں۔ اور پول سے چلنے کے لئے ابھی میرے جہاز میں چار پانچ دن باقی تھے۔ چار پانچ دن اس شخص کے لئے خطرے کی بہت بڑی مدت تھے۔ جسے اس خط کے ساتھ ہی اپنے فرار کی راہ کے سد رو ہو جانے کا اچانک دھڑکا لگ گیا تھا۔ تاثیر کے اس خط سے اور خود تاثیر سے مجھے نفرت سی ہونے لگی۔ اور میں جلدی جلدی سوچنے لگا کہ مزید وقت کو ضائع کئے بغیر اب کس طرح تاثیر کے منصوبوں کو

غارت کروں میں نے فیصلہ کیا کہ پانچ دن بعد لوہ پل کے راستے روانہ ہونے کی بجائے
میں بکس روز بعد مارسیلز میں جہاؤ کو پکڑنے کے لئے آج ہی لندن سے فرانس کو چلا
جائوں گا۔

شام کو جب میں دکنورپہ سٹیشن پر ڈوور کی ٹرین میں سوار ہوا تو میرا دل گھبراہٹ
میں بے طرح اچھل رہا تھا۔ مجھے یہ خوف برا لگتا تھا کہ آخری لمحے میں ضرور
کوئی ایسی بات ہو جائے گی جس سے میری روانگی ٹوک جائے گی۔ اور میرے منصوبے
دعویٰ کے دھڑے رو جائیں گے۔ مدیہ ہے کہ جب ٹرین نے سٹی بجائی۔ ٹیم کا سفید
ہوا بادل بہتوں کو حرکت دے کر فضا میں بلند ہوا۔ اور میرا ڈوب میٹ فارم ہاپنی
جگہ سے آگے گھٹنے لگا تو بھی مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں لندن کو اس آسانی کے
ساتھ روانہ کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ جب گاڑی چلی۔ ادا کھڑکی میں سے مجھے
وہ لوگ نظر آئے جو دوست احباب کہ نصرت کرنے کے بعد ملتے ہوئی ٹرین میں سے
باہر چھپا کھٹنے والے مسافروں کو رومال اور ہاتھ دھو لٹکا کر لوٹا رہے تھے تو میں نے
خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اسی لاکھ باشندوں کی اس صیب آندہ وی میں میرا ایسا جاننے والا
کوئی نہ تھا جس سے تاثیر کو میرے اس سفر کا پتہ چل سکتا۔ تھوڑی دیر میں ٹرین کینٹ
کے اس پر فضا ملاتے میں سے گزرنے لگی جو صدیوں پہلے بھلا نری تاریخ کا تحلیل لعد
گہوارہ تھا۔ صبارنا۔ گاڑی پٹریوں کو کاٹتی لائنوں کو بدلنی۔ کھڑکھڑاتی جھینٹی چلتی
اس سرزمین کو گئے کہ یہی مٹی جس کے ہر خطے میں آج کل گذشتہ کی تاریخیں یادگار ہیں

شک تراشی اور عمارت سازی کے فائدہ کی صورت میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں میں ٹرین کی کھڑکی میں سے ان میدانوں پر آخری نظر دوڑا رہا تھا۔ جن پر کبھی روشنوں نے تو کبھی سیکسز نے کبھی ڈیزل نے تو کبھی ٹارنوں نے اپنی اپنی آمد سے انگلستان کی تاریخ کے ورق اور تھے اسٹ کے رکھ دئے تھے۔ جب گاڑی کلیپیج کے عظیم شان جنگل کو پوری رفتار میں پیچھے چھوڑنے کے بعد ڈلوچ کے اسٹیشن سے بھی آگے نکل گئی تو مجھے پہلی مرتبہ یہ یقین ہونے لگا کہ میں تاثیر کی دسترس سے خاصا باہر نکل چکا ہوں۔

اور وہ مارچ کے تیسرے ہفتے میں آج ہی کی طرح کی کوئی تاریخ تھی کہ میں رو دبا رکھ کر گزرنے والے برطانوی جہاز کے آہنی کھڑے پر چھکا ہوا۔ ڈوور کی سفید چٹانوں پر اپنی آخری نظریں دوڑا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ کیا واقعی یوں بھاگنے میں میں کسی بہت بڑی فطری کامرکب نہیں ہو رہا۔ مجھے والد کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ جہاں کبھی کبھی دوسروں کی سرزنش اور فحاش کے وقت کہا کرتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ دنیا میں ہر شخص کے جزا وہ بھیگی ہو یا بادشاہ، قدرت کی طرف سے ترقی اور مادی آسودگی کے لئے ایک سے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ ختام ازل نے ہر شخص کے لئے زندگی میں ایک نہ ایک موقع ایسا ضرور رکھا ہوتا ہے جس سے غامدہ احساں کے وہ اپنے مادی عروج کو پہنچ سکتا ہے بعض لوگ ان مواقع کی اہمیت کو بجانب ملتے ہیں۔ اور ان سے قطع اندوز ہونے میں انہیں کوئی وقت پیش نہیں آتی بلکہ اکثر

لوگ ان مواقع کو سمجھنے کی اہلیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بے وقوفی کے طفیل انہیں ہاتھ سے کھودیتے ہیں۔ اور زندگی کا باقی وقت زبرد مال میں گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر میرا دل ڈرنے لگا۔ میں جو لندن سے پانچ ماہ کے قیام کے بعد بے نیل و ملام وطن لوٹ رہا تھا۔ تو کیا یہ بھی کوئی ایسا سانحہ تو نہیں تھا کہ میں نے بھی اپنی حماقت کے ہاتھوں ایک بہت اچھے موقع کو ہمیشہ کے لئے تو نہیں کھودیا تھا؟ میں پانچ برس کے عرصے کے لئے لاہور سے لندن میں جبراً ملازم اور بازہ کے لئے آیا تھا۔ اگر میں اپنا وقت ابھی طرح بسر کرتا۔ اور تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد وطن میں منت کو زندگی کا شمار بنا سکتا تو شاید میرے لئے ایسا مقام پیدا ہو جاتا۔ جہاں پہنچنے کے بعد زندگی مالی اور معاشرتی ضروریات سے یکسر بے نیاز ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر دل نے کہا اگر محنت ہی شرط ہے تو لندن میں محنت کیا ضروری ہے۔ لاہور کے سکول کالجوں میں آخر کیا تباحث ہے جو لوگ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان میں سے کسے لوگوں نے بیگ مانگتے دیکھا ہے وطن میں جو لوگ آج کامیاب تصور مشقہ ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب لندن ہی سے پڑھ کر کوٹے تھے۔ اور پھر مجھے لندن کے لوگوں اور لندن کے موسم کا خیال آیا۔ لوگوں کے شے ہوئے چہرے اور ہنٹ اور پھند کے صیب نظارے میری آنکھوں میں بھرنے لگے۔ تو میں نے ڈر کر اپنی لگا میں ڈوور کی چٹانوں پر سے اٹھا کر دوسری جانب دو بار انگلستان کے نیلے پانیوں سے پرے فرائس کے امید پر و راہ المینان آفرین ساحل

ساحل کی طرف ڈواہیں۔ جہاں سے لاہور کے سفر کی اہل منزل کا آغاز ہوتا تھا۔
 چند منٹوں میں جہاز کا بھاری پہل سامنے کی چٹانوں اور گردیوں کی عمارتوں سے
 ٹکرایا۔ بیڑھی بیٹانے کی آواز بلند ہوئی۔ نیچے سے شبنوں کی گھڑ گھڑاہٹ نے عرشے کو
 تھپ تھپایا۔ ساتھ ہی جہاز کو جنبش برسنے لگی۔ کنارہ دھیرے دھیرے پیچھے کو ہٹنے لگا
 پانی میں بچکے لے کھاتی ہوئی کشتیاں لاکھ اور جہاز ہم سے دور ہو گئے۔ بائیں جانب
 سے لائٹ ہاؤس کا سفید مینار تیزی سے گھوم کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ اور پھر جب منڈی
 پرندوں کی چھپا ہٹ اور جنھیں بھی کم ہونیں تو میں نے مسرت سے اعزازہ لگایا۔ کہ
 میں انگلستان کے کنارے سے کئی میل دور تاثر اور والد کی گرفت سے باہر نکل آیا
 تھا۔

جہاز کے مرنے پر میں اب تک ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے مقابل اپنی کٹڑے
 پر مسرت کے ساتھ جھکا ہوا اور بھل ہوتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے نیچے
 جانے سے پہلے ایک آخری نظر مدد لگاؤ تک دوڑائی۔ ڈوور کا ساحل ٹامبلے کی کُھند
 کے پیچھے جا چکا تھا۔ اور پانی کے سوا اب کوئی چیز کہیں نظر نہ آتی تھی۔ میں نے
 اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا معلوم ہوتا تھا۔ ڈوور ساحل انگلستان کی طرف اُنت پر
 یہ الفاظ ابھرائے ہیں کہ۔

”الحمد للہ ندن سے جان چھوٹی۔“

مگر یہ بات کئی برس پہلے کی ہے۔

(۲)

جہاں میں ہتھوڑوں کے ہوائی بندر پر اس وقت اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا کھڑا ہوں۔ وہاں سے میری نگاہ عمارت کے اندر بہت دور تک جا سکتی ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے ارد گرد بالکل ریلوے سٹیشن کا سماں ہے۔ ہنستے ہوئے لوگ، افسردہ لوگ، مسرور لوگ، پریشان لوگ، دھڑ دھڑا ہوا ہے میں۔ دوست احباب مسافروں کو رخصت کر رہے ہیں، خوش آمدید کہہ رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری جگہ کھلٹ سے بھری گھبرائی ہوئی ماؤں اور متشکر مردوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ کس قدر لوگ کتنے دور دراز ملکوں سے کس طرح مسلسل اس شہر میں اپنی ذری ضرورتوں کے امتداد داخل ہو رہے ہیں۔ یا یہاں سے کام کے خاتمے پر واپس لوٹ رہے ہیں۔ اور اس حجم غفیر میں گھرا ہوا میں ان آوازوں کو سن رہا ہوں۔ جو ایر وڈوم کے لاؤڈ سپیکروں پر ہوائی جہازوں کی آمد اور روانگی کا پے در پے اعلان کر کے یہ بتلا رہی ہیں کہ ایک دنیا ہے جو لندن میں اٹھی چلی آرہی ہے۔ اور ایک عالم ہے۔ جو یہاں سے بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

خود میری روانگی میں بھی اب کچھ زیادہ وقت باقی نہیں رہ گیا۔ شاید مہینے ختم ہوں گے۔ یا آدھ گھنٹہ۔ مگر یہ چند لمحات جو لندن کی آخری رفاقت میں بسر کرنے کے لئے ہنوز میرے پاس ہیں۔ میں انہیں کسی اور شخصے میں بسر کرنے کی بجائے

خرمپنے قیام لندن ہی کی یاد میں سرت کرنے پر مجبور ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس مرتبہ کیاں کب اور کس طرح آیا تھا۔ ادب حکیم ایک بار پھر میں کیاں سے وطن کی طرف ہمیشہ کے لئے لوٹ رہا ہوں تو میں یہ جانتے پر مجبور ہوں کہ وہ کیا بات ہے جس نے مجھے یوں پڑمروہ سا کر رکھا ہے۔

میرے مانتھے میں اکثر بکے خاتے کی بارش سے بھیگی ہوئی اور سروی سے ٹھٹھری ہوئی وہ افسردہ تاریک رات اپنی تمام جزئیات سمیت اب تک محفوظ ہے۔ جس کی اداسی میں اسی ہتھوڑ کے ہوائی اٹھے پر میں آج سے ساڑھے پانچ بیسے قبل ایر فرانس کے ہمارے آ رہا تھا۔ لیکن اپنی اداسی کے باوجود لندن کی یہ نصف شب ان آٹھوں کے مقابلے میں جرمین سڑکی کا سوں کی وجہ سے میں نے کراچی سے لندن پہنچنے تک قاہرہ، اروم اور پیرس میں بسر کئے تھے۔ کچھ ایسی سوہان روح بھی نہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لندن میرے لئے قاہرہ، اروم اور پیرس کی طرح بالکل اجنبی نہ تھا۔ بلکہ جب میں نے ایر وڈروم کی بس سے کیننگٹن انی سٹریٹ کے برائی اسٹیشن پر اتار کر لندن میں قدم رکھا تھا تو پہلی چیز جس نے مجھے میری لندن سے قدیم آشنائی کی یاد دلائی تھی، نغمائیں مٹی ہوئی وہ مخصوص اور ناقابلِ تصریح باس تھی۔ جو بھینکی ہوئی سڑکوں کے خم اور نغمائیں چھائی ہوئی کمر اور وند کے ساتھ ڈیزل گاڑیوں کے دھڑکن اور ٹیکسٹریں اور ماتش دانوں کے دھڑکن کی آمیزش ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

برشمر کی ایک نہ ایک ایسی خصوصیت ہوتی ہے۔ جو نہ سرت اسے دوسروں

سے میز کرتی ہے۔ بلکہ یہی اس کی پہچان بن جاتی ہے مثلاً لاہور کی سب سے بڑی شخصیت یا انفرادیت و اشتہارات میں جن کی دبیز تہوں نے اس کے درودِ دیار کو ہمیشہ کے لئے بچھ پادیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر میری آنکھیں بند کر کے مجھے لاہور میں لایا جائے تو میں دیواروں پر چپاں کئے ہوئے یا سیاہی سے مستقلہ لکھے گئے اشتہارات کو ایک نظر دیکھ کر غمزدگتا ہوں کہ میں کس شرمیں کھڑا ہوں میں ہوں کہ بھی اس کی مخصوص باس کی وجہ سے آنکھیں کھولے بغیر پہچان سکتا ہوں کیونکہ یہ باس میں نے اور کسی شرمیں سونگھی ہے۔ شاید وہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے کمر و جھنڈا اور سے اُلی ہوئی فضا، بارش، اگلے اور برت کے غم اور کارخانوں، آتشخانوں، موٹر وں اور ریل گاڑیوں کے دھوئیں کا ایسا امتزاج ضروری ہے جو لندن کے سڑکیں ممکن نہیں۔ آج سے برسوں پہلے جب صبح ناشتے کے بعد میں کرام ویل روڈ سے نکل کر براہمن روڈ، مائینڈ پارک، کارفر، پکاؤلی سٹریٹ اور چیزنگ کراس روڈ کے راستے پر نیو ریسی کاسٹنگ کیا کرتا تھا تو یہ مخصوص باس تمام راستہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا اور مجھے گمان ہونے لگتا کہ شاید یہ ساری کائنات پر میں مادی ہے کہ اس سے کوئی جگہ خالی نہیں۔

اس کو کو آج اتنے عرصے کے بعد سونگھنے پر میری ذہنی کیفیت رغبت اور استعجاب کے ایسے مشترک احساسات کی حامل تھی۔ جن کی وجہ سے سابق کی یہ ناگوار نشے آج دکھش معلوم ہو رہی تھی۔ اند میں موسم کی خرابی کے باوجود ٹیکسی کاشیشہ بنا کر یہ

دماغ پر مبنی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی عکسراتی نظر آ رہی تھی۔ جن کے لئے انگریز
 صدیوں سے دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس کا قومی کردار ایک
 اعلیٰ درجہ والا ایک عظیم چٹان کی طرح اب بھی ویسے کا ویسے تھا۔ بلکہ اس بد حالی کے برعکس
 پر اپنے آہنی عزم، اپنی یکساں روی اور اپنے اخلاقی استحکام کی وجہ سے اپنی اس
 عظمت سے بھی اونچا نظر آ رہا تھا۔ جس میں کبھی وہ اچھے سے میں دکھائی دیتا تھا۔ میں
 سرچنے لگا کہ جن لوگوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ، سوشل کی جنگ آزادی کی
 داستان، ریڈنگ اور ولنگڈن کا مہم حکومت اور زمانہ جنگ کا ہندوستان یاد تھا اور
 جنہوں نے مائونٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی سازشوں کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے
 دیکھا تھا۔ ان سکول میں انگریز کے لئے محبت کا جذبہ یکسر پیدا ہو گیا ہو گا۔ جیالانکہ
 وہ انگریز جس سے ہمیں ہندوستان میں پالا پڑا تھا۔ اس انگریز سے بالکل مختلف تھا جو
 مجھے برطانیہ میں نظر آ رہا تھا۔ ہندوستان میں آنے والا انگریز ایک مکران ٹائٹل
 کی حیثیت سے پس ماندہ، ظلمت زدہ اور مروجہ غلاموں کے ریڈیو حکومت کرے
 کی غرض سے آتا تھا۔ وہ اس ملک میں آتے ہی ضرورت اور حالات کے تقاضے
 کے پیش نظر اپنا علیہ اپنے ملی اطوار، اپنا دل و دماغ اور اپنی جبلت و فطرت کو عادی
 طور پر بدل لیتا تھا۔ کہ بہت شاذ حالتوں میں ہمیں اس میں مداخلت اور شش کی
 حق نظر آتی تھی۔

مجھے یاد آیا پھلی مرتبہ جب میں برطانیہ سے وطن کو لوٹ رہا تھا تو ایک انگریز

لڑکی مارگریٹ ہم فرمیں۔ یہ لڑکی سنہ کے دوران میں ہندوستانی طلبہ سے بڑی رغبت سے ملتی تھی۔ لیکن جیسے ہی ہمارا جائزہ دن کی بندرگاہ سے سہی کی طرف چلا تو ریلگیم سے یوں نا آشنا نظر آنے لگی جیسے ہم نے اُس سے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ جہاں وہ پہلے سٹینس جنس کریم سے باتیں کرتی تھی۔ اب اس کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ وہ چپ چاپ عرش پر اگر آجہنی کٹھے سے لگی پہروں بھیرا عرب کی سروں کو اٹھتے اور گرتے دکھتی رہتی۔ ہم میں سے اگر کوئی اسے بلانے کی کوشش کرتا تو وہ سر دھری سے ایک آدھ ناگھل فقرے کے ذریعے سوال کو ٹھکرا کر پھر سمنہ کی لہروں پر نظریں گاڑ دیتی آخر وہ تین دن کی پریشانی کے بعد حیرت میں یہ راز ہم پر کھلا کر لگی کو آئی تھی۔ ایس اور آئی ہنی کے ان ایک دو انگڑیاں فرموں نے جو نصبت کے غلطے پر ہمارے ہماز سے واپس ہندوستان ہمارے تھے۔ یہ بتا دیا تھا کہ حکمران قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے اب اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ قومی مفاد اور قومی افتخار کے تحفظ کی خاطر ہم ہندوستانیوں سے میل جول نہ رکھے۔

اور پھر مجھے وہ دلی حسبِ حاتم یاد آ گیا جو آکسفورڈ میں ایک کالج کے پورٹل نے خرودنایا تھا۔ یہ صاحبِ جراب یہی نورثی کے ایک دارالافتا میں چمکیدار کی حیثیت سے ملازم تھے۔ کئی برس پہلے صوبہ سرحد کی ایک جھاڑنی میں گورنر ہٹن کے ساتھ بندھ بھر تھے۔ انہیں ایک چٹان کے پاس نہایت نفیس قسم کا ہٹن قبض دیکھ کر اُسے خریدنے کا خیال آیا جب قیمت کا معاملہ ہٹن ہوا تو چٹان نے شاید دس روپے

انگے، انہوں نے اٹھ دپے کئے۔ بات بڑھ گئی۔ اور سووا چکاتے چکاتے معاملہ کس کا کہیں پہنچ گیا۔ آخر ان حضرت نے جھلا کر سارے قصبے کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہی سمجھا۔ کہ پیش قبض اس کے مالک سے بنیر نام کے چھین لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ٹامیوں کی زبان کے استعمال کے ساتھ غریب چٹان کے دو تین ٹکڑیوں میں رسید کیں اور پیش قبض کو قبضے میں کر کے اپنی بارگ کاٹخ کیا۔

یہ واقعہ ایک انگریز کو ہندوستان میں غلام قوم کے ایک فرد کے ساتھ معاملہ کرنے میں پیش آیا تھا۔ لیکن جب کئی جہاد بھی انگریز فوج سے نیشن پاکر کالج کے پورٹر کی حیثیت سے پھر ملازم ہوا تو یہ اپنے وطن برطانیہ میں آچکا تھا۔ جہاں اعمال و افعال کے لئے ایک اقدار کا وجود ملتا ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبریج میں اس تعلیم و ادیت کا بہت احترام کیا جاتا ہے کہ دس بارہ بجے شب کے بعد جب کالج کا چالنگ بند کر دیا جائے۔ تو سینما تھیٹر سے واپس لوٹنے والے سست رو طلباء اگر زور آنے کے لئے چالنگ کی خانہ در سلاخوں کو پھانڈنا چاہیں تو ان کی مردانگی سے تعرض نہ کیا جائے، اتفاق سے ایک رات ایک منہی قسم کا امریکی طالب علم سیر قناتے سے وقت پر واپس نہ پہنچی سکا۔ پہلے تو اس نے چالنگ پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن ملائیں نہ بھاڑے اس پر جھپٹیں۔ اور وہ غرور کھا کر گر گیا۔ آخر اعتراض ہزیمت میں اس نے دھین مرتبہ کی ناکامی کے بعد فیصلہ کیا کہ ج بات بہت سے نہ ہو سکی تھی۔ وہ رشتہ کے ذریعے کراچی چاہئے۔ اس نے معاملہ کو اتنا زوری۔ پورٹر چالنگ سے

عقہ مجھ سے نکلا، لیکن جیسے ہی اُس نے امریکی طالب علم کو ہاتھ میں ایک پونڈ کا نوٹ
 نشانے دیکھا تو غریب پٹیان کے مال ہتھیانے والے سار جٹ میجر کے قومی دستہ کو
 منت بخشیں گے۔ اور وہ برطانوی عزت نفس کے بھرپور احساس کے ساتھ پھانک کے
 طاقے سے چٹا یا : جناب یہ انگلستان ہے : اور پھر پورے زور کے ساتھ طاقے کے
 دو ٹپک کر داپس تجربے میں چلا گیا۔

لندن کے گلی کوچوں سے گزرنے وقت میں یہ منظر ہر جگہ دیکھتا تھا، کیا خیالات
 لاکھٹا سڑک کے ایک کونے میں جے وارث پڑا ہے۔ گزرنے والے لوگ اپنا اپنا اخبار
 اٹھا کر ساتھ رکھے ہوئے ڈبے میں پیسے ڈالنے کے بعد آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یوں بھی
 جہاں ہرے کو لگا ہونے کے پاس ریزنگاری موجود نہیں۔ اس نے بڑی رقم کا نوٹ یا سکہ
 ڈبے میں ڈال کر خود ہی اس کو بٹایا ہے۔ اور پھر اخبار کی قیمت ڈبے میں ڈال کر آگے
 بڑھ گیا ہے۔ اور اس اخلاق افروز منظر کو دیکھ کر مجھے حیرت ہونے لگتی تھی۔ کہ کلائیو اور
 دارن سیٹنگز ایسے قزاق اور ٹانگ بھی میریساں اسی ملک سے پہنچے تھے۔

میں کئی مرتبہ سوچتا تھا کہ انگریزوں نے اپنے آپ کو اس قدر مبہم شخصیت کیوں
 بنا رکھا ہے۔ اس نے اپنی کم سننی اور گھنے پن سے اپنے ارد گرد وہ حصار کیوں کھڑا کر
 رکھا ہے جسے گرائے بغیر کوئی شخص اس کی فطری دلکشی اور شن خیالی اور ذی نفس کو
 پہنچ نہیں سکتا

اور پھر یہ حصار ڈوٹا۔ میں بی بی سی کی سٹات ٹریننگ کلاس میں درس لے رہا تھا۔

اس کلاس میں بہت سے انگریز اور غیر ملکی عورتیں اور موافقی تربیت کے لئے شامل تھے مگر وہ بننے کی رفاقت کے باوجود اس کلاس میں فکا اور ناروے کے دو طالب علموں کے سوا میرا کوئی ایسا رفیق نہ بن سکا تھا جس سے میں کھل کر بات کر سکتا۔ ایک موانعہ سے شہر کے ایک اوارے کی سرگرمیوں پر توجہ بنا ایک ریڈیو پر دوگرام مرتب کرنے کی جس جماعت کو ہدایت کی گئی ان میں سے ایک ملاوہ دو انگریز لڑکیاں بھی شامل تھیں جو پھر کو جب کھانے کے لئے کام بند کیا گیا تو میں نے انہیں لٹچ پر ساتھ پھلنے کی دعوت دی۔

ریٹوراں میں کھانے کے موقع پر بحث چل نکلی کہ انگریز اس قدر کم آئینہ نوکم سخن کیوں ہے۔ میں انگریز کی کم گوئی کا شاک تھا۔ اور لگہ کر رہا تھا کہ نووارد کیسے لندن جیسا ایک بارونق شہر ایک ایسا ہونا کہ ویرانہ ہے۔ جہاں اسے اہل ملک کی بے مہربانی سے غریب الوطنی کا احساس شدت سے رہتا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا "میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ ایشیائی خود مددور کم آئینہ اور ملک تھک رہنے کے عادی ہیں۔ اسی لندن میں سینکڑوں ایشیائی طالب علم موجود ہیں۔ مگر یہ ہمیشہ ایسی جگہ رہیں گے جہاں پہلے سے ایشیائیوں کا جھگڑا ہو۔ وہیں جائیں گے۔ جہاں اور ایشیائیوں کے جمع ہونے کے امکانات ہوں۔ سیر و تفریح کے لئے بھی مہمست کی صورت میں اکٹھے نکلیں گے۔ اور ایک دوسرے ہی کی رفاقت میں زندگی کا لطف ڈھونڈیں گے۔ مدیہ ہے کہ اسی بی بی سی میں جہاں میں ملازم ہوں پاکستان سکیشن میں پاکستان کے کوئی دس آدمی کام کرتے ہیں۔ جن سے پچھلے کئی برس سے میں سنوڈیر

اور دھرمی دن میں کئی بار ملتی ہوں۔ لیکن ان میں ایک فرد بھی تو ایسا نہیں جس نے
کھانا چھوڑ کبھی چائے کے لئے بھی جھوٹے منہ سے ایسی دعوت مجھے دی ہو جس کا
ارتکاب تم سے ہوا ہے۔

میں سرچنے لگا کر لوکی کے بیان میں کچھ ایسا بالکل نہ تھا۔ انگریز گواہ ہمارا
حاکم نہیں رہا۔ لیکن برسوں کی غلامی نے ہم میں اس کی جانب سے ایک ایسا احساس کتنی
پیدا کر دیا ہے کہ ہم میں سے ایک نام قسیم کے فرد کو اس کے ساتھ ٹھکڑا مل جانے
میں کچھ تاہل اور خوف سا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے جب تک اس کی برتری کا رعب
ہمارے دماغوں میں سے نہ نکلے ہمیں اس کے قریب جانے میں ہمیشہ تاملت رہے گا۔

اور پھر ایک دن بی بی کی کے افسر نے جھٹے کا دن مجھے اپنے ہاں بسر کرنے
کی دعوت دی۔ میں ان کی معیت میں اشادہ انیس میل کے نامیلے پر شہر کے مضافات
میں ان کے ہاں پہنچا۔ نشست کے کمرے میں میزبان کے دو بچے پہلے سے بیٹھے
کسی کھیل میں مصروف تھے۔ ہماری آمد پر وہ ایک ساعت کے لئے مجھ سے متعارف
ہونے کے لئے آگے بڑھے اور پھر سٹ کر اپنی تفریح میں یوں مگر گئے گریا ہم، یاد ہو
کرے میں موجود نہ تھے۔ تھوڑی دیر میں یلگم اندر کے کام کاج سے فارغ ہو کر باہر آئیں
اور ہم قینوں اور دھڑا دھڑا کی باتوں میں مشغول ہو گئے، کوئی چندرہاں میں منٹ گزر چکے
تھے کہ اچانک اندر سے کسی بھونٹے سچے کے رونے کی آواز آئی۔ یلگم معذرت
کے الفاظ کے ساتھ آؤ کہ اندر آئیں تو میزبان سے پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ

گھر میں انہی ایک فرد اور بھی تھا اور دو تین ماہ کا وہ بچہ تھا۔ جو خوابگاہ میں اکیلا ٹیٹا ہوا مکان کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔

اس انکشاف سے یہ بات میری بھج میں آگئی کہ انگریز اس قدر عزت پسند کیوں ہے۔ اس بچے کی مثال سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ انگریز، اوائل عمری سے تنہائی اور کم گوئی کے اصولوں سے ماؤس ہو جاتا ہے۔ جب وہ بچہ ہی ہوتا ہے تو وہ ماں کے سامنے گدے پر ٹیٹا یا گاڑی میں پڑا ہوا پاؤں مارتا رہتا ہے۔ آنے جانے والوں میں سے کوئی اس کے بالوں کے رنگ، آنکھوں کی چمک، چہرے کی مصمصیت، اعضا کے تناسب کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ دوسرے ملکوں میں اگر بچے کے ساتھ شڑک پر چلنے تو بعض لوگ مسکرا کر اس سے ایک اوجھ سوال بھی کر ڈالیں گے اور ہمارے ہاں تو ایک بیت بڑی آبادی کے لئے بچے کے لئے کھینچنا اور پیار سے اسے گالی دینا ایک اضطراری فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انجھستان میں بچے کی حیثیت ایک فرد کی ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت میں اس کے حقوق بڑی حد تک وہی ہوتے ہیں۔ جو بڑوں کو حاصل ہیں۔ نہ تو کوئی اسے گھورتا ہے نہ خواہ مخواہ اس کے کٹے کھینچتا ہے۔ مدیہ ہے کہ چاہئے اسے ماں باپ بھی نوداد کے سامنے اسے فخریہ انداز میں پیش نہیں کرتے، اور یوں بچہ طفولیت کے گوشے میں اطمینان کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اسے نہ عزت اپنی عزت پسندی کا لطف آنے لگتا ہے۔ بلکہ اسے دوسروں کی غفلت کے احترام کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ لندن میں ہر اجنبی کا تجربہ ہوتا ہے کہ تمام لندن اپنے
 خیالات میں لگن اپنی ہی خلوت کے حصار میں لگم، اس کی موجودگی سے بے چڑا اس
 کے اور گرد پھیلا ہوا ہے اور اسے اس امر سے کوئی غرض نہیں کہ زوار و کعبے کا مالک
 ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا زبان بولتا ہے۔ اور اس قدر پریشان کیوں ہے میں دیکھتا
 تھا کہ لندن میں اجنبی کی طرف کوئی نہیں تکتا۔ انسان کسی قسم کے کپڑے پہن لے، کیسی ہی
 مضحکہ خیز صورت بنائے، حد یہ ہے کہ سرکس کے سفرے کا بھیس اختیار کر لے۔ لیکن
 اگر اس کا جسم ڈھکا ہوا ہے تو کوئی شخص اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ بھٹیڑ بھاڑ
 کے موقع پر جو کم کے افراد اپنے ساتھیوں سے یوں بے غرض ہوتے ہیں کہ ان کی نظریا
 سرور کے اوپر سے یا کندھوں کے اطراف سے گزر جاتی ہیں۔ پیرس میں یہ بات دہشتی
 وہاں ٹھکا ہوں کہ ادھر ادھر دھڑانا آنت برل لینا تھا۔ وہ دنیا سی سلت میں کسی مہمان
 سوال کسی مدد و محتسب نگاہ سے ضرور ٹھہر جاتی تھیں۔ اور اگر اس سے نکلیں تو تھوڑی
 ہی دیر میں کسی اور موڑتی ہوئی نگاہ میں اٹکی ہوئی ملتی تھیں۔ روم کے مضافات میں
 عائشہ، اسلم، اشفاق احمد اور میں اس سیر کا لطف نہیں اٹھا سکے تھے کہ ہائے
 غیر نازس پاکستانی چہرے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ اور قصبات کے باشندے
 اپنا اپنا کام چھوڑ کر سڑک پر یوں نکل آئے تھے جیسے ہمارے ہاں بعض اوقات شہر میں
 سرکس کے باجی کو دیکھ کر بچے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ ٹورنٹو کے ایک ہوٹل
 میں تو مجھے ایسا دلچسپ تجربہ ہوا تھا کہ اس کا خیال آتے ہی میں آج بھی کیا ہا ہا ہا ہا۔

کھانے کی میز پر اتفاق سے میرے سامنے ایک کینیڈین خاتون بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں کی کوشش یہ تھی کہ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں۔ پہلے تو ہم سب متخالف میں اپنے اپنے سامنے کی دیواروں کو یوں دیکھتے رہے گویا ان پر کوئی عبارت لکھی ہوئی ہے جس کے ہم بھیجے کر رہے ہیں۔ اور پھر ایک فحش مجھے خیال آیا کہ ایسی حالت میں کہ اس خاتون کی توجہ سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی ہے کیا مضائقہ ہے اگر ایک اچھٹی ہوئی نظریں اس کا ہانڈہ لے لیا جائے، غالباً عین اسی موقع پر انہیں بھی خیال آئے ہو گا کہ یہ جو سامنے تین فٹ کے فاصلے پر گھٹے ہوئے سر کا سیاہ خام شخص دیوار پر نظریں کھا بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم کرنے میں کیا تباہی ہے کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ مگر جو سچی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ہماری نظریں ٹریں۔ اور فرد ہی ہم دونوں نے جھینپ کر انہیں حسب سابق دیوار پر گاڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ہیرا سب لے آیا اور آئندہ پانچ منٹ کا وقفہ اس کو چھو سے خلق میں انڈیلنے میں صرف ہو گیا۔ اتفاق سے میں نے اپنی پلیٹ عرصہ سے فضا پہلے مات کر دی تھی۔ ہیرا اسے اٹھانے لگا تو رتور کو غنیمت جان میں نے پھر جلدی میں سامنے ایک نگاہ ڈالی، غالباً وہ مقابل کے لئے بھی یہی سنری موقع امنی کو دیکھنے کا حق چاہتا تھا۔ ہماری نظریں پھر ٹریں۔ اور پھر حدود جھنجھٹ کے عالم میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر خلا میں الگ گئیں۔ اس کے بعد دوسرے کورس کے آنے تک جو تین منٹ کا وقفہ گزرا وہ حدود جو وہاں روح تھا۔ جس عرصے میں وہ خاتون وقت ممانے کے لئے میز پر لکھی

ہوتی فہرست طعام کا مطالعہ کرتی رہیں۔ میں کبھی چھپوں کو ٹیکہ سے صاف کرتا تھا۔ کبھی ہلٹ کو پونچھتا تھا۔ اور کبھی تضحی اوقات کی نیت سے چھری پر لکھے ہوئے حروف کو پڑھتا تھا۔ اور چہرہ جب کورس ختم ہو رہا تھا تو پانی پیتے میں اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ مہتر کی قبر کسی اور طرف ہے۔ شاید اندر نے جھکے ہوئے سر کو ایک تیز حرکت سے دوسری طرف ہٹا دیا تھا۔ فوراً یہ خیال میرے دل میں بجلی کی طرح گونزا کہ موقعہ غنیمت ہے۔ اور میں نے وہیں گلاس کو ہونٹوں سے لگائے ہوئے ایک نظر ڈالتے ڈرتے مہتر پر ڈالی بلکہ قسمت اب کے بھی یاد رکھتی۔ خطرے کے کسی غائبانہ اشارے کے مانت مہتر نے چاک جھپکتے میں گردن موڑی۔ ہلکی نظر پر پھر ملیں۔ اور پانی کا گھونٹ میرے حلق میں سنگ ریزہ بن کر ٹپک گیا۔

(۳)

ایر ڈوروم کی عمارت کے باہر بارش کے پانی کی باریک چاند بھی ہوتی ہے جس پر برا کے تیز جھونکے غشی غشی دیکش سلوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ پانی کی اس چادر پر پھلتا ہوا جہاز چند منٹ پہلے عمارت کے سامنے آکر رکا تھا۔ اس کے مسافر اس وقت اندر داخل ہو رہے ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں جو شخص سب سے آگے چلا آ رہا ہے اس کی شکل و صورت اس شخص سے کس قدر ملتی ہے۔ جسے میں نے تین مہینے پہلے مٹی کرٹ مین میں اپنے کمالات دکھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس دن اتوار کی سہ پہر کو صوبہ میں بڑے بڑے بیٹے اکٹا گیا تھا تو
 تو مجھے چٹی کوٹ لین کی سیر کا خیال آیا تھا لندن کا یہ کوچہ ہفتے میں چھ دن ٹل
 سیکس سٹریٹ کہلاتا ہے۔ ان چھ دنوں کے دوران میں اس میں اور لندن کے دوسرے
 سیکڑوں غیر معیشت پرانوں کو چل میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ ساتھ کے بڑے
 بازاروں میں سودا سلف خریدنے والے لوگ اپنی گاڑیاں یہاں کھڑی کر جاتے ہیں
 یا پھر دوکاندار گاڑیوں کے انتظار میں راستے کی طرف نکلتے ہیں۔ بیٹے بڑے ہیں
 لیکن اتوار کی آمد کے ساتھ ہی ٹل سیکس سٹریٹ لندن سے اچانک غائب ہو جاتی
 ہے۔ اور اس کی جگہ چٹی کوٹ لین کا بازار صبح بہار کی لگاؤ افروز تابی اور جاں نڈر
 رونق کے ساتھ دفعتاً نمودار ہو جاتا ہے۔ جس میں ہر رنگ اور ہر حال کے چھوٹے چھوٹے
 دوکاندار چھاپڑی لگائے، خراچہ اٹھائے، ٹھیلے سجائے گا بکریں کو چلتا چلتا کر بہا چھٹکا
 اپنی طرف متوجہ کرنے میں ایسے مستعد نظر آتے ہیں کہ ان کی گرفت سے بچ کر نکل جانا
 اچھا خاصا سرحد بن جاتا ہے۔ لیکن شرمک پرچی ہوئی ان عجیب و غریب دوکانوں کے
 علاوہ چٹی کوٹ لین میں طرح طرح کے مکمل ٹھانے بھی دن بھر دکھائی دیتے ہیں۔
 ان میں کچھ ایسی کشش کا انداز ہوتا ہے کہ ان سے ٹٹے سے ٹٹے آدمی بھی آسانی
 سے دامن نہیں بچا سکتا۔

میں جب اتوار کی اس سہ پہر کو چٹی کوٹ لین میں پہنچا تو ایک طرف لوگوں کا
 ایک مجمع بڑے اٹھاک سے اس آدمی کی تقریر سننے میں موقوف تھا۔ جو اپنی شکل و صورت

کے اعتبار سے برائی جہاز سے اترنے والے اس مسافر کا ٹیبل تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین تین انچ موٹی دو کتابیں پکڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ تیار ہوا تھا کہ جیسے ہی ناظرین نے اس ٹرپی میں جیسے اس کا دوسرا ساتھی لوگوں کے درمیان پھرا رہا تھا۔ انعام کی رقم ڈال دی۔ وہ ان کتابوں کو ایک جھگٹے میں بھاڑ کر اگک کر دے گا۔ پھر جب تھوڑی دیر میں ٹرپی جمع کا سپر کاسٹ کر واپس آئی اور تماشگر نقدی کو اس میں سے نکال کر حیب میں ڈال چکا تو دیکھنے والے ہر تن بچا بنے تماشگر کی شر ذوری کے کتب کے منتظر تھیں بھاڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر بڑے اطمینان کے ساتھ تماشگر کوٹ کی آستینیں اوپر چڑھانے لگا۔ اس نے گلے کے کارلا بن کھولا، ٹائی کو نیچے کھینچا اور دونوں کتابوں کو ہاتھ میں لے کر چاہتا تھا کہ ایک ہی جھگٹے میں ان کے پڑنے والے کس کا دوسرا ساتھی بڑے دازدارانہ انداز میں خوف اور دہشت سے بھرتی ہوئی آواز کے ساتھ چہنچہا پڑیں آگئی۔ بھاگو اور اس سے پیشتر کہ پیشگی انعام دینے والے ناظرین کھد سکیں کہ یہ بلائے ناگمانی آئی بھی حق کہ کر ضیں۔ تماشگر اور اس کا ساتھی یہ جاوہ جا بیٹی کوٹ لین کے اثر و دام میں یوں غائب ہو گئے۔ گو یا گولی ہتی جس سے کہیں نکل گئی۔

ایسا واقعہ اگر میرے ہاں کبھی لاہور میں پیش آجاتا تو ہر سکتا تھا کہ لوگ اسے ہنس کر ٹال دیتے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ دو تین انصاف پسند تماشائی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کو دکھانے کے لئے فوراً ایک کر تماشگر کے تعاقب میں نکل جاتے

اور بیٹھ جائے گا کہ باوجود اسے بازو میں کیس نہ کیس ہا لیتے۔ پھر ایک اور مجمع لگ جاتا۔ جو بڑھتا جاتا۔ پھینٹتا جاتا۔ حتیٰ کہ بازو کا کاروبار کوپے کا ٹریفک اٹھنے والوں کا کام کاج سب ٹک جاتا۔ بلند آوازیں گاموں میں بدلنے لگتی۔ بحث و صیغہ کاشت کا رنگ اختیار کر جاتی۔ اور آخر میں پولیس کی سیٹیاں اور پھر لائٹوں کی آوازیں سن کر بھاگتے ہیں تماشائی ایک دوسرے کو دھنڈے لگتے۔ وکانیں جلدی جلدی بڑھا دی جاتی ہیں۔ اور وہی بازو جہاں چند منٹ پہلے کھوسے کھوا چھل رہا تھا۔ انسان نظر آتا۔ اور پھر دوسرے دن مقامی اخبارات کی سرخیاں اس "فساد" کے زیر و گداز اور جنگ پاش ذکر سے لوگوں میں سنسنی اور پکپکی پیدا کرتی ہیں جس کے کوآئف سے تناثر ہو کر بعض ایسی پسند ایم۔ ایل۔ اے۔ اہلی میں حکومت سے سوالات کرتے اور مرکزی جوابات سے بد دل ہو کر بعد میں ایسے تماشوں کو بند کرانے کے لئے ملکی قانون کی متعلقہ دفعات میں توہم کا نوٹس دیتے۔

لیکن میٹھی کوٹ لین میں ایسا کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ کسی تماشائی نے بلکہ ٹرے تماشگر کے تعاقب میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تماشگر کی چالاک سے بے وقوف بنے ہوئے ناظرین نہ صرف موقع کی مضحک حالت ہی سے سرگب انہرہ ہنسنے داروں کے مصداق لطف اٹھا رہے تھے۔ بلکہ تماشگر کے ذہن رسا کی دلچسپ انخراں پر اسے داد بھی دے رہے تھے۔

میرے قریب کھڑے ہوئے ایک تماشائی نے اپنے سگرتے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا: یہ حرکت بھی اس قماشے کا ایک جزو ہے۔

دوسرے نے ہٹے اطمینان سے جواب دیا: میں جانتا تھا کیا ہو گا۔

جو کچھ ہوا اسے کھیل ہی کا ایک حصہ قرار دینا اور مکمل کے ایسے غیر متوقع ختم نامہ کو لاجی بھینا شاید غفلت کو شانے کی ایک معصوم کوشش تھی لیکن اس صبح کے افراد کے تحمل اور برداشت کا غرور پتہ چلتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید یہ بھی رواداری کے اس وسیع جذبے ہی کا نتیجہ تھا کہ لندن میں اگر کوئی شخص چاہے تو مذہب یا سیاست متعلق حدود برائے آتش گیر اور متنازعہ فیہ مسائل کو بھی واروگیر کے خوف کے بغیر ہائیڈ پارک کے شہرہ آفاق "سپیکرز کلاز" میں اخلاق اور شرافت کی حدود کے اندر محنت پر اسے میں بیان کر سکتا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ میں جب پہلے دن "سپیکرز کلاز" میں گیا تھا تو میرے لئے وہاں کا منظر کسی قدر عجیب انگیز تھا۔ تاریخی مادل آریج پر شکوہ کیسیر ریڈ ہٹل، نیشنل ایمل پارکنگ اور مترو اگسٹو ڈسٹرٹ سے ذرا سے فاصلے پر ہائیڈ پارک کا یہ کون ایسی چھوٹی چھوٹی ٹرمینل میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں بے ٹکڑو جواڑوں، مگر ٹوی جوتوں، یونیورسٹی کے طالب علموں، ریست پر آئے ہوئے فوجیوں بے کام زوروں، غیر ملکی مسافروں، بدست خرابیوں کے جھگڑاوار اور پُرسکون فونے ٹری پچھی اور ناخاک سے ان مفردین اور خطیبوں کی تقریریں سن رہے تھے۔ جو قصبوں کے فیشن سے لے کر الوہیت اور رو بیت تک کے مسلسل مسائل پر دھواں دھار لکچر چلا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کہیں مذہب کے لئے جادو ہے میں۔ کیس جرنل کی حکومت کو گیدا جا رہا ہے کیس شنشا بیت کے خلاف آواز

اٹھایا جا رہا ہے کہیں دنیا اور اہل دنیا کو سنت سست کہا جا رہا ہے۔ اور کہیں کسی پٹے ہوئے سیاسی مذہب کی حمایت کی جا رہی ہے۔ مجھے مقررین پر شک ساگزرنے لگا تھا کہ شاید یہ سب نیم دیانے میں جہاں اپنی ادا نگنوں میں ہر قسم کی دہی تباہی کے پلے جا رہے ہیں۔ لیکن پھر ان میں سے بعض مقررین کی تقریریں سننے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہونے لگا کہ یہ لوگ کوئی سرسبز سرسبز ملک نہ ہیں بلکہ حدود و باخیز زندہ دماغ اور شوخ و طعنا مقررین تھے۔ جیہٹیکر کے زمانے میں ہلاوٹ پٹانگ سوال کدے داتے شخص کو پاکی سیکٹ میں اپنے رشتہ جہاں اور پڑھت پھیتوں سے گدھا ثابت کر لیتے تھے۔

”سپیکر کارنر کو دیکھنے کے بعد مجھے اس احساس ہونے لگا تھا کہ مقررین کا یہ کلیہ اجتماعی زندگی کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ آج کل پارلیمنٹوں، اسمبلیوں، اخبارات اور ریڈیو کے زمانے میں اقلیتوں کی چھوٹی چھوٹی آوازیں کوئی نہیں سنتا۔ وہ بڑا برس قبل کسی ہافروزہ شہری کے لئے یہ لازم نہ تھا کہ وہ ”ڈان“ یا ”پاکستان ٹائمز“ میں ایڈیٹر کے نام پر سارا جھپوٹے۔ وہ سیدھا فورم میں جاتا تھا اور کچھ اسے کہنا جوتا تھا لگی میٹی رکھے بغیر سات سات سب کے منہ پر کہ دیتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آج بھی ایڈیٹر پارک میں یہی کچھ جوتا ہے جو کچھ سے کہنا جوتا ہے۔ وہ چاروگ ٹوک اسے پوری تشدد سے ماضی کے کاؤن تک پہنچا دیتا ہے۔ اور خواہ وہ بات برسرِ اقتدار حکومت کے طریقِ نظم و نسق کے خلاف ہو خواہ وہ ملک کے کسی سرکاری کام کی تفتیش ہو خواہ وہ باہر کے کسی غوثاک سیاسی مذہب کی تبلیغ ہو مقرر سے کوئی تفرغ نہیں کرتا۔

[مجھے یلدا، یا ایک دن عجاز ثبائی اور میں ان کی دس گاہ انگلستان کے قصبے
 ٹیل اور فلیٹ سٹریٹ کے درمیانی علاقے کی ان دو بپور گلیوں میں سے گزر رہے
 تھے۔ جہیں ڈاکٹر جانسن، چارلس بیٹ اور تھورن ہولڈ اسمتھ، ویلیم میکس میکسٹے،
 ٹامپسن یا آئزک نیوٹن جیسی نامور شخصیتوں کے قدموں سے سر فراز ہونے کا فخر حاصل ہے
 اور جب ہم باتیں کرتے ہوئے انگلستان فیلڈ میں پہنچے تھے تو سڑک کے ایک طرف
 ہمیں ایک صاحب کھل ہوئی کار کے پچھلے حصے میں کھڑے جوش کے عالم میں مجھ سے
 خطاب کرتے ہوئے نظر آئے۔ ہم ان کی تقریر سننے کے لئے ایک ماحمت کے لئے
 نظر اگئے تو معلوم ہوا کہ یہ صاحب جو خود انگریز تھے کینیا کے کوکو یو قبیلے کی اوماوہا
 کی حمایت میں برطانوی سامراج ہمد اس کے مظالم کے خلاف بڑی شدت سے اپنے
 خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ جب ان کی تقریر برطانوی سیاست کے بعض بڑے
 پہلوؤں پر ہمدے غمناک و شنی ڈالنے لگی تو مجمع میں ہمارے قریب کے ایک صاحب
 ملکی سیاست و ادبی کی حمایت میں جوابی تقریر پڑھائے لیکن اپنے حریف کے
 یہ چہرہ و مترنیں تھے۔ جوش میں ہیک گئے۔ اور ان کے منہ سے ایک دواغت
 ایسے نکل گئے۔ جن میں برطانی کا اندلا نظر آتا تھا۔ اسی ہم پروری طرح یہ بھی نہ دیکھ پاتے
 تھے کہ اس دباؤ کی کو جمع کئے لوگوں نے کس قدر ناپسند کیا ہے کہ ہماری نظر اس سپاہی
 کی سیاہ صدی اور ہار و فروختہ ہمرے پگنی جو مجمع کے پیچھے سے بے بے ڈگ بھرتا
 اس پر جوش و ترقی مترن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر سپاہی نے ٹکنا نہ لیجے

میں کہا:۔ جناب والا میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک شاہراہ کی پٹری پر ایک عظیم عام میں کھڑے ہیں۔ اور میں آپ سے اتنا س کروں گا کہ آپ اپنے الفاظ کے استعمال میں احتیاط سے کام لیں۔ ورنہ مجھے یہ تلخ فرض ادا کرنا ہو گا۔ کہ میں آپ کو بدنامی کے ارتکاب میں گرفتار کر لوں:

شوقیہ مقرر نے سفدت کے ساتھ سپاہی کی طرت دکھیا۔ پھر بڑے قاسف لہجے میں کہا: میں سمانی چاہتا ہوں:

میں غور کرنے لگا کہ یہ بات بھی شاید برطانیہ ہی میں ہو سکتی ہے کہ حکومت کی اہم پامیں کے خلاف دہر چکانی کرنے والے کو گرفتار کرنے کی بجائے اٹھادس شخص کو ہانوں کی یاد دلائی جائے جو اس کی تقریر میں غیر ضروری طریقے سے گڑبگڑنے کی سی کرے اور پھر حسب اجماع ہٹا دی جیسے منکسر زبان کی لائبریری میں محمد کو کسی کام سے باہر نکلے تو تنہائی میں سیر و حیا ان انگریز کی روحانی کی طرت گیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اس جذبہ کی تصویریں جنہا نے کائنات بڑا دخل ہے۔ لہذا وہی کاسب سے بڑا دشمن خون ہے اور سب سے بڑا خوف جس نے یورپ میں بننے والی قوموں کو ہمیشہ بے چین رکھا ہے۔ غنیمت کی چڑھائی کا اندش ہے جس سے برطانیہ و روس و بابر انگلستان کے قدرتی محافظ کے فضل ہمیشہ معذور رہا ہے۔ پانی کے اس تنگ خطے نے نہ صرف حملہ آوروں کو جزائر برطانیہ کا رخ کرنے سے باز رکھا ہے۔ بلکہ اس کی مہمگی میں باہر کے انقلابی خیالات کے جراثیم بھی اڑ کر ادھر نہیں پہنچے۔ گواں جزائر کے باشندے سب ملکوں میں پورس

پانے والے خیالات سے کسی دکنی سنگ ضرور متاثر ہوتے رہے ہیں۔ لیکن مستقل انقلابی
 تحریریں جیسے ڈیڑھ صدی پہلے کا انقلاب فرانس یا اس صدی میں فسطائیت اور اشتراکیت
 جن کے اثرات نے یورپی ممالک کی سیاسی اور معیشتی زندگی کو ایک مستقل عذاب بنا رکھا
 ہے۔ یہاں فروغ نہیں پاسکیں۔

پہر مجھے خیال آیا کہ شاید ملک کا اختصار بھی اس جذبے کی تعمیر کا معاون ہے
 اس بچوٹے سے خطے میں پانچ کروڑ انسان بٹتے ہیں۔ اور یہ آبادی دنیا کی گنتان ترین
 آبادیوں میں شمار ہوتی ہے۔ پانچ کروڑ انسان اگر مختصر سے ملک میں سکون اور آرام سے
 رہنے کے خواہش مند ہوں تو ان کی برخاستگی! اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ
 وہ ان اور امر و ناہمی کا غم سے مانتا احترام کریں جو اجتماعی زندگی کی کامیابی کے
 لئے لازمی سمجھے جاتے ہیں۔ بیئر بھاڑ کے موقع پر اگر مجمع کے لوگ معاہداری سے
 کام لینے کی بجائے خود غرضی پر آئیں اور ذاتی آسائش اور بہت کی خاطر ایک دوسرے
 کو دھکے دینا شروع کر دیں تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو آج سے چند برس پیشتر عید
 کی نماز کے خاتمے پر لاہور کی بادشاہی مسجد کے تنگ دروازے میں سے نکلنے والے
 بے صبر غازیوں نے خود مرگ یا سائیتوں کو کھل کر دکھایا تھا۔

خود کو نے ہی سے یہ بھی محسوس ہوا کہ قیصر مختصر جس نے انگریزوں کو دھار کی
 جذبے کو مستقل عادت بنا دیا ہے۔ وہ اس لاکھیلوں سے مشت ہے۔ کوئی کھیل مقبولیت
 اطمینان اور صفائی سے اس وقت تک کھیلا نہیں جاسکتا۔ جب تک اسے قواعد و ضوابط

کے سنبھالنا نہ ہلے۔ اور جو قاعدہ مرتب کئے جائیں۔ وہ تمام کھلاڑیوں پر سادی طور پر
 حسابی نہ ہوں۔ چنانچہ ہمیں ہی سے انگریز کو کھیل کو دو کے میدان میں یہ سیکھنا پڑتا ہے
 کہ جس مزامت کا وہ خود مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا حق دوسروں کو بھی پہنچتا ہے۔ غالباً ان
 ہی سب باتوں نے لی ملاکر صدیوں سے اُسے یہ بات سکھا دی ہے کہ رواداری و نرمی
 کا بہت بڑا اصول ہے۔

میں بھی اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ اعباد بٹالوی ہاتھ میں روزنامہ "سٹارز" کے
 "ٹائز ایڈیشن" کا ایک پرچہ پکٹے میرے پاس آئے کئے گئے۔ فٹ بال دلمے مقدسے
 کا فیصلہ ہو گیا۔ پڑھو۔

فٹ بال والا کیس یہ تھا کہ پچھلے سیر کی شام کو لندن میں فٹ بال کی لیگ
 ٹرنامنٹ کا بہت اہم میچ کھیلا گیا تھا۔ اس میچ کو دیکھنے کے لئے مضامینات اور بیات
 سے بہت سے لوگ لندن آئے تھے۔ میچ کے بعد یہ لوگ لندن کی سیر و تفریح کے لئے
 رات کو اصرار و سرٹری بڑی ٹریوں میں گھوم رہے تھے کہ پلاٹوں میں پہنچ کر ان میں سے
 ایک ٹری کی کسی جگہ کا پتہ معلوم کر کے کی ضرورت پڑی۔ پارلیمنٹ کے ایک رکن مین
 اُس وقت ایک ہوٹل سے رات کے کھانے کے بعد گھر جانے کی نیت سے باہر نکلے
 تھے۔ وہ امتحان لوگوں کی اس جماعت کو راستہ بتانے کے لئے سڑک کے باہر روک گئے
 جب گشت کرتے ہوئے سپاہی نے انہیں دیکھا ہے۔ تو وہ تیس چلتیس آدمیوں کو لئے
 ان سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہ کہ رہے تھے۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر اس مجمع کے

گھنٹوں سے کہا کہ وہ پٹری پر چل چکا ہے تاکہ اس کی بجائے چلتے پھرتے نفرائیں کیونکہ اس سے پیدل چلتے والوں کا راستہ ٹک گیا تھا اور وہ آگے جانے کے لئے شرک پر سے گزرنے والی تیز رفتار گاڑیوں کی چھٹ کا خطرہ مول لے رہے تھے۔ پارلیمنٹ کے رکن نے سپاہی کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے بتایا کہ یہ مجمع ایسے نموداروں کا تھا جو قماشے کی خاطر وہاں ٹھہرے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ شرکے کسی مقام کا راستہ دریافت کر رہے تھے۔ سپاہی اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کہا کچھ بھی ہو۔ واقعہ یہی ہے کہ ان کی وجہ سے راستہ ٹکا ہوا ہے۔ اور سب کو فوراً یہاں سے ہٹ جانا چاہئے۔ اس پر ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ وہ جنسیوں کو راستہ بتا دیں تو وہ ایک آدھ منٹ میں خود بخود وہاں سے چلے جائیں گے۔ اور پھر اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ جائیں گے۔ باتیں کرنے لگے۔ اب سپاہی نے ممبر پارلیمنٹ کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے اپنی گفتگو کو مزید جاری رکھا تو وہ قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں انہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہو گا۔ ممبر پارلیمنٹ شاید اس فقرے سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے سپاہی کی بات ان سنی کر کے مجمع سے پھر پیٹے کی طرح اپنی گفتگو جاری کر دی۔ آخر سپاہی نے کہا: جناب والا چونکہ آپ ان لوگوں کو یہاں ٹھہرا کر شرک کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔ ممبر پارلیمنٹ نے جواب دیا: بہت اچھا۔ میں حاضر ہوں۔ مگر سوچو۔ اس حرکت پر شاید تمہیں بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔ میں دھرمت قانون کو جانتا ہوں۔ بلکہ پارلیمنٹ کا ممبر بھی ہوں۔

اجازت نے اخبار کار پر میرے حوالے کرتے ہوئے وہ سفر کھول کر میرے سامنے کیا جس پر مقدمے کا فیصلہ چھپا ہوا تھا۔ اور ہم دونوں سر جوڑ کر اُسے پڑھنے لگے۔ عدالت نے فیصلہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس شہادت کی بنا پر جو اس کے دو ہدف یقین کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ لازم سزا قصور وار ہے اور اُسے جرم کی سزا ملنی چاہئے۔ سزا کا قین کرتے وقت وہ مناسب سمجھتی ہے کہ اس بات کی ضمانت بھی کر دے کہ وہ ممبران پارلیمنٹ اور دوسرے لوگوں میں کوئی امتیاز نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے مجرم کو دو پونڈ جرمانہ یا بصورتِ عدم ادائیگی ایک دن کی قید کی سزا دی جاتی ہے۔

(۴)

ابھی ابھی لاڈلوں پیکر پر اعلان ہوا ہے کہ ہمارا ہما زاب روانگی کے لئے تیار ہے۔ اور ہم اپنے پاسپورٹ اور صحت کے کاغذات لے کر معائنے کے لئے سامنے کے اس کمرے میں پہنچ جائیں۔ جہاں سے جہاز تک پہنچنے کا راستہ نکلتا ہے۔

میں نے کاغذات کو جیب سے نکالا ہے تو اچانک میری نظر اس مزدوری خط پر پڑی ہے۔ جو میں نے آج صبح اپنے استاد پر فیسر حمید احمد خاں کے نام کیمرج کے پتے پر لکھا تھا۔ اور جس میں میں نے اس امر کی مذمت چاہی تھی کہ میں اپنے وعدے کے خلاف وطن کی طرف لوٹنے سے قبل ان سے ملاقات کے لئے کیمرج نہ جا سکا تھا۔ میں اب تک اسی خیال میں تھا کہ ایر وڈوم کی طرف روانہ ہونے سے قبل میں

نے اُسے ٹاک میں ڈالنے کے لئے ہوٹل کے کسی ملازم کے حوالے کر دیا تھا۔
 لیکن شاید اسے کچھنے کے بعد میں سفر کی تیاری میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اُسے ٹاک میں
 ڈالنے کا دھیان میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ میرے سامنے کچھ خاصے پرائیڈم
 کی عمارت کے انورٹیرکس موجود ہے خط کو ہاتھ میں لئے میں اس کی طرف بٹھ رہا
 ہوں۔ تو میرے تصور میں اداخلی و ممبر کی اس صبح کی یاد نمود کر آتی ہے جس میں اعجاز
 اور میں پروفیسر حمید احمد خاں سے ملنے کے لئے کیمبرج کے ریلوے اسٹیشن پر
 اُترے تھے۔

اس سے پہلے میں آکسفورڈ کی زیارت کئی مرتبہ کر چکا تھا لیکن کیمبرج میں یہی
 یہ آمد اولین تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے اس کا
 ماحول لندن یونیورسٹی کے مقابلے میں مدد و جہ علم پر دور اور علم افزا نظر آیا۔ لندن
 یونیورسٹی کی عمارت اور دسگاہیں شہر کے ہنگامہ پر دور اور پر شور رگی گڑچوں میں ادھر
 ادھر بے ترتیبی سے کھری ہوئی ہیں۔ آکسفورڈ میں ہر چیز قرینے سے دکھائی دی۔
 یہاں دسگاہوں، لائبریریوں، گر جا گھروں، اماست گاہوں کے وجود اور ترتیب
 میں ایک ایسی منطق کا ردِ نظر آئی۔ جو ایک معین مقصد کی آئینہ دار تھی۔ اس سے
 میں کچھ ایسا متاثر ہوا کہ میں نے اپنے چلے قیام کے دوران ہی میں مرٹن کالج سے
 لے کر جس کی عمر سات سو سال ہے۔ کرائسٹ چرچ کالج تک جو آکسفورڈ کا سب
 سے وسیع و عریض کالج ہے۔ اس کے کم و بیش سب ورسی ادارے دیکھ ڈالے اور

پھر جب میں دو تین دن کی اس پُر پخت سیر کے بعد لندن واپس لوٹا تو میرے ذہن میں
نیرولامیج کا ہائیڈروپیکس، موڈلین کالج کی گر بانا عمارت، کرائسٹ چرچ کا گھڑیاں، اولڈ
ٹام، ہڈولین لائبریری میں معلوم مشرقی کے خزانے اور انمولین عجائب خانے میں
فینس اور مائیکل انجلو کے کمالات فن ایک ایسا گہرا اثر چھوڑ گئے کہ میں اس کے بعد
کئی مرتبہ لندن سے آکسفورڈ آنے پر مجبور ہوا۔

اب کے پھر انگلستان آیا تو آکسفورڈ کی کشش نے قدرتی طور پر پھر مجھے اپنی
طرح کھینچا۔ لیکن میں برس بعد کا آکسفورڈ مجھے کچھ لندن ہی کی طرح کا بے ہنگم سا
شہر دکھائی دیا۔ اب اس کی آبادی پچھلے کے چند ہزار نفوس کے مقابلے میں ایک
لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ لیکن اس آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم و تہذیب میں نہیں
بلکہ موٹر کار کی اس صنعت سے وابستہ نظر آ رہا تھا۔ جسے اسی شہر کے ایک جوان
بہت شخص مورس نے گاؤں کے قریبی گاؤں میں ایسا فروغ دیا تھا۔ کہ آج مرس
موٹر کمپنی اور لارڈو فلیکڈ کا نام کاروباری دنیا میں اسی شہریت کو پہنچ چکا ہے جو علمی
دنیا میں خود آکسفورڈ کو حائل ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انٹی سٹریٹ پر جو بڑی بڑی
گھڑیاں، بیس اور کاریں کوئٹز کالج، موڈلین کالج، آل سول کالج کے سامنے سے
پوری رفتار کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ ان کے چلانے والے ان کالجوں میں سے
نصف کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ جن کی وجہ سے آکسفورڈ آج اس لازوال
شہریت کا مالک ہے۔ جو دنیا کے چند شہروں کو میسر ہے۔

اور پھر مجھے کیسبرج جانے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے پہلی مرتبہ انوارہ لگایا کر یہ جگہ کتنی وہاں انگیز، کتنی شعریت پرور اور کتنی علم افزوہ ہے۔ شاید کیسبرج کی سیر سے میں اس مرتبہ پھر محروم رہ جاتا لیکن اب کے وہاں ایک ایسی کشش موجود تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں جانا میرے لئے ناگزیر تھا۔ میرے لندن پہنچنے سے چند ہفتے قبل پروفیسر حمید احمد خاں کو ان کے ملی تجسس کا ذوق کیسبرج سے بھایا تھا۔ جہاں وہ کیسبرج سکار کی حیثیت فٹنر ولیم کالج میں دوڑوڑوہ کی شاعری کے بعض فیچر رٹ پہلوؤں پر یقین میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ دوسرے ہی دن ان کا حجاب اُگیا۔ لکھیا تھا۔ اعجاز حسین بٹالوی کو لے کر اتوار کے دن پہلی گاڑی سے کیسبرج پہنچو۔

دلی کے کشیش سے بس جب ڈریسنگ ٹیوٹریٹ کے وہاں پہنچی تو پروفیسر حمید احمد خاں کی تجویز پر ہم نیچے آکر سڑک پر پیدل چلنے لگے۔ اس امر کے علاوہ کہ ابھی صبح کے نو بجے تھے۔ اور اتوار کا دن تھا کیسبرج میں ٹرم کے خاتمے کی تعطیلات کا رنگ ہر طرف نظر آتا تھا۔ سڑک چل چل سے کیر باری تھی۔ معلوم ہوتا تھا اپنی دست کے باوجود کیسبرج میں بعض چند سو نفوس کے سا کچھ نہیں پٹیراؤس سے گزر کر جیسے ہی ہم ہیروک کالج کے دروازے پہنچے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کو شاید تاثر کی یاد آئی اور وہ ہمیں تاثر کے پرانے کالج کو دکھانے کے لئے اندر لے گئے۔ جب ہم اندر آکر اسے کالج کی عمارات کو دیکھ رہے تھے تو پروفیسر حمید احمد خاں

ہیں بتانے لگے کہ کھیلے چاہیے سب برس میں اس یونیورسٹی نے برطانوی ادب اور سیاست کے کتنے بلند پایہ افراد کو پیدا کیا تھا، اسپنسر، ملٹن، کوکرج، اورڈوڈ، ہارن، ہینیکن یہ سب اسی یونیورسٹی کی پیداوار تھے۔ اور خود اس گرسے بھی اسی پھر رک کالج ہی سے متعلق تھے۔

اور پھر جب کہ انٹنس کالج کے درمیانی راستے سے گزر کر ہم فیلوڈ ہلڈنگ سے آگے فیلوڈ گارڈن میں پہنچے تو پروفیسر صاحب نے بڑے مشورے و خصوص کے ساتھ ہمیں شہرت کا وہ درخت دکھایا جسے روایت کے مطابق ملٹن نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس کالج میں وہ جگہ بھی تھی۔ جہاں چارلس ڈارون نے سب سے پہلے اپنے نظریات پر غور کرنا شروع کیا تھا۔ اور پھر ہم نے اس کٹر کی کاویا کیا جو سٹ ہا کالج کے اس کمرے میں کھلتی تھی جسے ویم ورڈوڈ کی قیام گاہ ہونے کا فخر حاصل تھا اور پھر پھرتے ہم ٹرنٹی کالج میں پہنچے جہاں ٹینیسن اور میکالے آؤڈک نیوٹن لارڈ بائرن اور فرانسس بکن اپنا اپنا وقت گزار چکے تھے۔

جب ہم ننگز کالج کے عظیم اٹان کلیسا تک پہنچے ہیں تو وہاں کی عبادت کا وقت ہو چکا تھا۔ اور عبادت گاہوں کی ایک جماعت اندر پہاڑی سے وعظ سن رہی تھی۔ ہم بھی ٹریاں اتار کر اس جماعت کے ساتھ چند غزلوں کے لئے وعظ کی سماعت میں شریک ہو گئے۔ وعظ با تھا اور بھی اچھی کیمرج میں بہت کچھ دیکھنا تھا۔ اس لئے ہم بے پناہ باہر نکلے اور کلیئر کالج کے عقب سے دریا کے کنارے پہنچے۔ دریا کے دونوں

طرف ہرے ہرے گھاس کا تختہ غالیچے کی طرح ہر طرف بچھا ہوا تھا۔ کناؤں پر ہیدمبیل کی ٹہنیاں ودیا کے پانی سے مہدوش ہو رہی تھیں۔ اور سدا بار گھیرے ہدختوں کے سائے پانی میں اتر کر اسے ایسی دلفریب رنگت دے رہے تھے کہ جی چاہتا تھا اس سے نظر نہ اٹھائی جائے۔

وطن کی طرف لڑنے سے پہلے میں پروفیسر حمید احمد خاں سے چلنے کے لئے ایک سے ناندر تر تہ کیسیرج سے جو آیا تھا لیکن ادوہ تھا کہ آخری سفر پر روانہ ہونے سے قبل ایک مرتبہ پیر میں کیسیرج جاؤں گا۔ یہی ساداس کی اصل دید کا ہوتا ہے جبکہ یوگم بہا کی تابانی کیسیرج کے باغیچوں میدانوں اور باغات میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتی ہے میں نے پروفیسر حمید احمد خاں سے وعدہ کیا تھا کہ لاہور کی طرف روانہ ہونے سے دو تین دن پہلے ان سے ملنے آؤں گا۔ لیکن جوں میں نے اس سفر کے لئے تقرر کیا تھا اسی شام کے لئے اجمار، ژبالوی، تھیٹر کے ایک خاص کھیل کے ٹکٹ لے کر میرے پاس پہنچ گئے جسے یوٹر سکورز کے ایک پرائیویٹ تھیٹر، آئٹس تھیٹر کلب میں اس کلب کے ممبر اپنے دوسرے اداکین اور ان کے مہمانوں کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر رہے تھے۔

لندن کے تھیٹر کا خیال آتے ہی دھیان لا محلہ ویسٹ اینڈ کی اس مشہور زماں تماشا گاہ کی طرف جاتا ہے۔ جو شافٹسبری ایونیو دروی لین ہے۔ مارکیٹ وغیرہ میں گھبرا ہوا ہے۔ لیکن لندن کا ایٹنج کچھ ویسٹ اینڈ ہی سے متعلق نہیں۔ شہر کے متعدد

گلی کوچوں اور شہر مضافات میں بیسیوں قابلِ قدر تھئیٹرز موجود ہیں۔ جن سے شائقینِ تھئیٹر کے ذوق کی تکمیل کا سامان میا ہوتا رہتا ہے۔

مضافات کے تھئیٹر ڈسینل کے وجود میں آنے سے قبل اس زمانے کی یادگار ہیں جب زندہ ناچ اور گھٹنے پر لوگ جان دیتے تھے۔ اور ان کا کمال یہ ہے کہ ان کے طفیل ایسے مقامات پر اب بھی تھئیٹر کی روایت قائم و پابند ہے۔ جہاں فروشی کے باغیچوں میں فنِ شریف کبھی کام کر چکا ہو تا لیکن لندن تھئیٹر کی سب سے لمبی و پختہ تاریخ ہے۔ جو پبلک یعنی کاروباری تھئیٹروں کے برعکس پرائیویٹ طور پر مختلف تھئیٹر گلیس اپنے ارکان اور ان کے مہمانوں کی خاطر چلتی ہیں۔

لندن کی کاؤنٹی کونسل آگ سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کا بہت خیال سمجھتی ہے چنانچہ کسی تھئیٹر کو اس وقت تک لائسنس نہیں مل سکتا۔ جب تک اس کی سٹیج پر ناٹرز پٹ پر وہ اور خطے کی صورت میں باہر نکلنے کے لئے مستعد و سزاوارت نہ ہوں۔ لیکن اگر کچھ لوگ مل کر کھیل تماشے کے لئے گلاب بنالیں۔ اور پٹ کے ٹکٹس کے لئے عام کی شرط نہ لگائیں تو پھر نہ صرف ناٹرز پٹ پر ہی کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ یہ بھی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ کہ کھیل کے سودے کو پہلے سے سنسر کر دیا جائے۔ گویا کسی تھئیٹر گلاب کے ممبروں کو اپنی روح کو تباہ اور جسم کو راکھ کرنا چاہیے تو کاؤنٹی کونسل کو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

یہ گلاب تھئیٹر نہ صرف بڑی کار آمد تجربہ گاہ ہیں۔ بلکہ ان میں ایکٹروں کی تربیت

کھینے والوں کی مشق اور پروڈیوسوں کے اجتماع کے لئے جو مواقع میسر آتے ہیں۔ وہ غالباً ہلکے تصنیفوں میں میسر نہیں آ سکتے۔ ان تصنیفوں میں بعض اوقات ایسے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ جو کامد باری طور پر کوئی مستقبل نہیں رکھتے۔ اور ایسے کھیل بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جن کی کامیابی سے متاثر ہر کچھ ہلکے تصنیفوں کے منبر نہیں اپنے ہاں اٹھانگواتے ہیں۔ ان میں سے بعض تصنیفوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بھولے سہرے شاہکاروں کو پھر سے زندہ کرنے کی خدمت انجام دیں۔ لیکن ان میں سے اکثر ادارے ایسی مالی پریشانیوں میں اُبھے رہتے ہیں۔ کہ اگر فن کے پرستان کی مستقل مالی امداد نہ کریں تو شاید یہ دم توڑ دیں۔ لیکن اپنی مشکلات کے باوجود یہ تصنیف آرٹ اور ادب کی خدمت کا ایک مستقل ذیلیہ ہیں۔ اور ان کے توسط سے کئی فن کار اور کئی ادبی شاہ پارے اونچے درجے کی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

میسٹر سکور کے آرٹس تصنیف کلب کا نام میں نے پہلے سے سن رکھا تھا۔ حجاز کے اسرار کے سامنے کیمبرج کا سفر ملوثی کرنا پڑا۔ وہیں ان کی مسیت میں شام کو اس کلب کی عمارت میں پہنچ گیا۔ اسی ادارہ چیرنگ کراس روڈ سے ہٹ کر ایک سیدھی سادہ عمارت کے اندر واقع ہے۔ اس میں کھانے اور آرام کمرے کے کمرے کافی اور سینڈویچ کا ادارہ شائقین فن کی ضروریات کی کمات کا پورا اہتمام ہے۔ اندر ہائے تو صدام ہوتا ہے جیسے آپ کسی بڑے تصنیف کے اندر چلے آئے ہیں۔ اس کلب کے ارکان مشرقیہ اکثریت ہونے کے باوجود محدود درجہ پیشہ مردانہ عمارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے

جب یہ پڑھ لکھ سیکھ کر پیش کیا تو پہلی مرتبہ مجھے برطانوی فن کاروں کی اہل عظمت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اوہیں سوچتے لگا کر انہیں اپنے پہلے قیام کے دوران میں لندن کے تھیٹروں کی سیر کا طے کر سکتا تو شاید مجھے گھر کی حرمت بھاگنے کی ترغیب اتنی جلد نہ ہوتی۔

میرا خیال تھا کہ میں دوسرے روز کیمبرج چلا جاؤں گا۔ لیکن دوسرے روز ایک اور اتفاق آن پڑی۔ مجھے صاف خیال آیا کہ میں نے برطانوی ادیبوں کو نہیں دیکھا۔ ایک ہی دن باقی تھا۔ جو کیمبرج کے لئے وقف کیا جا سکتا تھا یا ادیبوں کی سیر کے لئے میل ٹھوق مجھے ریڈ لیز کے ادیبوں اور کڈنٹ گارڈن کے بیٹے میں پہنچ کر لے گیا۔ ایسے شہر میں جس کی روایات ادب فرانسیسی و فن پرستی صدیوں پرانی ہوں یہ وہم بھی نہیں گذر سکتا۔ کہ اس میں فن کا کوئی مرکز اپنی اصل جگہ سے ہٹ کر صحبت نا جنس کی بدترین مثال کے طور پر سبزی منڈی کے اندر قیام کر سکتا ہے۔ لیکن لندن کا ناٹک ادیبوں کی جو برطانوی ادیبوں اور بیٹے کا صدر مقام ہے۔ لندن کی سبزی منڈی کو کڈنٹ گارڈن ہی کے صحن وسط میں واقع ہے۔ یہ منڈی شہر اور جنگلے میں بھاڑے ہاں کی کسی سبزی یا میوہ منڈی سے کسی طرح پہچنے نہیں۔ یہاں بھی کھوڑے سے کھراچھتا ہے۔ اور دونوں بھر پوری ٹھی لاریاں پھل پھول سبزیاں لاتی اور لے جاتی رہتی ہیں۔ اس علاقے میں جائے قومانڈے ہی سے مزدوروں کے شرور و غوغا کھجور کی پکار، آٹھتھنوں کی چوب ڈبائی ٹھیلوں کی ہڑ بھگ سے ایک ایسا جنگار برطرت برپا نظر آتا ہے۔ کو ایک ساعت کے لئے بھی یہ گمان نہیں گزر سکتا کہ اس مشہور شاہراہ میں شام

وقت ایسا سکون قیسر رکھتا ہے جس کے سائے میں برطانوی فنِ قص و موسیقی کی ایسی مالی قدر بخلائیں برپا ہوتی ہیں۔ جن کی دید سے پرتا راہِ فنِ مجہوم مجہوم اُٹھتے ہیں۔

حبیب پہلی مرتبہ جس سرپر کے وقت اس عجیب و غریب منڈی کی بھڑبھڑ سے گزرتا ہوا ادھر اڈوس کی عمارت کے اندر پہنچا اور میں نے اوپر کے ایک کس میں سے وسیع اور ٹیوریٹم پر نظر ڈالتے ہوئے اس مالی شانِ شیخ کو دیکھا۔ جس پر کبھی پولو اور مسینی جیسے فن کار اپنے قص کے کمالات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ تو بعد پر ایک کنگھی سی طاری ہوئے لگی۔ اور میرے دل کی کیفیت میرے وجہان کو فرامیلاں کے لاسکا لاقیٹر کی طرف سے گئی۔ جسے کئی برس پہلے میں نے ویروی کے غنائیہ آئینہ کی سیر کے سلسلے میں دیکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس عظیم الشان تعمیر کو دیکھ کر مجھ پر ایک ہول سا طاری ہونے لگا تھا۔ اور غنائیہ کے دوران میں وہ کہہ لے

عمسوس ہردا تھا۔ گویا ساری فضا اس عمارت کے پر شکوہ ماضی کی داستان سے پڑے

کوڈٹ گارڈن کے ادھر اڈوس میں بھی عظیم فن کاروں کے جلال کی حدیث بہر طر چھائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جینٹل موٹزٹ، بیٹھوون، واگنر، چکریسکی کی روحیں اس ہال کے مغزوں اور محرابوں سے لگی اپنی موسیقی کے ان نعمات کی گرجا کو سن رہی تھیں جو یہاں کی فن پرودہ فضا میں بے ہوش تھے۔ مگر جب تھوڑی دیر بعد چپ چاپ فن کی عظمت کے احساس کو دل میں لے کر ادھر اڈوس سے باہر نکلا تو اپنے آپ کو کوڈٹ گارڈن کی سبزی منڈی کے ٹیبلوں، گارڈیوں اور مزدوروں کے شور و شر سے

میں گھبرا ہوا پا کر یوں محسوس کر رہا تھا۔ گویا میں کوئی فن کار پرستار نہیں۔ بلکہ آؤ گویا کا
 ہتھوڑا پر پادی ہوں۔

(۵)

میں بہار کے اندر اپنی نشست پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بیگ کو چھت کے ساتھ
 دھک دیا ہے۔ کتابیں میری گود میں رکھی ہیں جب جہاز فضا میں پہنچ جائے گا تو میں نہیں
 دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ ہنڈہ گھنٹے بھر کے لئے فرصت کے لمحات میں ہی سیدی
 ٹرنس دوم سلاز ہوں گی۔ فرصت کے خیال کے ساتھ ہی دو دو لمپٹ گنگو میرے ذہن میں
 نمودار ہوئی جو ہیریڈو ٹکسن نے فرصت کے تصرف کے بارے میں اس دن مجھ سے کی تھی۔
 میں پھر سوچ میں ڈوب گیا ہوں۔ میرے تصور میں وہ شام پھر ابھر آئی ہے جس کے
 دھندلکے میں ہیریڈو ٹکسن سے ملا تھا۔ ادا ادا قتل بہادر کی دو ایک دلفریب شام تھی۔ جب
 لندن کے سیاہ فام ریختوں پر کڑھنوں کی بربودی کی نگینیں پیدا کرنے لگی تھی سلور میں ڈانکا ڈانک
 میں کام کے اختتام پر ہونٹل واپس جانے کے لئے میز کے سامنے کھڑا سکاری کے سٹے
 پر غور کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھتا ہوں تو وہ ٹھنڈا دل
 تھے۔ کہنے لگے: اگر فرصت ہے تو چل کر برطانیہ کے ایک نامور ادیب سے ملنے کا مشق
 حاصل کرو: میں نے پوچھا: کون بزرگوار ہیں؟ کہنے لگے: سیریز ٹکسن! بتیں ان
 سے مل کر حدود پر مسترت ہو گئی؟

میں نے سیر ڈیٹکس کی کوئی تحریر اب تک نہ پڑھی تھی۔ البتہ ان کی ایک تقریر بی بی سی کے قدیمہ پاکستان میں عرصہ بھاشنی تھی۔ اور یہ تقریر میرے ذہن میں ایسے نئے محفوظ روگنی تھی۔ کہ اس میں انہوں نے ریاست ہائے متحدہ کے عوام کے افکار خود فکر پر جو روشنی ڈالی تھی۔ وہ محدود خیال انگیز تھی۔

قمارت کے وقت میرے ذہن میں ڈکس کی شخصیت کا کچھ ایسا رعب اور احترام پیدا ہوا کہ میں نے اس کو دھکے کے دوران میں جب تک میں ان کے ساتھ رہا مشکل سے چند فقرے کہے ہوں گے۔ وہ بولتے رہے میں منتا رہا اور پھر باتوں کے دوران میں کتب مینی اور تصنیف کا ذکر آگیا۔ ڈکس نے ازراہ تصنیف مجھ سے پوچھا: کیا تم بھی مصنف ہو؟

میں نے کہا: جناب ارادے تو مصنف بننے کے تھے لیکن حالات نے سماعت نہیں کی۔ جب میں بے کار تھا تو نظم نثر سب کچھ لکھ دیا کرتا تھا۔ پھر ملازم ہو گیا پہلے ایک روزنامے میں پھر ریڈیو میں۔ اب حالت ہے کہ دفتر سے لوٹنے کے بعد اگر گھر کے وحندوں سے کچھ فرصت مل جائے تو یہیں قلم لے کر کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو گھنٹوں کے تردد اور ادوروں کے باوجود دو سطریں کام کی لکھی نہیں جاتیں؟

سیر ڈیٹکس مسکرائے پھر مہرودا دانداز میں بولے میاں صاحبزائے قمار! اس بات سے بے مطلق تعجب نہیں ہوا۔ بلکہ اگر تم یہ کہتے کہ تم گھر جا کر تحریری کام میں دل لگا سکتے ہو تو مجھے شاید حیرت ہوتی۔ بلکہ ممکن ہے میں تماری بات کو بارہ دہراتا۔

سراڈی منڈا گاس کما کرتے تھے کہ جہانی میں وہ شاعر بلاؤنگ کے ہاں اکٹرا دیا کرتے تھے ایک دن ماہرٹ بلاؤنگ اپنے بڑھاپے کی شکایت کرنے لگے۔ اور سراڈی منڈا کچھ تعجب کے عالم میں بولے: "سراڈی منڈا آپ کو دگر سے ہر خدمت کی شکایت نکالنی چاہئے زندگی میں کیا چیز تھی جو آپ کو میسر نہیں آئی۔ حضرت اردو پہ عزت بھی سے آپ بے نیاز ہیں: براؤنگ نے کہا: "برخورد اور چربی ایک جتنی ایسی ہے جو مجھے میسر نہیں آئی اور جس کے میسر نہ آنے کا مجھے بیت قلق ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ میں نے سرکاری ملازمت نہ کی: سراڈی منڈا اور تعجب ہوئے اور بولے: "مگر سراڈی منڈا اس ملازمت کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟ براؤنگ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر حسرت کے انداز سے کہنے لگے: "میاں تم کچھ نہیں۔ اگر میں سرکاری ملازم ہوتا تو میں دن بھر دفتری دھندلوں میں الجھا رہتا۔ اور اپنا کلام حضرت کو ممدوں کی غالبیری حالت یہ ہے کہ میں صبح شکر کتا ہوں دوپہر کو شکر کتا ہوں۔ عصر کو شکر کتا ہوں۔ شام کو شکر کتا ہوں۔ اور جب کسی دوست کے ہاں کھانا کھا کر رات کو دیر سے گھر پہنچتا ہوں تو میں پر قلم دوات اور گانڈ کا تختہ میرے انتظار میں منڈھا ہوا ہے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تھکے ہوئے ہیں کہ میں نے بہت زیادہ کچھ ڈالا ہے ہمیں نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کچھ ڈالا ہے۔ کچھ کچھ کر اپنے تئیں ختم کر دیا ہے۔ اس حکایت کے بعد مشر ٹکسن نے میری طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم براؤنگ کے برعکس ملازم ہو لیکن سرکاری ملازم ہو کر کبھی انسانی حالت براؤنگ ہی کی سی ہے۔ دن مات تئیں جس چیز سے واسطہ ہے اس کا تعلق رکھنے پڑنے سے

ہے اس کام کے بعد فرصت کے چھ لمحات تھیں میرا تھے ہیں۔ ان میں بھی اگر تم بچنے کے کام کو جاری رکھو۔ کراؤں تو تم کام کی کوئی چیز شاید بکھو ہی نہیں سکو گے۔ اور اگر بکھو بھی اور تم کو اپنی زندگی پر عمل و عملِ مسلم ہوگی۔ فرصت کے لمحات کو اگر فرصت سمجھ کر صرف نہ کیا ہوا قبول میں نہ رہنے اور حیات کا طعنت اٹھانے کی انگ سرور چھاتی ہے ۛ

ادھر پیریکٹ پل نکلی کہ فرصت کا وقت کیسے بسر کیا جاتے۔ بخل سے کئے گئے
 ایک آدمی کی تفریح دوسرے آدمی کے لئے عذاب ہو سکتی ہے۔ پہلوانی کے شوق میں ایک
 انسان کھندگی کی کامرانی کے غلام خواہوں کی تحیل نظر آ سکتی ہے۔ دوسرے کے نزدیک
 کشتی کا تصدیق سوانہ روح ہو سکتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کی سب سے
 بڑی تفریح کتب بینی ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں۔ جن کے نزدیک مابہی گیری اس کے
 بھی افضل مشغلہ ہے۔ لیکن فرصت کا بہترین مصرت یعنی بہترین تفریح وہی ہے جس سے
 محنت اور مشکلات سے نکلے ہوئے دماغ کو آسودگی اور اطمینان کے لمحات میسر آئیں
 کہہ لو کہ فرصت کے اوقات میں اپنے دل پر ہجو کو بکا کرنے کے لئے عتقیر مینا کے سوا
 قدرت کی انگوٹھ میں چپے جاتے ہیں۔ بارگ کی سیر ابھی گیری ہی قسم کی تفریح ہے لیکن
 کہہ لو کہ یہ بھی ہیں جنہیں آسودگی انسان سے الگ ہو کر نہیں بلکہ انسان کے
 معاملات سے اہل فطن پیدا کر کے حاصل ہوتی ہے چنانچہ بھائی میں ایسے انسانوں کا
 کہ نہیں۔ بہر فرصت کا وقت دوسروں کی خدمت میں بسر کرنے ہی کو بہترین تفریح سمجھتے
 ہیں۔ ان کے نزدیک تفریح و مسرت نام ہے اس طعنت اور اطمینان کا جو انسانی زندگی

گو بہتر اور دوسروں کی زندگی کو بڑا آسائش بنانے میں حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک طبعی زندگی سے جاگ کر پتھر یا کانہ بدو یا چائے پلنے، جنگل سمورا اور گلشن کی سیر میں مکر جانے کا نام نہیں۔ اس ذہنی لطافت کا نام بھی نہیں جو ایک اچھی نظم کہنے یا عمدہ تصویر بنانے سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ محض اس گہرے طبع کا نام ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی خدمت کر کے حاصل ہوتا ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے جی ہیں جن کے نزدیک سب سے بڑی تفریح یہی ہے کہ کچھ مد کیا جائے پس بیٹھے رہیں تصویر بنانا کہنے ہوئے یا یہ کہ گھر کے اندر تاش یا شطرنج کھیل لی جائے۔ یا دوستوں کے عین میں گپ بانگی ملے۔ انگلستان میں تو ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کا واحد ذریعہ تفریح پب کی سیر ہے۔ جہاں مل بیٹھنے کے لئے شراب کا گلاس محض ایک ہاندہ ہے۔ وہ مقصد ایسی خوش وقتی ہے جہاں ایک اجنبی سے دوسرا اجنبی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں کا قصد رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک تہنیں تفریح گویا مذاقت انسانی ہے :

جس دوران میں سر ہیرلڈ ٹیلکن مجھ سے بات کر رہے تھے میں جلدی جلدی پچ رہا تھا کہ ہمارے ہاں فرصت کے اوقات کے صحیح مصروف کا تصور کیا ہے۔ ہم میں سے کتنے آدمی ہیں جن کو یہ معلوم بھی ہے کہ وہ رخصت کا دن اتوار کا وقت صبح سے کرے شام تک کس طرح بسر کریں گے۔ کیا ہماری ایک بہت بڑی اکثریت کے لئے چھٹی کا مفہوم سڑک کے پی نہیں رہ گیا ہے کہ صبح بہت دیر سے اٹھا جائے۔ جماعت نہ

بنائی جلتے۔ اوساگر ممکن ہو تو سارا دن طویل بیماری سے جانبر ہونے والے مریض کی طرح
 بستر پر گر ڈھین پیتے پیتے گزرو یا ہائے۔ شاید اس میں ہمارے ہاں کے مخصوص حالات
 نامساعد و محکم کام کی زیادتی، تفریح کے مواقع کا فقدان اور دوسری مشکلات کا بہت سا
 دخل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ہاں فرصت کے لمحات کو بسر کرنے کا کوئی ڈھنگ
 نہیں جس کی وجہ سے ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ زندگی میں خوشی سے محروم رہتا ہے
 اور پھر لمبے برٹریڈرسل کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو کہنی ہنسنے پہلے میں نے ان سے خوشی
 کی تعریف کے سلسلے میں سنے تھے۔ وہ بی بی سی کے جنرل اور سیزر سروس میں ایک تقریر
 کرنے کے لئے آئے تھے۔ جو انسانی زندگی میں خوشی سے متعلق تھی۔ اس تقریر میں انہوں
 نے اس بات کی وضاحت کی تھی۔ کہ کس طرح بعض اوقات خوشی کے تمام مادی وسائل
 صحت، مدد یہ خود مختاری کے باوجود انسان محروم رہنا خوش رہتا ہے۔ ان کی تقریر ختم
 ہوئی۔ اور وہ سٹیڈیو سے باہر نکلے تو میں نے آگے بڑھ کر ان سے اپنا تعارف کرایا
 اور ہم باتیں کرتے ہوئے باہر کی طرف چلے گئے لگو کے میدان میں ان کی تقریر کا ذکر چھڑ گیا
 تو وہ کہنے لگے: ”بعض حکماء کا خیال ہے کہ لوگوں کو زندگی میں اس لئے خوشی میسر نہیں
 آتی کہ ان کے سامنے کوئی مقصد حیات کوئی نظریہ مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں ایک
 سیدھی سی بات بتا دوں۔ خوشی کے لئے کسی بلند پایہ نظریے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ
 دوسروں کو مادی خوشی سے احتراز کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہ خود دوسروں کی خوشی کے حصول سے پریشانی
 کے بغیر انسانی زندگی کی حواست کچھ ہائے اور دنیا کی رنگینی بے کیفی میں بدل جائے اور

اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی تو پھر زندگی جلد فرحِ انسانی کے لئے محض بیزاری کا دوسرا نام ہو کر رہ جائے گی۔

جب وہ گاڑی میں سوار ہونے لگے تو ایک ساعت تک کہہ رہے تھے کہ شاید میری تقریر کو سنا ہو گا۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ انسانی خوشی سے بڑی معمولی مگر بنیادی باتوں کا تعلق ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے بیوی بچوں سے خوش ہے، اپنے کام کاج میں کامیاب ہے اور اسے دن اور رات کی تبدیلی اور موسم کی آمد و شد میں ہلکے میٹر آتا ہے تو پھر اس کا مذہب اور فلسفہ حیات کچھ ہی ہو وہ زندگی میں خوشی سے ضرور بہرہ ور ہو گا لیکن اگر اسے اپنی بیوی کا پسند ہے، بچوں کا شور و برداشت نہیں، دفتر سہانوں سے دن کے وقت رات کی تنہا اور رات کو دن کی آواز ہے تو پھر اسے کسی بلند یا عام میاں نہ نظرینے کی ضرورت نہیں بلکہ ذہنی علاج کی ہے۔

اور پھر ایک دن دفترِ عدنان حاس لے کچڑا کر کامپنن میکینری کے اٹارے گئے۔ جہاں دو بائیں گفتگو میں انسانی خوشی کا معاملہ پھر زیر بحث آ گیا۔ میکینری اپنے تجربات کی روشنی میں ہمیں یہ بتانے لگے کہ جیسے کا لطف کے کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ آناؤٹی کا اور پیچہم تبست کے بغیر زندگی میں لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کو اپنے کام کاج اپنی نقل و حرکت اپنی سوج بھار میں خود مختاری حاصل نہیں۔ وہ زندگی کو جتنی لطف نہیں دے سکتے۔ زندگی کے لطف کو دوبالا کرنے کا دوسرا ذریعہ ان کے نزدیک غلبہ تھا۔ ان کا خیال تھا۔ عمر کی ایک منزل پر پہنچ کر انسان میں غلبہ اور غلبہ کا

مان مختم ہو جاتا ہے۔ یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ اگر اس وقت انسان تختی کے
 فتنے سے تھی ہو جائے تو وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے دلچسپ پہلوؤں سے
 بے گانہ و بے خبر ہو کر جینے کے لطف سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی اہستہ
 اہستہ بے کیف ہو کر بے زاری کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ چھوٹی
 کی باریت معلوم کرنے کے وہ پہلے رہتے ہیں۔ اپنے ارد گرد کی اشیاء سے دلچسپی رکھنے
 کی وجہ سے ان کی دھڑ سے ان کی حقیقت کو بھگنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں زندگی
 کے ساتھ ایک ہستیا کی پیدا ہو جاتی ہے جس سے جینے کا لطف بھی کم نہیں ہوتا۔

پھر اسی دو دہائی میں ایک دن اپنے کام کے سلسلے میں تحقیق و جستجو کے لئے
 برشل پمپتھ پہنچا۔ اس سفر میں بنی بنی سی کے ایک انفرمیرے ہوا تھے۔ شام کو ہمیں شہر
 کے ایک نامور ریاستدان نے جو پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ کھانے پر بلا رکھا تھا۔ کام
 سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم وائٹ ہیریبل آؤٹ ک فٹ کے مکان کی طرف چلنے
 کے لئے تیار ہوئے تو میرے ساتھی نے کہا کہ ہم راستے میں کچھ تاریخی مقامات کی
 سیر بھی کرتے چلیں۔ ہم پھر پتے پھرتے فریڈم پارک میں جا نکلے۔ جہاں میرے ساتھی
 نے باغیچے میں مجھے دو تاریخی کتبہ دکھایا جو تین صدی پیشتر شہر کے لوگوں نے
 اس جنگ کی یادگار کے طور پر بنایا نصب کیا تھا۔ جس میں ان کی مٹی بھر جامتے
 اپنی بہت اور ہر اندری سے بادشاہ کے لشکر کو شکست فاش کے ساتھ جھاگنے پر مجبور
 کر دیا تھا۔ میرے ساتھی نے مجھے اس کتبے کی لاطینی عبارت کا ترجمہ کر کے سنایا لکھا تھا

اللہ کی ذات انسان کے لئے بہت بڑی پناہ ہے۔ اور پھر ہم ان الفاظ کے گہرے معانی پر غور کرتے ہوئے باریکین کے ساحلی میدان میں پہنچے۔ جہاں ہلکے فائدے کے کچھ خیر بھری سفر کی یاد گار کے طور پر دو من طرف کے ایک سنگی دروازے میں "سنگ سے منگلاؤ" نصب ہے۔ جو اس امر کا شاہد ہے کہ مذہبی مظالم اور جو رد و تہدی سے گھبرائے ہوئے لوگوں نے جب ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو کوئی دنیا بانی کے لئے اونیائوس کے پانیوں پر اپنے سینے سے فلادز کو چھڑا تھا تو پلیمتھ کے شہریوں کی دہائیں ان کے شامل حال تھیں اور پھر ہم لب ساحل سمندر کے وسیع و عریض میدان میں پہنچے جس کے وسط میں سر فرانسس ٹیک کا بت نصب ہے۔ اس ذات شام جو کچل تھی۔ اور سر و تفریح کے لئے آئے ہوئے بچے وہاں جا رہے تھے لیکن پلیمتھ کا ایک فوٹبال اپنے ساتھ تبدیل سے پکڑ کر اکیلا محبت کے نیچے سفید پتھر کے پتے سے پیڑ لگائے کھڑا ہیں اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ قریب پہنچے تو مجھے اس بچے کے مصمم چہرے پر ایک ایسی دلغریب جاذبیت نظر آئی کہ میں اس سے کلام کے بغیر وہ درسا۔ میں نے اسے اپنی طرف دیکھنے پر کہنا: بیٹے اس مجھے کے بارے میں کیا تم مجھ سے کچھ نہ کہو گے؟ بچے نے بے اعتباری کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ اور پھر نکلیں نیچے جھکا میں۔ میں نے بات کو آگے چلانے کے لئے پھر کہا: اچھا یہ بتاؤ یہ مجھ سے کس کا ہے؟ میں نہیں کہہ سکتا بچے کے پاس اس سوال کا جواب تھا نہیں۔ لیکن اس نے خود اپنے بازو پھیلا کر اس پتے کو یوں پکڑ لیا۔ مگر یہ مجھ سے اس کی ملکیت تھا۔ اور میں اسے اس سے جھین کر کسی اجنبی ملک میں

ے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور پھر میں نے سراٹھا کر اوپر سر فرانس ڈریک پر نظر ڈالی۔ جس کا نبت ایسا بھر کی وردی میں ملبوس دنیا کے گلوب پر ہاتھ رکھے دور نماصلے میں جیسے کسی بھری جہاز کو دیکھنے میں مصروف تھا میں نے جتے کے چہرے کو غور سے دیکھا تو بے ایک ساعت کے لئے اس پر وہی تبس وہی غور و خوض نظر آیا جس کا ذکر مجھ سے کامپٹن میکنزی نے کیا تھا اور میں سوچنے لگا کہ کیا یہ تبس ہی کا نتیجہ تو نہیں تھا کہ سر فرانس ڈریک سفر کی مصروفی اور ان دیکھے راستوں کے خطرات کے باوجود انسانی دنیا کے گر و بگر لاشٹنے کے لئے باد بانی ہما ز پر باہر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور جب وہ ملے تھے تو شہرت، عزت اور دولت ان کے قدم چوم رہی تھیں۔

جس وقت ہم مسٹر آرنلڈ کے ہاں پہنچے۔ شام کا وحند لکھا ہوا تھا چھا گیا تھا اور خود مسٹر آرنلڈ ہمارے انتظار میں امتحان کے آگے کھڑے پائپلی رستہ تھے بحر کے اعتبار سے وہ ضرور دین رسیدہ ہوں گے۔ لیکن ان کا چہرہ کچھ ایسا شاداب تھا کہ وہ کوئی پہلا برس سے کم دکھائی دیتے تھے۔ اس عمر میں انہیں زندگی کے اتنے تجربات عین تر کئے تھے کہ وہ اپنی باتوں کے دوران میں مجھے سیاستدان، فلسفی، نقاد، ستارح، تاریخ دان سمجھ کر کچھ دکھائی دے رہے تھے

گفتگو کے دوران میں میں نے لمبی تھک کی بند گاہ کے تدرقی حسن کی تعریف کی مسٹر فٹ میرے فقراتوں سے یوں ہلکے جیسے میں نے انہیں ان کے آواہم جہانی کے کسی سناٹے کی یاد دلادی ہے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ اگلاس کر چھوڑ کر کسی گرمی صبح

کے عالم میں پائپ ہرنٹوں سے لگائے پھر پھٹکتے ہوئے آتش ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک وقفے کے بعد انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

”میاں صاحبزادے ہمارے ہاں ایک فقرہ بہت مشہور ہے کہ سن رسیدہ ماوراء طہمتہ مندر کے کنارے بیٹھی ہے۔ یہ فقرہ ہمارا اپنا نہیں۔ بلکہ تم ایسے کسی خود ماوراء کا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت صحیح فقرہ ہے۔ طہمتہ کے رہنے والے جب کبھی ایک دوسرے سے کسی اجنبی سرزمین پر ملتے ہیں تو ان کے دل کی کیفیت وہی ہوتی ہے جہاں جائے بھائیوں کی اتفاقہ ملاقات کے موقع پر جن کوئی ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے شہر سے جنت ہے وہ بالکل ویسی ہی ہے جیسے ماں سے بچوں کو ہوتی ہے۔ مجھے طہمتہ سے جو عشق ہے اس کا حال خود مجھ پر کوئی گیارہ بارہ برس ہونے ایک دن اچانک کھلا تھا۔ ۱۹۴۱ء کے اوائل کی بات ہے جمعہ کی شب تھی۔ میں کورنوال میں گھر سے کوئی بارہ میل دوا ایک گاڑی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا طہمتہ کی طرف سے شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ جن سے سُرخی کی تیز رفتار دہری آسمان سے زمین تک پہنچ رہی تھی۔ وسیع فضا میں صیب تصویریں بنا رہی تھیں معلوم ہوتا تھا طہمتہ اس بد گیسوگ میں مل کر کیسرا کہہ رہا ہے۔ میں اسی وقت شہر میں پہنچا اور جب میں نے پٹی پٹی آنکھوں سے اطراف میں دیکھا تو مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ طہمتہ سے مجھے کیسا ملامت عشق تھا۔

پہلے تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ تمام ماؤں نشان صفحہ ہستی

سے نابود ہو گئے ہیں۔ وہ حسین گلیاں اور گوپے جن میں میرا بچپن گزرا تھا۔ وہ دل فریب
 شکرکس اور شاہراہیں جن پر میں طالب علمی کے زمانے میں دن میں چار مرتبہ ہفت کھیلنا گزرا
 کرتا تھا۔ سب یوں مٹ گئے ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ میرا دل اس خیال سے بٹھنے لگا
 کہ ان جاں پر درحیروں کی وید سے اب میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی ہیں لیکن
 پھر یک لخت ایک محکم اور حیات افزہ خیال بچھتے ہوئے دل کی تاریک گہرائیوں میں
 سے امید ورجا کی کرن بن کر میرے دھندلائے ہوئے ذہن پر پھیلنے لگا۔ یہ خیال کہ
 رہا تھا کہ سب کچھ مٹ جانے پر بھی سب کچھ نہیں مٹا۔ طبعیت نہیں مٹا۔ طبعیت موجود ہے۔ اور
 جب تک طبعیت موجود ہے۔ ان شرکوں شاہراہوں گلیوں کوچوں، عمارتوں، گرجاؤں
 کی بربادی کا رنج نہیں۔ جو کبھی اس سرزمین کی رونق تھے۔ اگر طبعیت زندہ ہے تو جرمین
 ہوا بازوں کی غارت گری کے باوجود سب کچھ پھر زندہ ہو جائے گا۔ پھر جاگ اُٹھے گا
 میرا خیال غلط نہیں تھا۔ طبعیت زندہ تھا۔ سب کچھ زندہ تھا جس یوں مجھ کو کہ یہ سب کچھ
 کچھ عرصے کے رہ سکیگا تھا۔ اذگھ سا لگتا تھا۔ آج تم نے خود اپنی آنکھوں
 سے دیکھ لیا کہ یہ سوئی ہوئی دنیا جب بیدار ہوئی ہے تو اس کی رونق کا کیا عالم ہے؟
 مشرق نے پاپ کا کش لگایا۔ پھر کٹر کی میں سے باہر کی طوفان دیکھتے ہوئے
 بولے: "قدیم زمانہ میں ایک کمدت تھی۔ کہ شہر سے انسان بہت کچھ سیکتا ہے۔ اس
 شہر نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ میرے ساتھیوں کی تعلیم میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے
 ہمارے شہر کے بچے آج بھی طبعیت کی داستان سے اپنے ملک کی تاریخ اور اس سے

باہر کی دنیا کا بہت سا مال جان رہے ہیں؟

(۶)

جہاز کے پچھلے شور برپا کرنے لگے ہیں۔ اس شور نے میرے تصور کی دنیا کو ہم پریم کو دیا ہے۔ اُد میں طبیعت کے ساحل سے کھینچ کر پھر وہیں جہاز کی نشست پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں سے روٹنٹ قبل میرے تصور مجھے زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد کر کے سٹریٹ کی قیام گاہ تک لے گیا تھا۔ مجھ کو جہ میں تصور کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس آیا ہوا تو مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا ہے کہ میرے ساتھ کی نشست پر ایک صاحب یوں چپ چاپ آکر بیٹھ گئے ہیں کہ مجھے اپنے وحیان میں ان کی آمد کا تپہ تک نہیں پہلا۔ ان کے ہاتھ میں ڈی ٹیلی گراف کا پرچہ اس امر کا شاہد ہے کہ یہ انگریز ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لندن ہی کے رہنے والے ہوں۔ تو کیا پھر ان کے باتیں شروع کروں؟ شاید وہ یہ جان کر خوش ہوں کہ مجھے بھی لندن کی گلیاں اور کوچے، سڑکیں، بازار ہیں اور ٹریب، چوک اور کافے، عمارتیں اور محلات، تھیٹر اور تفریح گاہیں۔ کتب خانے اور عجائب گھر باغات اور مین، دریا اور پل، اسی قدر مرغوب ہیں۔ جس قدر انہیں شاید میرے تاثرات ... لیکن انہوں نے دفعتاً اخبار کھول کر پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اپنے ارد گرد کوئی عزت پسندی اور کم معنی کا حکم حصار تعمیر کر دیا ہے۔ شاید وہ میری خلوت کا احترام کر رہے تھے۔

جہاز کو حرکت ہوئی ہے۔ اور اب ہم اس مقام کی طرف پہنچے ہیں جہاں سے دوڑ کر ہمارا طریقہ فضا میں بلند ہو جائے گا۔ ٹیلی ویژنگ کا پرچہ اب تک میرے ساتھی کے چہرے پر ہے۔ وہ یا تو کسی بہت دلچسپ خبر کے مطالعے میں پورے اٹھناک کے ساتھ مستغلا کھوئے ہوئے ہیں یا پھر سو گئے ہیں۔ میں رفیع استعباب کے لئے چھت کے ساتھ لگے ہوئے بلیک کوریک نظر دیکھنے کے ہانے ان کی طرف انگلیوں سے دیکھنے لگا ہوں چوٹی میں بندھا ہوا میں زیادہ جنبش نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میری نظریں اخبار اور ان کے چہرے کے درمیان پہنچ گئی ہیں۔ اور میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ سوئے نہیں اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جہاز اب دوڑنے لگا ہے۔ تیر کی طرح نکلا چلا جا رہا ہے۔ میں کھڑکی میں باہر کی طرف جھانک رہا ہوں۔ جہاز کا منظر کا لطف سے رہا ہوں ٹارگٹ پر رے کے جھوٹے جہاز اور دوڑ و دم کی عمارات، شہر پر کھڑی ہوئی کاریں سب بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے کر جاگ رہی ہیں۔ کچھ جہاز اور عمارات ایسی بھی ہیں جو ریلوے کی طرف پکلی چلی آ رہی ہیں۔ گویا ہم سے ٹکرا جائیں گی۔ اور اب زمین ہم سے الگ ہو کر نیچے کو جانے لگی ہے ٹارگٹ کہیں پیچھے غائب ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے مدد گاہ تک پھیلا ہوا ایک دلفریب بنزرا ہے جس پر بارش کے پانی کے چھوٹے چھوٹے نمائے مضید کیڑوں کی طرح ادھر ادھر کچھ ہوئے ہیں۔ اور اب ایک لذت نامہ نظارہ دھوئیں میں کہیں غائب ہو گیا ہے بلو لوں نے ہمارے جہاز کو یوں پیٹ میں لے لیا کہ میں محسوس کرنے لگا ہوں گویا ابر کی مہی سنبڑ ریشمی چادر ہمارے چاروں طرف تھی ہوئی ہے جس میں نگاہیں کوشش کے باوجود کوئی

خیر پیدا نہیں کر سکتیں۔ مجھے مایوسی ہی ہونے لگی ہے۔ شاید لندن اب دکھائی نہ دے گا۔ شاید وہ کہیں بہت دور پیچھے رہ گیا ہے۔ شاید ہم دوبارہ انگلستان کے اوپر پہنچ گئے ہیں۔ میں تاسف کے احساس کے ساتھ پیر پیچھے بٹ گیا ہوں۔ نیشٹ کی پشت کے لگ گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں بابر حجاز کلبے کا ریات ہے۔

لگا چانک جہاز مار کی اس کردہ دھڑکی چا در کر چکر ایک نعت کھلی نغمائیں باہر آ گیا ہے۔ بادلوں کے سفید پہاڑ عجیب و غریب شکلیں بناتے تیزی کے ساتھ ہلکے دانتیں بائیں گز رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے میری نظر کے سامنے ایک دلنریب نظارہ ہر طرف کھرا ہوا ہے جس دیکھ کر دہا ہل کر دیا گئے ٹخنیز کا پانی گھٹیل ہوئی چاندی کی طرح چمک چمک کر آنکھوں کو خیر و کر رہا ہے۔ اور اس کے دونوں طرف لندن کی عمارتیں پراجھان کھڑی ہمارے جہاز کو اوداع کہہ رہی ہیں۔

میرے پیچھے کا قندوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی ہے۔ غالباً میرے سامنے نے چہرے سے اخبار کو ہٹایا ہے۔ اب اور کھڑکھڑاہٹ ہوئی ہے۔ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ غالباً ڈ اخبار کو تھک رہا ہے۔ اب میرے پیچھے کچھ تاہیل می ہر گئی ہے۔ غالباً میرا سامنے نکلا ہے ہر کشش سے کچھ کر میرے پیچھے کمر ٹک کی طرف تھک گیا ہے۔ وہ میرے اس قدر قریب آ گیا ہے کہ میں اس کے تنفس کی آواز کو سن رہا ہوں۔

اس وقت جہاز لندن کے بازاروں اور باغیچوں کے اوپر سے گذر رہا ہے۔ خیر! اور ٹخنیز می ترچھی ٹکریاں اچھ سے ادھر یوں لی کھاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

گویا وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہا کل گئی ہیں۔

”کتنا حسین نظارہ ہے۔“ یہ فقرہ اضطرابی طور پر میرے منہ سے نکل گیا ہے۔

”لندن کی کیا بات ہے؟“ اور یہ بے ساختہ جہانگیر متوقع طور پر پیچھے سے میرے

کاؤل میں پہنچا ہے۔

”کیا فضا سے لندن کا منظر ہمیشہ اسی قدر دلغریب ہوتا ہے؟“

”میں نے اسے ہمیشہ ایسا ہی دلکش پایا ہے۔ لندن اور اس کے مناظر کبھی نہیں

بدلتے۔“

اب پھر جہاز بادلوں میں چلا گیا ہے۔ اور وہی ییشی جاوہر ہمارے اوپر گرتی گئی۔

ہے میرے پیچھے کاغذ کی سائتہ کھڑکھڑاہٹ پھر سنائی دے رہی ہے شاید میرے

ساتھ کی سیٹ پر کوئی بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب بادل زیادہ گہرے ہو گئے

ہیں۔ جہاز کے اندر تاریکی پڑھنے لگی ہے۔ میں مایوس ہو کر پھر بجے بٹ گیا ہوں +

شبِ طلوعِ پیرس

(۱)

پیرس میں یہ میری آخری سپرہ تھی۔

جاونج چکے تھے اور میں ریسکورڈز کے محلے کے افراد کو اورادے کئے کے لئے
ریسکو کی عمارت کی چوتھی منزل پر مینارڈ کلاٹرل سے اپنی آخری ملاقات کے غصے پر
خصت طلب کروا تھا۔

مینارڈ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں ریسکورڈز کا کام کرنے کی مرضی
سے پہلی مرتبہ پیرس میں وارد ہوا تھا۔ مینارڈ انہی دنوں مشرقی صیغہ کے طبعی صفر کے بعد
آٹائی لینڈ کے تعلیمی مسائل پر ایک ریڈیو پروگرام تیار کر کے بنایا جا رہا تھا۔ پروگرام
کی تشکیل کے دوران میں اس نے ایک رنگین غم بھی اس ملک کے باشندوں اور ناظر کے
معلق تیار کیا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے ریسکورڈز کے محلے کے افراد جب نیچے سٹوڈیو میں

جس ہولے قریب بھی ان میں موجود تھا۔ تصویر کے آخری سچے میں ایک منظر ایسا آیا جس کی حد پر ناظرین جن میں زیادہ قد اور ڈوڈیون میں کام کرنے والی رنگینوں کی تھی۔ تیسرا دستہ کے مشترک جذبات کے ساتھ چمک اٹھے۔ بظاہر یہ ایک عام فہم کا منظر تھا۔ جو ہمارے ہاں برسات کے زمانے میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے معلوم ہوتا تھا گشتا بھی ابھی برس کر کھل گئی ہے۔ ادھاب چھٹے ہوئے باروں کے ایک دیوتا مت ٹکڑے کے ملنے سے دھان کے پودوں کی کیا ریاں پایاب پانی کے تختوں کے اوپر سسراقی ہوئی ہمارے سامنے لہرا رہی ہیں۔

تصویر دیکھی جا چکی اور میونارڈ پر وہ جیکٹر پودے اور دوسرے کچھ لہوئے ساز و سامان کو سٹوڈیو میں کھینچنے لگا۔ تو اس امر کے باوجود کہ میرا اس سے محض چند منٹ قبل تعارف ہوا تھا میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ منظر میں ایسی کیا چیز تھی جس سے دیکھنے والے یوں چمک اٹھے تھے۔ میونارڈ نے میرے سوال پر تعجب ہو کر کہا: "شاید آپ نے بادلوں کی ترتیب پر غور نہیں کیا۔ ہمارے ہاں سرد ملکوں میں بادلی عموماً بڑے بے کیفیت ہوتے ہیں۔ یہ عموماً پہلے جھلی کی صورت میں آسمان اور زمین کے درمیان تن جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ایک دبیز چادر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بادلوں کی ایسی سین شکلیں جن میں وہ گرم ملکوں میں آؤ آؤ کر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں کب دیکھنے میں آتی ہیں؟"

میونارڈ کی بات سے مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہوا کہ اگر کوئی مطلع

اہل فرنگ کے لئے اس قدر سوان روح کیوں جوتا ہے۔ اور سر و ملکوں میں بسنے والے
 لوگوں کو بارانِ رحمتِ فذابِ الہی کیوں دکھائی دینے لگتی ہے۔ مجھے ان سے کچھ
 ہمدردی سی پیدا ہونے لگی ہے۔ کہ وہ ان حسین مناظرِ قدرت کی دید اور ان روحان
 انگیز کیفیات کے احساس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جو ہمارے ہاں موسمِ شنگال میں
 رنگا رنگ بادلوں کی آمد و شد سے ہر طرف نظر افروز ہوتے ہیں۔ اور پھر میرا دھیان
 اپنے ہاں کی بارش کی طرف گیا۔ میری نظر میں وہ دلنوا مناظر پھرنے لگے۔ جن کی وجہ سے
 یہ سال ہمارے ہاں فی الحقیقت موسمِ بہار کا مترادف ہے اور میں ایک غیر راوی
 حتمی کے ماتحت میزبانِ ذکر کو بتانے لگا کہ اڈتے ہوئے بادل، اٹھتی ہوئی گھٹائیں
 خاک جھونکے، ٹھنڈی پھواریں، اٹھتا سبز و برے بھرے شہار، کوٹلوں کی کوک، پرندوں
 کی چھپا ہٹ۔ کچوان اور جھوٹے، باغات کی رونقیں، کنارِ راوی اور لبِ جبے نکلوان
 کے جھوم اور پھر تاریک راتوں میں دوپہر کی جھلکیوں کی آنکھ چھپائی، مینڈکوں اور
 جھینگروں کے خوش آئند نعنائیں اس رومان انگیز موسم کو ہمارے ہاں کس قدر نفرت
 کس قدر دل نواز، کس قدر روح پرور بنا دیتے ہیں۔ اس ذکر کے آتے ہی میں خود
 سوچ میں پڑ گیا کہ بہار جس کا ذکر شعراء اپنی نظموں اور ادیب اپنی تحریروں میں اتنے
 شد و دہ سے کرتے نہیں تھکتے، آخر ہمارے لئے کیا خصوصیت رکھتی ہے۔ اور اس کا
 ہمارے دل کی گونجوں میں کتنی سوئی ہوئی انگلیں، کتنی خفہ آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں۔
 جن کے حصول کا احساس زندگی میں ایک نئی حرارت ایک نیا جذبہ پیدا کر دے۔

یونارڈ اور میں باتیں کرتے اور اس کے کمرے میں آگئے۔ آسمان پر چھائے ہوئے
 بادلوں میں سے اس وقت پانی برسے لگا تھا۔ اوائل خزاں میں تجارت ہونے والے
 ورختوں کی نکل ٹہنیاں تیز ٹھنڈی ہوا کے سامنے کانپ رہی تھیں۔ اور نیچے یونیورسٹی کیمپس
 کی وسیع و طویل شاہراہ موسم کی خرابی کے ہاتھوں بے رونق اور اجاڑ نظر آ رہی تھی۔
 یونارڈ نے کافی سنگرائی اور پھر سگریٹ کی ڈبیا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”میں خود انگلستان کا رہنے والا ہوں۔ جہاں کے موسم کا بے شکا بن مشہور ہے لیکن مجھے
 پیرس کے یرون حد درجہ ناپسند ہیں۔ ان دنوں موسم کچھ ایسا غم سرور اور فسرہ ہوتا ہے
 کہ خود انسان کی روح تک بھیگ جاتی ہے۔ اور زندگی کے نکھتے ہوئے شعلے کو
 زندہ رکھنے کے لئے ہزار سبب کرنے پڑتے ہیں۔“

موسم سرما کا ذکر آیا تو پاکستان کے جاڑے کی بات چھوڑ گئی۔ جس کے دوران میں
 نہیں لیکن کشمیری چائے اور پشادری قہوے کے ذکر کو بے بیٹیا اور یوں بات سے بات
 نکلتی اور بھلائی کہیں سے کہیں چلی گئی۔ اور ہم دفتری کام کی طرف توجہ دینے کی بجائے
 دوسرے کھانے تک اپنے اپنے تجربات کے مابین میں کچھ ایسی دلچسپی اور بے تکلفی
 کے ساتھ کبھی رہے۔ گویا ہم دوا یے دوست تھے جو طویل مفاہقت کے بعد آج
 اتفاق سے ایک دوسرے سے چند لمحوں کے لئے آن بیٹے تھے۔ یہ یونارڈ سے میری
 ملاقات کا پہلا دن تھا۔

آج جب کہ میں پیرس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے یونارڈ

کو اوجاع کہنے کے لئے نہرست میں سب سے آخر میں رکھا جڑا تھا۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے کی نیت سے اٹھنے لگا تو لیونا رڈ نے کہا: میں تم سے یہ دیکھنا تو بھول ہی گیا کہ تم نے پیرس کے قیام کے دوران میں کیا کچھ دیکھا۔ بلکہ یوں کہو کہ کیا کچھ نہیں دیکھا؟

میں اپنے حافطے کو ٹٹونے لگا کہ پیرس میں میں نے کیا کچھ دیکھا تھا۔ اور کیا کچھ ایسا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن دیکھ نہیں پایا۔ اکتوبر سے لے کر اپریل تک مجھے پیرس میں چار مرتبہ انا پڑا تھا۔ یہاں میرے قیام کی مجموعی مدت ایک ماہ کے قریب تھی۔ اس دوران میں میں نے جو کچھ دیکھا تھا لیونا رڈ کے سوال کے ساتھ ہی اس کی تصویریں میرے ذہن میں تیزی سے گھومنے لگیں۔

وہ اکتوبر کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ ہمیں روم سے چلے ہیں گھٹنے ٹیک کر تھے۔ جہاز کی روشنیاں گل تھیں۔ مسافرین میں کچھ ایسے فرق تھے کہ طیارے پر مدہوشی کا سماں طاری تھا۔ ٹیکوں کے چم شاور مشینوں کی خفیف تھر تھراہٹ کے سوا کسی بات سے چہ نہ چلتا تھا۔ کہ ہم زمین سے دور انسانی بستیوں اور اپنے ہم جنسوں کی دنیا سے پرے فضا کی وسیع پہنائیوں میں تین سو میل کی رفتار سے آگے کو لپک رہے ہیں۔ اپنی نشست پر بیٹھنے اور لیٹنے کی مشترک کیفیت میں الجھا جڑا سامنے کی گھڑی پر چھت کے درمیان کی مدہم تہی کی خفیف روشنی کی مدد سے وقت معلوم کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ شاید گیارہ کا عالم تھا۔ اور اب سے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد

ہمیں منزل مقصود پر پہنچ جانا تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ سر جوڑ کر باہر
 جھانکنے کی کوشش کی۔ مگر نیلے آسمان کی چادر پر ٹکے ہوئے سنہرے اور دودھیلا
 تارے ہر سو جھللا رہے تھے۔ جن کی مجھ روشنی میں فضا کی گہری تاریکی رات کے حُسن
 میں ایک دوامان انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ ایک مستقل سکون، ایک ابدی اطمینان
 ہر طرف حکمران تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہمارا جہاز مکشاں شہاب ثاقب اور مریخ و مشتری
 و زہرہ اور دوسرے اجرام فلکی کے ہمارے میں جاؤں رہے۔ اور ہم زندگی کے ان
 جاگداز مسائل کی دستبرد سے ہمیشہ کے لیے معصوم ہو گئے ہیں۔ جو عالم اب خاک
 و باد پر بوڑا زل سے حکمران ہیں۔ مگر ایک لغت دور نیچے کی طرف روشنی جھلکنے لگی اور
 جہاز کی رفتار اور مشینوں کی حرکت میں ایک مبہم سی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ پھر اندر کی جتیاں
 روشن ہو گئیں۔ سونے ہوئے مسافروں کے ساکت اجسام میں حرکت کے آثار منظر
 آنے لگے اور جب ایک ساعت کے بعد سامنے دروازے کی عیشانی پر ”پسٹیاں
 باز ہو چکی“ اور سگرت نوشی بند کے حودت روشن ہو گئے تو میں سمجھ گیا کہ میں پھر
 جہاز کی مشینوں کی طفیل ایک مرتبہ اسی مادی دنیا کو لوٹ آیا ہوں۔ جس کی برہنہ فضا
 سے مجھے اٹھا کر اس نے چند گھنٹے قبل ایک نئی کائنات میں پہنچا دیا تھا۔ چٹی بانڈ
 کے بعد میں نے پھر ایک مرتبہ شیشے کے ساتھ سر لگایا۔ باہر ایک ساعت پہلے کی
 تاریک دنیا اب روشن ہو رہی تھی۔ خاکدان زیریں کے میوے مانع ہوتے جا رہے
 تھے۔ سامنے ایروڈروم کی دھندلائی ہوئی عمارت پر ”اولی“ کے حودت تیز و پہلی

روشنی میں جگمگا رہے تھے۔

جب انولید کے ہوائی ٹیشن سے ٹیکسی میں سامان لا کر میں اپنے ہوٹل کے لئے ریو دی گریموں کی طرف چلا تو میں دیکھ رہا تھا کہ نصف شب کے باوجود پیرس کی سڑکیوں اور گلیوں میں ایسی رونق اور چہل پہل نظر آ رہی تھی جیسے رات کے بجائے ابھی دن ہے۔ آمد و رفت کا سلسلہ یوں جاری تھا گویا زندگی کے کاروبار کو آدھی شب نے سرمو بہیم نہیں کیا۔ معلوم ہوتا تھا سا دا پیرس سڑکوں اور بازاروں میں نکل آیا ہے۔ اور زندگی کی رنگینیاں اور دلچسپیاں کو کسی بھگدڑ اور فزقہری کے بغیر احمیان اور لمبی سے سمیٹنے میں مصروف ہے۔ ٹیکسی جب دریائے سین کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ کے دی آرسی کے ہائے اہلی غیسو نال کے سامنے سے گذر کر دریا کے پرے پار پلاس دی لاگنکارو میں پہنچی اور میں نے اپنی سمیٹ سے اس وسیع چوک میں ملحق ہوئی روشنی کے منور ستروں اور ترپتے ہوئے پانی کے روشن فواروں کے در و گرد و احار و حر و دثر کی ہوائی تیور و رفتار کا دل کے لاجتنا ہی بہیم کو دکھیا تو مجھے اندازہ ہونے لگا۔ کہ پیرس کی لاطیں کس قدر جان دار و کسی زندہ و پائندہ ہیں۔ سڑکوں اور بازاروں کی گھاگھی کہ دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ نصف شب کے باوجود شہر میں کوئی آدمی سوتا ہوگا۔ زندگی، حیات بخش اور حیات آفریں زندگی، اپنی پوری تابانی اپنی پوری دلکشی کے ساتھ سرطوت بندہ لگن بھی۔

دوسرے دن کام کے غارتے پر سواری کے ذریعے ہوٹل واپس جانے کی بجائے

میں نے پیرس کے جائزے اور سیر کی خاطر اپنے معمول کے مطابق پیدل چلنے کا ارادہ کیا۔ اوبینیو کلیبر سے نکل کر جب میں اتیوئل کے چوک میں آرک دی تروفٹ کے سامنے سے جوتا ہوا شانزے امینری کی حسین شارح پر چل رہا تھا تو مجھے دائیں بائیں ہر طرف فرانس کی فن پرستی، نفاست پسندی اور حسن کاری کے نونے نظر آ رہے تھے۔ اور اس کا دوبارہ حلقے کی رونق اور چل چل پھل، منزل، امارت، جاویدیت اور دل کشی سے پیرس کے چل رہے اس کے حسن کے دل نکھار کا پتہ چل رہا تھا۔ اور پھر جب اس حسین حلقے کی بلند و بالا عمارتوں پر ثروت و کائنات نفیس نمونہ عمارتوں، خوبصورت تھیںٹروں کے سامنے سے گزر کر میں اگلے چوک میں پہنچا اور پیرس کی تیز رفتار کاروں کی زد سے بچ کر اگلی سڑک پر پہنچنے کی نیت سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ تو میری نظر بائیں جانب کی اونچی عمارت پر گئی۔ جہاں "لائف گرو" کا بورڈ آویزا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرا دھیان فوراً جنگیلا کے زمانے میں پیرس کے جرمن قبضے کی طرف گیا جس کے دوران میں فرانس کے اس مشہور عالم اخبار کا نام اکثر سننے میں آتا تھا۔

میں سڑک پر چلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ ابتلا کا وہ زمانہ جس کا حال میں نے کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ اس شہر کے لئے کیسا ہولناک ہو گا۔ جو ان مشہور ملک فتنہ نازیوں کی بڑھتی ہوئی کامیابی کے باوجود پیرس کی زندگی کا وہی عالم تھا جو میں آج دیکھ رہا تھا۔ اس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے بازاروں اور گلیوں کی گھما گھمی اور رونق کیلئے موسیورینا اور جنرل دیگیاں کے بلند و عادی، اہل اداوے اور محکم عزائم کی وجہ

سے اس قدر پر شور اور ہنگامہ آ رہی تھی۔ جیسی آج کے دلی پریسیوں کا ایوان تھا، کہ ان کی حکومت، ان کی سپاہ، ان کے لیڈر ان کے جنرل جرمنوں کی بڑھتی ہوئی بلغار کو روکنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ لیکن پھر لیکا کی ۱۳ جون کی صبح کو نازی اپنی پوری عسکری طاقت کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئے چند منٹوں میں اس بے پناہ اور زل آ شام فروج کے دستے اور ٹینک ہر طرف نظر آنے لگے۔ جس سے اہل فرانس اور پریسیوں کو ہمیشہ سے خوف اور نفرت رہی ہے۔ پریسیوں کو یقین نہ آتا تھا کہ ان کے لیڈر اور جنرل اس قدر خرابی اور بدوئے ثابت ہو سکتے تھے۔ ابھی حکومت کے اس اعلان کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ کچھ ہو جائے فرانسیسی تو لگا سراسیمہ لگا کے نشان کے سامنے سرنگوں نہ ہو گا۔ لیکن آج اچانک ان کے سیاسی رہنما جی ہار چکے تھے۔ ان کے جنرل ناکام رہ گئے تھے۔ خود ان کے اتحادی ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اور پھر شہر اجاڑ ہو گیا۔ لوگ لا دھر اور کبھر گئے۔ پریس کے بازو دوں اور گلیوں کی چل پلٹنے لگی۔ یہی بارونٹی شانہ نے ایئرے جس پر انہیں اپنے خیالات میں محو اس وقت تھی پیسے کے مقابل کلنسیہ کے جیسے کے اُسگے سے گزر رہا تھا۔ ایک ویرانہ بن گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پریس نے خود کشی کر لی ہے۔ لیکن پھر رگ باہر نکلے۔ شہر میں حیات کا رنگ نظر آنے لگا۔ ب سے پہلے کھانے پینے کی دوکانیں کھلیں۔ پھر سینما، قہیڑ اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے کاروباری مراکز۔ لیکن پریس نے پانچ سال تک بغیر کے اس قبضے کو ایک سامت

اپنے لئے قبول نہیں کیا۔ ان پانچ جانکاہ اور طویل برسوں میں دشمن سے خلاصی حاصل کرنے کی تحریک چلانے والی خفیہ انجمنوں کے کئی سرفروش ارکان قاضی فرج کے ٹانگوں گولی سے لٹائے گئے سیکڑوں کارآمد جانیں تحریک آزادی کی نذر ہو گئیں۔ قتل و غارت اور قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود میر سی ادیب اعلیاء اخبار نویس، سیاسی کارکن، مزدور اور روکا خدا راپنی دھن پر اڑے رہے جو کام ان کی حکومت، ان کے سیاسی لیڈر ان کے ہرنیل نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے پیرس کی بلیک آؤٹ کی سیاہ راتوں کی تاریکی میں چھپ کر ادا کیا۔ دشمن کی چالوں کو برباد کرنے، اس کے منصوبوں کو خاک میں ملانے اس کے تجزیے کو خبردقیع اور بنے منی ثابت کرنے کے لئے نئی نئی ترکیبیں سرچیں جنہیں اپنی جان پر کھیل کر اور بے اوقات جان مے کر عملی جامہ پہنایا۔

میں سڑک کو پار کرنے کے لئے اس جگہ پر ایک ساعت کے لئے سڑک کو تیز رفتار موٹروں کی لمبی قطاروں کو دیکھنے لگا۔ جہاں سے پیدل چلنے والے سڑک کو عبور کرتے ہیں۔ بائیں طرف تندے سے بند ہوتی ہوائی شانزے الیزے گلیریے وختوں اور اونچی اونچی عمارتوں کی دور دراز قطاروں کے درمیان سینکڑوں دودھاتی ہوائی کاروں کو اپنے سینے پر لئے ہرک دی تردلف کی طرف خطہ سنفیم کی طرح چلی گئی حتیٰ سڑک کو عبور کرتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ بڑے شہروں میں بعض اوقات بڑی بڑی چیزیں کس طرح خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ توں اور رڑوت کی فراوانی نظر افروز عمارتوں اور خوبصورت شاہراہوں کو کیوں کر وجود میں لے آتی ہے۔ لیکن

دارالخلافہ محض اینٹ چرنے اور پتھروں ہی سے تعمیر نہیں ہوتے۔ بڑی بڑی شاہراہوں، باغات اور گھاس کے تختوں، روشنیوں اور جگہ جگہوں ہی سے ان کا وجود عمل میں نہیں آتا۔ ان چیزوں کی موجودگی سے ایک شہر بڑا تو کہلا سکتا ہے۔ لیکن عظیم نہیں بن سکتا۔

درحقیقت ملک کا دارالخلافہ وہی شہر ہو سکتا ہے جس میں اس ملک کی روح اس کے فنی اور ادبی سرمائے کی عظمت، اس کے ثقافتی اُمّے کی شان جلد و نکلن، یہی درجہ ہے کہ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ ہونے کے باوجود کوئی دارالخلافہ نہیں نیویارک بھی دارالخلافہ نہیں اور فی الحقیقت ہے بھی نہیں، مگر پیریں؟ پیریں ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے ایک عظیم شہر، ایک بہت بڑا دارالخلافہ نظر آ رہا تھا۔ اس میں قرائن کی حقیقی شان اس کی اصل عظمت کا پورا پورا تجربہ ملتا تھا۔ جہاں کھڑا تھا۔ وہاں سے جس طرف دیکھتا تھا، کوئی جگہ، کوئی عمارت، کوئی دکان، کوئی قمرہ خانہ، کوئی کتاب گھر یا نہ تھا جس سے اس عروں، ہلاؤ کی مختصر عظمت اور انفرادی شان کا پتہ نہ ملتا ہو۔

شانزے امینزے کوٹے کے پاس دی لاکھ لاکھ کے جنگم پروردہ چوک سے گزرتا ہوا جب میں وزارت بھرے کی بلند عادت کے نیچے پہنچا تو ایک ساعت ٹوک کر میں اس تاریخی مقام میں اس جگہ کو تلاش کرنے لگا۔ جاں ڈیڑھ سو سال قبل ایک خوں نشان صبح کو اہل پیریں نے اپنے بادشاہ کوئی شانزدہم کے سر کو گھر میں

کے نیچے کھٹے ہوئے دیکھ کر انقلاب فرانس کی تکمیل پر سرت کے لرے لگائے گئے۔ اسی چوک میں مجھ سے چند گز پرے وہ خرمیں ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ جس کے بعد جمہور فرانس کچھ عرصے کے لئے آزادی کے نام پر ہر قسم کی بربریت پر اتر آئے تھے یہیں قتل کی وہ خوفناک مشین گڑی ہوئی تھی۔ جس سے تھوڑے عرصے میں ہوا نہیں سو بے صیب انسانوں کی گردنوں کو ان کے وطن سے کاٹ کر مسنون کی ٹوکری میں پیک دیا تھا۔ ان میں کیسے کیسے عالی دماغ، جہاں بہت نفیس وزیر، سرفروش اور سر بھرے لوگ شامل تھے۔ جنہوں نے دانتوں، مادام رولان، روبن پیریا خود کوئی شاخ و بوم اور اس کی فکر ماری انوارت کی طرح زندگی کی صورت نہیں تھپتھپیں باریں ہی دیکھی تھیں۔

۲۰ جنوری ۱۷۹۳ء کا ذکر ہے کہ پیرس کے لوگ فرانس کی پہلی جمہوریت کو قائم کرنے والے ٹھہری، صبح سویرے سے ٹولوں اور ٹرمیوں میں اس وسیع چوک میں جمع ہو رہے تھے۔ ایک طرف اس آزادی کا بسمۂ نصب تھا جس سے حکمران ہونے کے لئے پھرے ہوئے عجم نے چند ماہ پہلے۔ اراگست کے دن محل سرا کے اندر بادشاہ کے محافظ دستے کے دو سو غیر ملکی سپاہیوں کی تھکاوٹی اڑا دی تھی اور جس کی طرف اشارہ کر کے مادام رولان نے قتل ہوتے وقت اپنا مشہور فقرہ ”آزادی تیرے نام پر کیسے کیسے مظالم روار کھے گئے ہیں۔ ادا کیا تھا۔ اس مجھے سے کچھ دور ایک چوتھے پرگلوٹن نصب تھی جس کے سامنے جلا وطن مسجون اپنے

دو لگا روں کی تمہیت میں کھڑا جہیزِ فرانس کے سب سے بڑے مجرم کی آمد کا قہر تھا۔ دو روز قبل یہ مجرم جو حراست سے پہلے فرانس میں شاہِ لونی شانزدہم کے نام سے مشہور تھا اور گرفتاری کے بعد انقلابی عدالت کے سامنے لونی کلپے کے خاندانی نام سے پکارا جاتا تھا، موت کی سزا کا مستحق قرار دیا جا چکا تھا۔ قصور اس بے گناہ کا یہ تھا کہ اس کے آباؤ اجداد و باری سازشوں اور امر اور پادریوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے رعایا کے حال سے کبیرے خبر کو عوام کی معیشتی اور معاشی حالت کو ایسی خوفناک حد تک برباد کر چکے تھے کہ تنگ آئے ہوئے عوام بغاوت کی بارود کو آگ دکھانے کے لئے محض بہانے کے منتظر تھے۔ اور پھر یہ بہانہ انہیں ۱۴ جولائی ۱۸۷۰ء کے دن ویبریاں اور دوسرے عوامی قائدین کی خطرناک تقریروں کے ذریعے مل گیا جب وہ ہزاروں کی تعداد میں بڑھ چکے، کھلاڑے، تلواریں اور نیزے لے کر میٹیل کے ہندی خانے پر ان چند سپاہیوں کو پھڑکانے کے لئے پل پڑے جنہیں چند روز قبل اس جرم کی پاداش میں قید کر دیا تھا۔ کانہوں نے حکومت کے احکام کے خلاف پریشان حال عوام کے ایک مجمع کی تاویب سے انکار کر دیا تھا۔ جیل خانے کے دروازے توڑ پھاڑے گئے اور محافظوں کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ پھر فتح مند باغی شاہانِ فرانس کے اس نفرت آمیز مذاں کو ذرا آتش کرنے کے بعد ایک انقلابی مجلس کی صورت میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے دعوتی حشرات کو صنوبر کاغذ پر اتارا جو تمام اشخاص، تمام ممالک، ہر عہد اور جملہ بنی

فروع انسان کے لئے مثال ہیں۔ اور یوں چند ہوش مند اور جیالے فوجیوں نے اس سرکہ اڑا اور ہنگامہ خیز اعلان کے ذریعے اُن انقلابی قوتوں، جمہوریت، وطنیت، بیٹولزم کو حرکت مل بخش دی۔ جنہوں نے نہ صرف فرانس بلکہ سارے یورپ کی کایا پیٹ کر دکھادی۔ اس میں شک نہیں امریکی اعلان آزادی اس سے تیس پچیس برس قبل عمل میں آچکا تھا۔ اور جغیرسن کے وضع کئے ہوئے اصولوں سے موجود جمہوریت بڑی حد تک وجود میں آچکی تھی۔ لیکن امریکی اعلان آزادی میں وہ انقلابی بات نہ تھی۔ جو فرانسیسی دعوای حقوق میں تھی۔ امریکہ نے اپنے اعلان کے ذریعے محض حکمران ملک سے تعلقات منقطع کئے تھے۔ انگلستان کے طریق حکومت اور روایتوں سے انحراف کیا تھا۔ لیکن فرانس کا عظیم انقلاب ایک مائیکرو تاریخی سانحہ تھا۔ جس کی اہمیت صرف فرانس ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی۔

جب پیرس کے ہنگامے کی اطلاع بادشاہ کو پہنچی تو وہ دارسانی میں تھا۔ خبر سن کر اُس نے کہا: یہ تو بنادت منوم جوتی ہے۔ پیغام بر نے جواب دیا: عالی جاں یہ بنادت نہیں انقلاب ہے۔ بادشاہ نے پیرس میں آتے ہی انقلابیوں کے مطالبوں کی ایک بہت بڑی تعداد تسلیم کر لی۔ ان کے حقوق بحال کروئے۔ لیکن حالات بگڑ چکے تھے۔ انقلاب کی تحریک ایک باقاعدہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس پر تھے پر ملک کے اندرونی خلفشار اور سیاسی بحران کو نصیحت جان کر فرانس کے آدلی دشمن جرمنی نے پیرس پر چڑھائی کر دی۔ اور دونوں کے اندر بڑھتا ہوا عظیم ان ٹیلیوں

مقرب میں پہنچ گیا۔ جن پر سے وہ میدان دکھائی دیتے ہیں جہاں سپرین واقع ہے۔ اور جب ویرودوں کی فتح کی خبر شہر میں پہنچی تو لوگوں کے دل خوف و ہراس سے میٹھ گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ لوئی نے جرمنوں سے خضیہ ساد با ذکر کہی ہے۔ اور پشیا کے شمشاہ فریڈرک نے محض لوئی اور امرا کی جماعت کو بھانے ہی کے لئے اس فرج کشی کا ڈھونگ دیا ہے؟ لوگ تذبذب اور شبہ میں پڑ گئے۔ مفسدوں نے موقع کو غنیمت مانا۔ حرام کو مجبڑا کرنے کے لئے جھوٹے اشتار اور غلط پہنک تقسیم ہونے لگے۔ جن کا مقصد لوگوں کو بہکانا تھا کہ لوئی اور اس کا خاندان فریڈرک سے مل کر بے گناہ شہریوں کے قتل عام کی خوفناک چالیں تیار کر رہا ہے۔ آخر لوگ بھرے ہوئے درندے کی طرح اٹھے تین دن تک سارے ملک میں ایک خوفناک فارتگری اور قتل عام جاری رہا۔ پادری اور امرا جن کی حبیلوں میں ڈاے گئے۔ پھر ٹی سفاکی اور بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ شاید مرگ خون کے چند آدیں قطروں سے ان کے بہانے والوں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے۔ وجہ حسب بھی انسان کی بحیثیت اس کے سر پر سوار ہوتی ہے۔ اس نے اپنے مظالم سے جنگل کے درندوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس وقت فرانس میں قتل کا طریقہ یہ تھا کہ قید خانے کے ایک طرف شہریوں کی ایک ٹولی چند منٹوں کے لئے بد نصیب قیدی کا مقدمہ سنتی۔ پھر مختصر الفاظ میں اس کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا جاتا۔ اس کے بعد زندان کا دروازہ کھول کر مجرم کو باہر چھیل دیا جاتا۔ دروازے کے

سامنے لوگوں کا جھرمٹاواہیں نیزے، برچھے اور کاہاٹے لئے شکاریوں کی طرح اس پرٹ پڑتا۔ اور منٹوں میں اس کی تنکا ہوئی کر دیتا۔ ان تین دن میں ۱۶۱۳ مرد اور عورتیں قتل کئے گئے۔ پاگل خانے کے باہر بھی ایسا ہی منظر دیکھنے میں آتا رہا۔ لوگ سترت سے ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ کن امرا اور پادریوں کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ بادشاہ نے موت کی تیاری کئے لئے وودن مانگے تھے۔ جب اُس کا وقت

ہو یا تو وہ قید خانے سے ایک سبز رنگ کی ٹرٹی گاڑی میں سپاہیوں کی سمیت میں سوار ہو کر ان بانادوں کے راستے قتل کی طرف چلا۔ جن کے ادھر وقتا شاہیوں کے جھوم اُسی طرح ٹھٹ بانڈھے کھڑے تھے جیسے اچھے زمانے میں کبھی اس کے جلوس کے موقع پر دکھائی دیا کرتے تھے۔ گاڑی بانادوں کا چکر کاٹ کر چک میں پہنچی سپاہیوں نے دروازہ کھولا۔ بادشاہ ڈی ثابت قدمی کے ساتھ باہر نکلا۔ پھر تار اور ٹمکنٹ کے ساتھ محافظوں کے درمیان قدم بڑھاتا ہوا قتل گاہ کے چبوترے پر پہنچ گیا۔ وہ موت کے تختے پر بادشاہت کے تخت سے بھی زیادہ ذی وقار نظر آ رہا تھا۔ اُسے یوں گلوٹین کے نیچے کھڑا دیکھ کر مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ پیٹی پیٹی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ بادشاہ نے پہلے اپنا جوتا اُتارنا۔ پھر گئے کاٹن کھولا۔ اور پھر بانڈھنے کے لئے اپنے ہاتھ جلاوکی طرف بٹھالے۔ اور آخر وہاں پہنچا جہاں شاہ اس کے پاؤں بانڈھے گئے۔ وہاں اُس نے لیٹے لیٹے بلند آواز سے مجمع کو مخاطب کر کے کہا: لوگو! میں بے گناہ مارا جا رہا ہوں۔ میں اس جرم سے

بری الذمہ ہوں جس کی پاداش میں مجھے . . .

لیکن ابھی بادشاہ کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ قسطنطین کے حکم کے ماتحت فلاحوں
 کا چوٹ پڑی۔ ایک محکومہ قسم کا شور بلند ہوا۔ اند لوٹی کے الفاظ اس شور میں ڈوب
 گئے۔ مسون نے فوراً آگے بڑھ کر گلوٹین کو حرکت دی مگر پھینٹ کی بلندی سے
 وزن دار پھری کا تیز پھل نیچے کو پکا اور آنکھ جھپکتے میں ایک خوفناک چیخ کے ساتھ
 بادشاہ کا سر کٹ کر ٹوکری میں جاگا۔ اس وقت تک مجمع پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی
 ہوئی تھی۔ لوگ سکتے کے عالم میں قتل کی واردات دیکھ رہے تھے۔ جب جلاوٹے
 ٹوکری سے اٹھا کر کٹا ہوا سر قاشائوں کو دکھایا تو سیاسی دیرانوں میں زندگی کے آثار
 نمودار ہونے اور ہجوم کے مختلف حصوں سے انقلاب زندہ باد کے نعرے سنائی
 دینے لگے۔ ادویوں اس چمک میں جو کبھی پلاس کوئی پانزدہم اور پچیسویں کی یاد دلائی اور
 — کہلاتا تھا۔ اور اب پلاس دی لاکنارو کے نام سے مشہور ہے۔ قتل عام کا وہ
 بازار گرم ہوا جس میں لوگ گلوٹین کے بچے ایسے مر رہے تھے جیسے کسی ملک دبا
 نے انہیں آیا ہو۔ داد فریاد سب ختم ہو چکی تھی۔ انصاف اور قانون زینتِ طاق نیلا
 جو گئے تھے۔ دیکھنا یہ ہوتا تھا کہ کون پہلے پہنچ کر انقلابی مجلس میں دوسرے کے خلاف
 جھوٹی سچی خبری کر رہے۔ امراء اور خدمت گار اشراف اور بد معاش خلائق اور دہلیا
 فن کار اور ادارہ دار اگر دیکھ کر ہی چپکڑے میں بازو کر گلوٹین کے بچے لے جاتے جاتے
 اور بچے ہوئے پھلوں کی طرح گردنیں کٹ کٹ کر بچے گرنے لگتیں۔ ایسی نفسا نفسی

ہر طرف بھائی ہوئی تھی۔ کہ برسوں کے دوست ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ گئے جب خوش و بہر دل نے گلوٹن کے تختے پر سر جھکانے سے پیشہ اطراف میں نظریں ڈرائیں تو سامنے کے مکان سے اس کی محبوبہ اسے سفید رومال ہلکا کر اوداع کس رہی تھی اور جب حانتموں کی باری آئی تو اس کا پرانا دوست ڈیوڈ قمرہ خانہ کی منڈیر پر چڑھا اس کے قتل کے منتظر کی تصویر بنا رہا تھا۔

میں کوئی کے قتل کے ایک کونے میں کھڑا جب اس غم میں دل سے کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ تو میرا وحیان کارلائل کی مشہور تصنیف 'فرینچ ریوولوشن' کی طرف جارا رہا تھا۔ جسے میں نے کالج کے زمانے سے لے کر اب تک کئی مرتبہ پڑھا تھا اور کارلائل کی اس بے پناہ تصنیف کو آپ پڑھنے نہیں محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بیان میں ایک ایسا مادہ اس کے اکتھا میں ایک ایسا سر ہے کہ آپ اس سے بچنے کی کسی ہا کوششیں کریں ممکن نہیں کہ وہ آپ پر اپنا سپنا نرم نہ کرے۔ کارلائل اپنی جگہ پر اپنی غلطیوں گنیں۔ کوئٹ 'سیٹے' یا ہمارے قریبی عہد کے ریڈیو میں کی طرح کوئی مندرجہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے محمد حسین آزاد کی تصنیف 'قصص ہندیا آئیس ڈیبر کے مراٹھی کی طرح ایک تاریخی مادے انقلاب فرانس ہی پر ایک بہت بڑے دہلی کا دور کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تصنیف میں مراٹھی کے برعکس بیانات نہیں ہیں۔ بلکہ ڈائری کی طرح منفرد واقعات کا ذکر ہے۔ لیکن محمد حسین آزاد کے قصص ہند کی طرح کئی غلط واقعات اور ضعیف دعائیں بھی شریک کتاب ہیں۔ تاہم اسے پڑھ چکنے کے بعد انقلاب فرانس

حیرت خیز طور پر ایک زندہ و جاندار شے نظر آنے لگتا ہے۔ اور سلاسل کے دوران میں آپ یہ محسوس کرتے ہیں گویا اس تاریخی ہنگامے میں آپ خود صرت موجود ہی نہیں ہیں۔ بلکہ جلسے وقوع پر چل کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ کی شاید ہی کوئی کتاب پڑھنے والے کے ذہن پر ایسا مربوط واضح اور دائمی اثر چھوڑتی ہوگی۔

میں پھر تاجر تاجب ہڈل میں داخل ہوا۔ شام کا دھند کا چھا رہا تھا۔ دفتر کے کمرے میں جی بل چکی تھی۔ اور کاؤنٹر پر صبح کے نوجوان ملازم کی بجائے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کاغذات کی چٹناں میں مصروف تھی۔ کمرے کی چابی لینے کے لئے جب کاؤنٹر پر گیا تو مادام نے سراٹھایا۔ پھر سکوکر فریسی میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن مجھ سے انگریزی میں یہ سن کر کہ نہیں فریسی نہ جانتا تھا۔ مادام کو کچھ مایوسی ہوئی اور وہ ناتسف سے انگریزی میں کہنے لگی: فریسی بہت خوبصورت اور کاوا آدھ زبان ہے۔ آپ کو اسے ضرور سیکھنا چاہئے۔ جب آپ اسے سیکھ لیں گے شاید اس وقت آپ انڈونڈ کر سکیں گے کہ کس چیز سے آپ اتنا عرصہ محروم رہے ہیں؟

میں نے سفارت کے دو تین اٹلے سیدھے دیکھی الفا کا ادا کئے پھر چابی سے گھر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ دینے پر سے ادھر جاتے وقت میں سوچنے لگا کہ واقعی میں نے فریسی زبان کیوں نہ سیکھی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ گوئٹہ سٹا پر انگریزی حکومت چھوٹی اور انگریزی پڑھنا ہماری معیشت اور معاشی بقا کے لئے

لازمی نہ ہوتا تو شاید ہم میں سے بہت آدمی یورپ کی دور زبانوں کی طرف بھی توجہ دے سکتے۔ مگر لارڈ میکالے کی تجویز کے بعد انگریز نے اپنے جاہل ہندوستانی غلاموں کو علم و فراست کی دولت سے محالاً مال کرنے کے لئے انگریزی کو ہارے لے لیا۔ ایسا لازمی قرار دیا کہ فرانسیسی اور دوسری یورپنی زبانوں کو سیکھنا تو وہ کتنا نرم اس کی تحصیل کے چکریں خود اپنی ہی زبان کو بھول بیٹھے۔ حالانکہ بیسویں صدی کے آغاز میں اہلہ خیال کے لئے فرانسیسی ایک ایسا عالمگیر ذریعہ تھی۔ کہ یورپی ممالک تو ایک طرف خود دوس میں تمام بیرونی خط و کتابت اسی زبان میں کی جاتی تھی۔ سچ بھی مشرق قریب کے شائستہ مذاق لوگوں میں فرانسیسی کو ہر تہہ حاصل ہے وہ اپنی اہمیت کے باوجود انگریزی کو حاصل نہیں۔

میں سوچنے لگا کہ ہم میں سے جو لوگ فرانسیسی نہیں جانتے وہ کتنے بڑے خزانے کی دولت سے محروم رہ گئے ہیں۔ فرانسیسی مصنف اس وقت تک ادب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز نہ ہو رہی وجہ ہے کہ اکثر فرانسیسی تحریروں کے اصل متن کی خوبیاں غیر زبان میں مشاق اور پیشہ دست ترجموں کی مشا کرشش کے باوجود عموماً متعلق نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ آں پڑھنے والوں کو جنہوں نے فرسواحیلے سے لے کر رومین ردلاں تک کے شہ پاروں کو انگریزی کے ذریعہ دیکھا ہے یہ کیوں کہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فرانسیسی تحریروں کی اہل عظمت کیا ہے۔ یوں تو ہر زبان اپنی ساخت، محاورات اور رنگ و روغن کی وجہ سے

دوسری سے مختلف کیفیت رکھتی ہے۔ اور اس بعد کی وجہ سے دوسرے قاصد میں منتقل ہوتے وقت اپنے حُسن کا کچھ نہ کچھ نکھار ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن فرانسیسی کی بات اور ہے۔ وہ اکثر اوقات منتقل ہو ہی نہیں سکتی یہ ایسے ہی ہے جیسے تارخشی اشفاق احمد یا قمر العین کے افسانوں کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں کیا جاسکتا ہے عصمت چٹائی کا بھی ترجمہ کیا جاسکتا ہے لیکن میرامن کا نہیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر جب میں بستر پر سونے کی نیت سے لیٹ گیا تو مجھے خیال آیا کہ میرا مطالعہ کا ذوق بھی تو خود فرانسیسی مصنفین ہی کا مرکوزی منت تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے سب سے پہلے جو انگریزی تصنیف اپنی دوسری کتابوں کے علاوہ پڑھی تھی وہ بھی تو فرانسیسی افسانوں کا انگریزی ترجمہ ہی تھا۔ میں اسلامیہ کالج میں فرسٹ ائر کلاس میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر انگریزی کی کلاس کو لیکچر دے رہے تھے۔ معاذ انہوں نے کسی متعلقہ چیز کا ذکر کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب نام دیا۔ ”جگائی دی مریساں“ اور کہنے لگے اس مصنف کی مدد کمائیل کا ایک مجموعہ کالج کی لائبریری میں آیا ہے لیکن مصنف کی صاف گزرتی اور بیباکی اس امر کی مقتضی ہے کہ فوری طلبہ کو یہ کتاب پڑھنے کو نہ دی جائے۔ چنانچہ لائبریری میں کوہدایت کو دی گئی ہے کہ یہ کتاب تجربہ منوط تصور کی جائے۔ جیسے ہی چھٹی ہوئی ہوٹل کا رخ کرنے کی بجائے میں سیدھا مارکس شٹل کے ان پہنچا۔ جب میں کتاب کا نام زبان پر لایا تو مجھے تاجرنے مسکرا کر پوچھا: کیا اسلامیہ کالج میں پڑھتے ہو؟ میں نے سر کی جنبش

سے اثبات میں جواب دیا۔ بڑھے تاجر نے سامنے کی امدادی سے کتاب نکالی، پھر اس کے دام بتاتے ہوئے بولا: اس کتاب کی آٹھ کاپیاں پچھلے دو گھنٹے میں اسلامیہ کالج کے طلباء کے ہاتھ بیچ چکا ہوں، کیا یہ کتاب کورس میں داخل ہوگئی ہے؟

میں نے بھر کے بعد پھر ایک دن ایسا ہی واقعہ پیش کیا، تاثر نے ایک اور فرامیسی معنت کا نام لیا اور طلباء سے کہنے لگے کہ لا بُریری میں اس کے افسانوں کا ایک مجرور آیا ہے جسے میں مستعار دینے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ چھٹی کے بعد میں سائیکل پر ہانپتا کا پتا پھر مارکسٹا کے ہاں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑھا، جو اپنی کرسی پر سے اٹھا اور تھوڑی دیر میں ہاتھ میں سبز رنگ کی ایک کتاب پکڑے مجھ تک آکر بولا: یہی لینے آئے تھے نام بھی۔ بالوک کی ڈراما سٹریز کا یہ آخری نسخہ تھا باقی تمہارے ساتھی سے گئے۔

اور پھر ساری بات میری کجھ میں آگئی۔ یہ تاثر کے شاداب دماغ کی خنجر اٹھتی کہ نوجوان طلباء میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لئے انہیں ابتدا میں کس قسم کی کتابوں کی چاٹ پر لگایا جائے اور کس طریق سے انہیں ان کتابوں کے حصول کی طرت مائل کیا جائے۔ چنانچہ موصفاں اور بالوک کے بعد ذولا کی باری آئی اور پھر غلامی کی۔ اور آخر میں جب ایک دن تاثر نے خود اپنی کتابوں میں سے نکال کر پرسی ٹی کی تصنیف "افروز و انقی" میرے حوالے کی تو میرے دلی میں مطالعے کا گرا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ پھر میں بستر پر لیٹا ہوا افسوس کرنے لگا کہ میں نے اپنی تعلیمی زندگی کے

ابتدائی مراحل ہی میں فرانسیسی مصنفین سے آشنا ہو جانے کے باوجود فرانسیسی کیوں ڈپرمن
ورد آج پیرس میں میرے لئے کتنی سہولت ہوتی! اور میں اپنے سفر کا کس قدر رطقت
اٹھا سکتا۔

اور پھر دن گذرتے گئے، پیرس سے میری آشنائی گہری ہوتی چلی گئی۔ میں اس
کے بازاروں اور گلیوں سے یوں مانوس ہو گیا۔ گویا میں کسی جانے پہچانے شہر میں ہوں
سے پڑا ہوا ہوں۔ لیکن اس بے تکلفی اور آشنائی کے باوجود میں جانتا تھا کہ زبان کے
نہ جاننے سے میں کس خسارے میں ہوں۔ کئی باتیں جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا، محض
اس لئے معلوم نہ کر سکا کہ غریب شہر کے سٹریٹس کو کون کس زبان میں سنا اور
آج جبکہ پیرس سے میری روانگی کے موقع پر یونارڈ مجھ سے یہ جانا چاہتا تھا کہ پیرس
میں کیا کیا میرے دیکھنے سے رہ گیا تھا۔ تو میں سوچ رہا تھا کہ جواب میں کیا کہوں۔

میں نے کہا پیرس اسکا بڑا شہر ہے کہ شاید برس دو برس میں بھی کوئی اس کی پروری
طرح سیر نہیں کر سکتا۔ پھر میرا قیام تو یہاں ایک ماہ تک ہی محدود رہا ہے۔ ہی ضرورت
میں ظاہر ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو کچھ نہیں دیکھا بہت
زیادہ ہے۔ لیکن اب دیکھنے کا وقت ہی کیا رہ گیا ہے؟

یونارڈ نے کہا: آج کی رات باقی ہے۔ اور جو وقت باقی ہے اس کے لئے
تم میرے صمان ہو، میں سات بجے کے قریب تمہارے ہوٹل میں آؤں گا۔ اور ہم باہر
چل کر پیرس کی رات کا سماں دیکھیں گے۔

(۲)

میں رینکو ہاؤس سے نکل کر اونیورسٹی لائبریری آیا اور سوچنے لگا کہ ہرٹل پہنچنے کے لئے آج پیدل چلنے کا کون سا راستہ موزوں رہے گا۔ اس سفر کے دوران میں پیدل چلنا میری فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ یہ بات تجربے نے سمجھائی تھی کہ نئے شہر میں پیدل چلنے میں بچت کے علاوہ ایک منفید بات یہ بھی ضرور ہے کہ اگر وقت میسر ہو تو پیدل چلنے سے انسان زیادہ مقامات زیادہ سہولت اور تفصیل سے دیکھ سکتا ہے۔

میں لندن میں تھا تو بار بار دارا کے باوجود گھنٹوں پیدل چلتا تھا۔ نیو یارک میں بھی میرا یہی معمول تھا۔ اور برٹن بارش اٹالہ باری اور تیز ہواؤں کے باوجود میں اس کے بانداروں اور ٹرکوں پر پول چسپی کی چیزوں کو دیکھتا سیلوں دُور نکل جاتا۔ ہرانا یا میکسکو سٹی میں میرا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ مجھے ہسپانوی بھی نہ آتی تھی۔ لیکن پہلے دن کے بعد جب میں نے ان اجنبی شہروں کے گلی کوچوں میں محض کافی آنکھوں اور دماغ کے بھروسے تنہا قدم قدم چلنے کی کوشش کی تو کچھ دیر کے بعد دیا برغیر کے یہ نا آشنا باندار اور کوپے مجھ سے خود ہم کلام ہونے لگے ہیں آئس لینڈ کے شہر گنڈوک میں کیسیر غیر متوقع طور پر پہنچا تھا۔ اس انجانی سرزمین پر قطعاً اتفاق قدم رکھتے وقت میرے دل کی کیفیت وہی تھی جو کیوبا کے ساحل پر اترتے وقت غالباً کوئس اور اس کے ساتھیوں کی تھی۔ لیکن جب ہرٹل میں سامان مہانے کے کچھ دیر

بعد میں اس اجنبی شہر کے اطراف میں پیدل گھوما ہوں تو اس کے طیور و اشجار اپنی انسان
خود نما رہے تھے۔ اور بے زبان کی قدرت نے جو حدود و جہات شروع و پایان بخشے تھے۔ اس
میں اس کے ہاتھ اور گلیاں عمارتیں اور باغیچے نمودارے اپنا حال دل کسے ہے تھے۔

پریس میں شروع شروع میں میل وصول تھا کہ میں دفتر کے کام کے بعد سڑکوں پر اپنے
گنگا دو ریور ویال میں دوپہر میں اور اوپر کے واسطے ہوٹل پہنچا لیکن پھر پیدار تھے ترک کرنا پڑا
اس واسطے میں ایک دو مقام ایسے بھی آتے تھے جن کی نزاکت کا میں تحمل نہیں کر سکتا
تھا۔ ریور ویال کے فیشن ایل بانر کی ٹکڑ پر اولین کے تاریخی گرجے کے مقابل
عامس گل کا دفتر واقع ہے۔ جہاں غیر ملکی لوگوں کی آمد و رفت کا ایک مستقل سلسلہ صبح
سے شام تک جاری رہتا ہے۔ مجھے اپنے ہوٹل کی طرف جانے میں اس دفتر کے
سامنے سے گزرتا پڑتا تھا۔ اس میں ایک تباہی تھی جس کا احساس مجھے تین چار دن
کے بعد چاہک ہوا۔ اس روز شام کے ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں دن بھر کے
کام سے تھکا ہوا قدم قدم گل کے دفتر کے سامنے سے گذر کر جواہر کا پرس میں داخل
ہو رہا تھا کہ مجھے اچانک یوں محسوس ہوا گویا عقب میں کوئی شخص مجھے اپنی جانب متوجہ
کرنا چاہتا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ ایک صاحب بڑے رازدارانہ
انداز میں میری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میں جب رفع استہباب کی خاطر مڑا
تو وہ میرے قریب پہنچ کر سرگوشی میں فرانسسی میں کچھ کہنے لگے۔ پھر یہ جان کر کہ میں
فرانسسی سے نااہل تھا۔ انہوں نے انگریزی کا ایک منفرد لفظ "کارڈ" استعمال کیا۔

اس لفظ کو سنتے ہی میں تازہ لگیا کہ یہ حضرت کس حکیم ہیں تھے، اور میں کس افتاد میں تھا۔
 اس دل چسپ اور سنی خیز لفظ سے ایک لطیفہ وابستہ تھا، جو مجھے یاد آ گیا۔
 ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے۔ میں قاہرہ میں دن بھر گھومنے کے بعد ٹرین کے ذریعے شام کے
 وقت پورٹ سعید میں وارد ہوا تھا۔ اور اس جہاز کا انتظار کر رہا تھا جس نے میں ایک
 روز قبل سوئٹزرلینڈ پر قاہرہ کی سیر کے لئے آتا تھا۔ اور جواب نہر کے پایاب پانی میں رنگتا
 ہوا ہمارے لئے پورٹ سعید میں داخل ہو رہا تھا۔ ہماری روانگی میں چونکہ ابھی چند گھنٹے
 اور باقی تھے۔ اس لئے میں پورٹ سعید کے بازاروں میں گھوم چکنے کے بعد ٹری بیڑی
 کے عالم میں شارع سلطان حسین پر ایک طرف کرکڑا سائے جلتی اور بجتی ہوئی سندری
 بقیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ کہ اچانک پاس کی عمارت کے سائے میں سے نکل کر ایک
 مصری نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا: کارڈز پاس کی بات ابھی پوری طرح میری کج
 میں نہ آئی تھی کہ اس نے خود ہی وضاحت کے طور پر سرگوشی میں کہا: فریج فوڈز؟
 اور پھر اس نے پوسٹ کارڈ کے سائے کی تصویروں کی ایک سونی گھنٹی میرے ہاتھ میں
 تھما دی۔ میں نے شرک کی مدح میں بدوشن کی مدد سے اوپر کے کارڈ کو دیکھا۔ یہ ایک ننگی
 تصویر تھی جس دیشی دھانگے سے یہ گھنٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے توڑ کر میں چاہتا تھا
 کہ باقی تصویروں بھی دیکھوں کہ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھبراہٹ کے
 عالم میں کہا: پوریں؟ اس تمہنی مشورے کی اہمیت کو سمجھنا میرے لئے چنداں شکل
 نہ تھا۔ میں نے بحث وہ گھنٹی حبیب میں غالی۔ اور اس نعمت کے لی جانے پر ایک پانڈ

کی رقم خوشی خوشی اس کی نذر کر کے بے بے ڈنگ بھرتا اس نیت سے سیٹی کی طوت پکا کہ اگر جہاز کنارے لگ گیا ہر توبہ میں پہنچ کر امینان سے تصویروں کی زیارت کروں۔ میں سیٹی پر پھپھاتا جہاز ننگا ناز ہو چکا تھا۔ اور میٹر می لگائی جا رہی تھی۔ خلاصی ابھی اس کی رسیاں کھینچ ہی رہے تھے کہ میں زندہ کرتے جلدی جلدی اوپر چڑھ کر کیبن میں جا پہنچا۔ پھر میں نے وہ خانہ کو اندر سے قفل کرنے کے بعد جیسے تصویروں کی غلطی نکالی تاکہ کو کھینچ کر توڑا اور جیسے ہی بے صبری سے کارڈوں کو الگ الگ کرنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں پہلے کارڈ کے سوا باقی سب خالی کاغذ ہیں۔

چونکہ میں ان کارڈوں کی اصل کیفیت کو بخوبی جانتا تھا۔ اس لئے میں کارڈ فروشی سے سہارت کرنے کے بعد اپنے راستے پر پلٹنے لگا۔ لیکن وہ بدستور میرا تائب کر رہا تھا۔ اور اس بات پر ٹکرا ہوا تھا کہ وہ اپنے کارڈ میرے ہاتھ بیچ کر ہی دم لے گا۔ آخر جب میں نے تیز تیز پہنا شروع کر دیا تو یہ بجانب کر کہ ان ٹکوں میں قفل نہ تھا۔ وہ پھر لگ کے دفتر کی طرف کسی اور غیر ملکی کو پھانسنے کے لئے واپس لوٹ گیا۔ وہ سرے دن پھر حاس لگ کے دفتر کے سامنے بے دیاہی واقعہ پیش آیا اور کہیں غیب سے ایک دوسرا کارڈ فروش میرے سامنے اکٹھا ہوا۔ جب تیسرے اور چوتھے دن بھی اس حادثے نے اپنے آپ کو دہرایا تو میری گہرا بٹ اس کیفیت کو پہنچ گئی۔ کہ مجھے حاس لگ کے دفتر سے بہت پہلے ہی ہر ٹکڑا، ہر ٹکڑا اور ہر سامنے کیونچے ایک ایک کارڈ فروش چھپا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کا آسان طریقہ

یہی تھا کہ ریو دیال کی بجائے کوئی بے ضرر راستہ اختیار کر لیا جائے۔ اس فیصلے کو ندرت اس بات سے پہنچی کہ اس راستہ میں اوپاکے نزدیک دو تین مزید بڑے خوفناک مقام آتے تھے۔ بلوار و کیو سپین کے غاتے پر جنگ و تارکب گیلیاں بڑے بازار سے کھڑے دائیں طرف اندر کو چلی گئی ہیں۔ ان کے سايوں میں گلیاں قسم کی رنڈیاں سر شام ہی اپنی بیچار پر نکل آتی ہیں۔ اور ان کے بے ہودہ اور حیا سوز اشارے اصل بلوار میں سے گذرتے وقت سوا ہاں روح ہو جاتے ہیں۔ ان بھڑکیلے لباس اور شرع میک اپ والی مکروہ اہمیت عورتوں کو اپنے شکار کی تلاش میں یوں سرگرداں دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ گو کہ ارض پر شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا۔ جس میں دنیا کے اس سب سے پرانے پیٹھے پر انحصار کرنے والی خوراکی بے نصیب بیٹیوں کا وجود نہ ملتا ہو۔ لیکن مغرب میں شاید رنڈی کو عورت کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ ہمارے ہاں رنڈی معاشرتی طور پر اچھوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے کو ٹھے پر بیٹھتی ہے۔ چونکہ وہ بہر حال عورت ہے اور اس اعتبار سے ایک مخصوص سلوک کی مستحق ہے۔ اس لئے مرد خود چل کر اس تک جاتا ہے۔ مگر مغرب کے اکثر شعروں میں عام قسم کی رنڈی کو عورت کی جنسی توفیر بھی حاصل نہیں۔ اس کا یہ حال ہے کہ وہ خود مرد کے پیچھے دوڑتی ہے۔ اسے باواں بلند لٹکارتی ہے۔ اور بعض اوقات اس سے اُلجھ بھی جاتی ہے۔ لندن میں تو سوسو کے ملائے کی بعض تارکب گلیوں میں شام کے بعد سورہ یوسف کی آیہ "وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ" کی طرٹ و حیان جاتا ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ یہاں اگر کوئی شرمیلا

آدھی بجوے سے جانکے ترباوقات اس علاقے میں پھرنے والی پریشان الطوار
عورتوں کے ہاتھوں اس کا شرقرآن پاک کے ان الفاظ کے مطابق کس قسم
عبرت اگیز ہوتا ہے۔

یونسکو ہاؤس کے سامنے کھڑے کھڑے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج میں دریائے
سین کے کنارے کنارے تدریج کی سمت سے ریو دی لا پے کے راستے ہوئی جاؤں گا
اور ادنیو کلیئر کے نچلے حصے پر چلنے لگا۔ ابھی دفتر بند نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے
پیدل چلنے والوں کی تعداد معمول سے کم تھی۔ مگر شہرک پر دو فوں سمتوں سے تیز رفتار
گاڑیاں بدستور فرماتے بھرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ جن کی ہتھ پائی کو دیکھ کر میں قہقہہ
راہنما کہہ فرمائی مگر وہ کہیں آہستہ نہیں چلا تھے۔ نیویارک میں بھی موٹر گاڑیاں بہت تیز
رفتار سے چلتی ہیں۔ لیکن کاروں کے ہاتھوں پیرس میں زندگی اتنی ادناں اور محسوس
خفہ میں رہتی ہے۔ شاید ایسی میکسیکو سٹی کے سوا کہیں نہیں۔ یہاں شہرکوں پر ریکیوں
کے استعمال سے تیز دوڑتے ہوئے پیتوں کی جنس سن کر ہر نووارد کو یہ گمان گزرتا ہے
کہ مارکیٹ میں آکر کوئی ماہ گیر ملے گا۔ لیکن بال بھر کے ٹھٹھے سے بچ بچ کر نکل
جانے والی کاریں دیکھنے والوں کو ہنر مند کی یاد دلاتی ہوئی اسی تیزی سے آگے بڑھ
جاتی ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے بریکوں کی آواز کے ساتھ ایک خوفناک
دھماکے کا شور مچائی دیتا ہے۔ اور پھر دوڑتے ہوئے تھکوں کی چاہ سے پتہ چلتا
ہے۔ کہ رفتار کے دھماکے آخر اپنی بحیثیت لے لی کوئی زمانہ تھا کہ فراموشی مرید

کے لئے عورتوں پر جان دینا زندگی کے کاموں کا ایک اہم اور لایینفک جزو تھا۔ اس زمانے میں حسین خاتون کی خاطر حریفوں سے ڈوٹلی لڑانا ان کے مقتدرات میں شامل تھا۔ اس صدی کے آغاز میں پیرس کی ایک مشہور میکینکس لائبریری اور تیکنیکی خاطر جہاں تک زندہ ہے، اٹھ چاہنے والوں نے یکے بعد دیگرے خودکشی کی تھی۔ لیکن اب ان کے لئے عورتوں پر جان دینے کی بجائے پیرس کی تیز رفتار گاڑیوں کے آگے مرنا زیادہ آسان اور عام ہو گیا ہے۔

پھر چلتے چلتے میں فرانسیسیوں کی عادات و اطوار پر غور کرنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر سے دیکھنے والوں کو یہ قوم بے اوقات اپنے متعلق کیسے کیسے عجیب و غریب نظریات قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ موجودہ تہذیب کی اکثر لغویتوں کے ساتھ "فریج کالفا" چپا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے بے خبر لوگ عام طور پر فرانسیسیوں کو ایسی پیش پست اور نگین طبع قوم کے افراد پر محمول کرتے ہیں۔ جو پرتکلف آدمی کی بہت قائل ہے ان کے بارے میں ہمارے ہاں دنیا کے دوسرے نامعلوم لوگوں کی طرح یہ رائے بہت پختہ ہے کہ ایک عام قسم کا فرانسیسی ہر رنگ کے لہو و لب اور عیش و تفریح پر جان چھڑکتا ہے۔ اور گلاس کاپس چلے تو شراب خانے اور چمکے ہی کی سیر میں ہر وقت کھوٹا رہے۔ اور کون اخبار میں ایسا ہے جو یہ مانے نہیں رکھتا کہ سیاسی طور پر فرانسیسی ایک مخصوص لائبرالی پن کے شکار ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی حکومتیں آئے دن ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ملک میں ہر قسم کی اتہری ہر وقت چھائی رہتی ہے۔

اس سے مجھے فرانس کی زورعی معیشت کا خیال آیا، میں سوچنے لگا کہ جس ملک کی دو تہائی آبادی قوتِ لایوت کی خاطر کاشتکاری جیسے محنت طلب کام میں مصروف ہے۔ وہ بے کاری اور کام طلبی میں کیسے الجھ سکتی ہے۔ اور پھر میرا وھیان، مادام برنارڈینا، روسیروپوٹی، مید موزیل، کلاویل، ہنری لاواں، پاک تیرو جیسے ان فرانسیسی اور عورتوں کی طرف گیا۔ جن سے اپنے قیام پھرے کے دوران میں اکثر ملاکر نامتہا۔ صغینہ بھران سے روزانہ ملنے کے بعد میرا تجربہ آج یہ تھا کہ یہ لوگ سب کے سب حدودِ وطن پرست، محنت شمار، علم دوست، خوش اخلاق، شائستہ مذاق، اور اکثر حالتوں میں ضایت فراخ حوصلہ اور فیاض واقع ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف ذہین تھے بلکہ ذہانت کے بہت دلدادہ بھی۔ وہ نہ صرف خود انفرادیت پسند تھے۔ بلکہ دوسروں کی انفرادیت کے قدر دان بھی۔ اور پھر میں سوچنے لگا کہ کیا تمام فرانسیسی میرٹان رفیقوں کی طرح پرے درجے کے شخصیت اور انفرادیت پرست واقع نہیں ہوئے تھے۔ ان سے مختلف مسائل پر بحث کرنے کے دوران میں میں دیکھتا تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنی منفرد رائے، اپنی خودی اور انانیت کے باعث آسانی سے دوسرے کی رائے کو اپنے پر عادی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ بظہر ایک ایسی خود سر قوم کے افراد نظر آتے تھے۔ جو باہمی النظر میں قومی تنظیم کی قائل و کھانی نہیں رہتی۔ اور پھر زندگی سے مجھے فرانسیسی سیاست کا خیال آگیا اور میں سوچنے لگا کہ ہم میں سے جو لوگ فرانسیسی حکومتوں کو آئینوں کی طرح نازک سمجھتے ہیں۔ وہ

یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر نئی فرانسیسی حکومت میں پہلی حکومت کی کابینہ کے دستاویز نہیں تو کم از کم نصف وزرا ضرور شامل ہوتے ہیں۔ شاید وہ اندازہ نہیں رکھتے کہ عام انتخابات کے علاوہ جب کونسل اسمبلی میں سیاسی جماعتوں کا توازن بالکل ہی الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ فرانس میں عام طور پر حکومت کی تبدیلی ضمن ایک معمولی رد و بدل کے مترادف ہے۔ اس اعتبار سے اگر بیرونی ناظر کو فرانسیسی نظارے میں کوئی پُرہل ابتری نظر آتی ہے تو یہ ابتری بڑی حد تک کباڑی کی دوکان کی ابتری سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جس طرح کباڑی اپنے بے ترتیب سامان کے انبار میں سے گاہک کی مطلوبہ چیز کھٹ سے نکال کر اس کے حوالے کر دیتا ہے، اسی طرح فرانسیسی بھی اسی سیاسی ابتری میں اپنا کام پوری دلچسپی کے ساتھ چلائے دیتے ہیں۔

پھر فرانسیسیوں کی ایک اور عادت سیرے مارنے میں ابھرائی۔ جو ہماری اپنی ایشیائی قد و دل کی آئینہ دار تھی۔ میں سوچنے لگا کہ ہماری طرح ان کے ہاں بھی کنبے کا احساس کس قدر گہرا ہوتا ہے۔ چین کی مانند فرانس بھی کنبوں ہی کے ایسے اجتماع کا دوسرا نام ہے۔ جہاں ہر شخص اپنے گھرانے کے ارکان کے ساتھ بڑے گھرے قلق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے روز ریسکوریڈیو ڈوژن کے انصرامی کارٹون فریڈرک میز پر ایک ہی مضمون پر مشتمل مختلف لوگوں کے جیسے جیسے تعزیتی کارڈ دیکھ کر مجھے پتہ چلا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی متمول فرانسیسی کنبے سے دشمنی رکھتا ہو تو اس کنبے کے کسی سمرڈکن کی موت پر اسے چھوٹے بڑے بشتہ عاقلوں

کی طرف سے چھاپٹر یا خالہ رین کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ہمیشہ فوجاً فرما آتی ہے۔ اور پھر مجھے سٹر فریئر کے الفاظ یاد آئے۔ کہ جب انگریز یا کوئی دوسرا مغربی اپنے کنبے کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اپنی بری اور بچوں سے ہوتا ہے لیکن فرانس میں کنبے سے مراد جوتی ہے بری اور بکے، ماں اور باپ، بھائی اور بہنیں، ماحول اور چچا، خالائیں اور چچیاں، بہنئی اور بھادھیں یعنی پورا دھندیاں اور پورا نسل۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انگریز کی فخری عزت پسندی کو اپنی دوستی سے دہم برہم کرنے کے بعد آپ کو اس کے ہاں آئے جانے کی صلاح عام برہمچی سے دیاں آپ فراموشی کنبے کی خلوت میں محض اسی صورت میں جاسکتے ہیں۔ جب کہ آپ اس کنبے کے اکثر افراد کو بڑی بے تکلفی سے جانتے ہوں۔

مجھے نام آئیاد کا خیال آیا جس سے میں نے جب بھی اس سے اس کے شہر کا ذکر کیا وہ اس کی تجارتی سرگرمیوں اور اس سے متعلقہ اعداد و شمار کا ذکر میں سے جیستی کہ شہر ہونے لگا شاید شہر کی بجائے فرم کو خوردیہ چلاتی ہے۔ وہ اصل فرانس میں اکثر کاہد بار خاندانی کاہد بار ہوتے ہیں اور اس میں مرد ہی نہیں گھر کی عورت بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ فراموشی عورت دوسرے ممالک کی عورتوں کے مقابلے میں اپنے شہر کے کاہد بادی معاملات کی ادنیٰ نیچ سے زیادہ باخبر ہوتی ہے پاک اور بہری دونوں جہ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ گو نظر باقی طور پر ہم مرد اپنے گھر میں مختار اکل ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی شادی شدہ فراموشی ہمارے سامنے یہ دھوئے

کر بیٹھے کہ وہ اپنے گھر میں مالک کی حیثیت رکھتا ہے تو اسے باور نہ کرنا۔ کیونکہ ہمارے
 اہل گھر میں ہمیشہ بیگم صاحبہ کا حکم چلتا ہے۔ ہمایونی اسی کی تحویل میں ہوتی ہے۔ اور
 وہی گھر کی ہر ضرورت کی ذمہ دار ہے۔ اس ذمہ داری کے باعث گھر گرستی میں کفایت
 شکاری اور گھر بیوہ سلیقے کی اسے بڑی بڑی باتیں سوچنی رہتی ہیں۔ اور یہ بات تو
 پیرس کی عورتوں میں عام ہے کہ وہ کسی کو نہ کھترے میں پڑے ہوئے کھاڑے
 بڑی عمدہ سیٹ اور زرک کئے ہوئے پانے پردوں سے انہیں فراک تیار کر سکتی ہیں۔
 میرا تجربہ تھا کہ عورتوں کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے غلیل ہر فرانسسی گھر خوا
 وہ شہر کے کسی گنجان علاقے میں ہو یا شہر کی گنگا گلی سے دور دیہات کے کسی فیہر عورت
 کو نے میں اتنا حسین نظر آتا ہے کہ اس کے کینوں کی شائستگی کا مزہ معرفت ہونا پڑتا
 ہے۔ یہ شائستگی کوئی ذاتی چیز نہیں۔ قومی ورثہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے آج
 فرانس کی وہ حالت نہیں جو سترہ سو کے وقت تھی۔ اب اس کی طاقت میں ایک نیا پان
 اور واضح زوال آگیا ہے پچھلی جنگ عالم نے تو اس کی سیاسی حالت میں ناقص
 کر دی ہے کہ اس کی سابقہ سلطنت میں سے شام و لبنان، ہندوستانی ویت نام مراکش
 اور بعض دوسرے مقبوضات آزاد ہو چکے ہیں۔ طیفوس اور الجزائر میں بناوت کی آگ
 لگی ہوئی ہے۔ بین الملتی معاملات میں اب اسے پرانا مرتبہ حاصل نہیں۔ گریا فرانس کی
 حالت آج اس حد تک ہے جو کسی زمانے میں مدورجہ ہاؤس نظر تھی۔ مگر گزرتی ہوئی
 عمر کے ساتھ اب اس کی کشش میں ایک فطری کمی واقع ہو گئی ہے۔ لیکن سیاست

برصغیر کی دنیا میں فرانس اب بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ سیاسی متنزل سے اس کی شائستگی پر کوئی حکومت نہیں چھائی۔ آج بھی غارتخوئی اور بالیس کے تیار کئے ہوئے ملبوسات یا شیشیرلی اور لادوں کے عمل پر کا رتیر اور ہنرک کے زیورات ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دنیا میں ہرنے فیشن کی طرح رکھیں۔

انہیں خیالات میں غرق ہیں چلتا چلتا ادنیٰ کے خانے پر تراکا ویرو کے وسیع چوک میں جا پہنچا۔ چوک سے اُگے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روپلی کرنیں شیلو کے حسین محل سرا کی پرشکوہ عمارات کے طویل ساروں کو تراکا ویرو کے بانات کے دہرے دہرے درختوں، پتھروں کی کیا دیوں اور گھاس کے وسیع تھنوں کے اس خشنما خطے پر پھینک رہی تھیں۔ جو چوک سے اُٹھ کر دیانے سین کے کنارے تک چلا گیا ہے۔ میں چوک سے نکل کر محل سرا کے مقابل کے چبوتے پر جا نکلا جس کے اطراف میں سیر کو نکلے ہوئے لوگ بے ٹکری سے اور مرد و عورتوں سے تھے۔ یہاں میں نے پیرس پر حسرت دیاں کی ایک نظر دوڑائی۔ سامنے سست روہین کا مٹیالا پانی شاں دے مار کے باغیچے سے ٹکراتا بھروں اور کشتیوں کو تھپتھپاتا یوں چپ چاپ چلا جا رہا تھا گویا اسے پیرس سے میری روانگی کا پورا احساس ہے۔ ناسٹل پر اخیفل کا چر شکوہ مینار اٹل اور محکم ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طحانی روشنی میں ساکت و جامد کھڑا مجھ سے پرچہ رہا تھا کہ میرا جانا آخر یا کیسا ضروری تھا۔ اس سے اُگے ٹھٹھی اکیڈمی کی بلند عمارت سر جھکائے کھڑی تھی اور

دودنچولین کے مزارِ اولیٰ کا سنہ گنبد کسی مبہم افسردگی میں ڈوبا ہوا کن اکھیوں سے مجھے تک رہا تھا۔

میرادل کچھ افسردہ سا ہونے لگا۔ ملاں کی یورش کو روکنے کے لئے میں نے پیچھے مڑ کر پیٹے دی شیف کی علامات پر نگاہ ڈالی۔ اور ان کے اندر رکھے ہوئے کمالات فن کی عظمت پر غور کرنے لگا۔ اس محل کے مختلف حصوں میں وہ پار محاب کے تھے۔ بن کے نواد کو دیکھنے کے لئے میں کئی مرتبہ بیاں آیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اس عمارت کی سیر نے مجھے کتنی لطیف کی گھڑیاں متیا کی تھیں۔ میوسی دی لامیون میوسی دی لامیون میوسی دی مونیو ماں فرانسی اور میوسی دو فوکلور فرانسی نے میرے ذہن کو کس قدر جلا اور میری معلومات میں کس قدر اضافہ کیا تھا۔ پھر مجھے پیرس کے محاب گھروں کا خیال آیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا پیرس ان تعداد محاب خانوں کی وجہ سے خود ایک عظیم محاب خانہ ہے۔ اور پھر میرے دھیان میں نوور کا نقشہ آگیا۔ جس کی محبت کے نیچے انسانی فطانت کے معراج اور استعداد کے جملہ کالات کا دنیا بھر میں سب سے بڑا خزانہ چند فرامک خرچ کرنے والے با ذوق ناظر کے لئے ہر وقت چشمِ براہ رہتا ہے۔

مجھے یاد آیا جب میں پہلی مرتبہ اس عمارت کے اندر گیا تھا تو اس کے ان گنت نواد کو دیکھ کر مجھ کو نچکا سا لگ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا فن کا دی اور حسن آفرینی کے اتنے سارے سامان کو دیکھ کر میرا ذہن متزلزل ہو گیا ہے۔ اور کسی چیز کی مائیت مجھ میں نہیں

آہیں۔ اس محل کے اندر زمین کے لہجے، سمندر کے سینے اور پہاڑوں کے جوت میں سے نکلائے ہوئے خزیئے یا عمدتیں اور ماقبل تاریخ زمانے کی مٹی ہوئی تہذیبوں کی بیش بہا یادگاروں کے ساتھ ساتھ ناپائیدار اور فانی انسان کی جاوہانی تخلیق کی ایسی ایسی ابدی چیزیں جمع تھیں۔ جن پر میری قہر کہیں جھتی نہ تھی۔ میں پریشانی اور ذہنی الجھن میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اور میری مثال اس بھوکے آدمی کی سی تھی جو اچانک غور و نوش کی قزواں چیزوں کو اپنی دسترس میں دیکھ کر بے صبری سے ہر تاب میں بدتمیزی سے ہاتھ مارنے لگتا ہے۔ میرے سامنے مائیکل، بنگلہ، مینار ڈوڈا، پنچ، رفیق، دلاسل، انگریز، گویا، امبرال، روہی، ہاسیز، لے ہی نہیں بلکہ ایران، تووان، چین و ماچین، مشرق و مغرب کے ہر خطے اور علاقے کے عالی مقام استادوں کے فنی کمالات کی مثالیں موجود تھیں۔ مٹی، پتھر اور سونے چاندی کے خروٹ بسنگی، آہنی اور چنلی سامان و حیات اور دانت کی چیزیں، ہیرے موتی اور جواہرات، پارچات اور زیورات کے ان گنت خزانوں میں سے میں کسی کس چیز کو دیکھتا۔ تین گھنٹے کی پریشانی کے بعد میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

چند دن بعد میں پھر روہی میں پہنچا۔ مگر آج میں صرت دو چیزوں کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ ونیس دی مائیکل اور ٹونا لیزا۔

مائیکل کا شجرہ آفاق اور عجب بڑا روزگار مجھے روبرو کی نئی منزل میں ایک روشن اور فراخ کرے کے اندر ایک گھومنے والی کرسی پر نصب ہے۔ میں اس کمرے میں داخل

بجائے تو مجھے عجیبے کی موجودگی کی وجہ سے خود اس کمرے کی ساری فصائیں ایک ناقابل
تشریح مگر محدود و محدود اثر عظمت اور فضیلت چھائی ہوئی دکھائی دی۔ میں وہ بے
پاؤں اس نئی روح مرمر کے سامنے آیا۔ دو دھیا سپید پتھر پر برقی روشنی کی کرنیں
ابھرتی، اٹھتی، مانند پڑتیں، شمع ہر تیں۔ دل کشی کی عجیب کیفیتیں پیدا کر رہی تھیں۔
زہرہ اپنے مژدول جسم، متناسب اعضاء اور بے عیب ناک نقشے کے مختلف
گوشوں کی نمائش سے انسانی جسد کی ہمارا آفریں اور مکمل ترین صورت کو خود اسی
کے سامنے یوں پیش کر رہی تھی۔ گویا کہ ربی ہے کہ قدرت نے انسانی جسم کی
صفات جمال کے لئے جو معیار مقرر کیا وہ دراصل یہ تھا۔

اسی وجدانی کیفیت اور قدما فرائی کے مزاج کے ساتھ میں مونا لیزا کے
سامنے پہنچا لیکن مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ کہ اس معروف زمین تصویر میں وہ جان
اور دل کشی کیوں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ جس نے اس کی آفریش کے دل سے
فن کاروں اور فن شناسوں کی طبیعتوں کو طرح طرح کا فیضان اور ان کی رُوح کو
ابدی سرستی اور سرخوشی بخشتی تھی۔ میں سوچنے لگا اس تصویر میں کیا بات تھی جس
نے عام چہروں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات شریف، بطبع پرستاروں کو بھی اس
میدھی سادھی تصویر کے سر پہ پرچھوڑ کیا تھا۔ مجھے دلچسپ و پیرو گیا سے ہمہ دلی ہنسی
تھی۔ جس نے اس تصویر کو روہ سے اٹاکر خواہ مخواہ اپنی جان کو طویل قید و بند کی
صورتوں میں ڈالا تھا۔ پیر و گیا کے اس خیال کی تریں قدر کر سکتا تھا کہ اس نے

فی الحقیقت یہ تصویر اس سے چرائی گئی تھی کہ یہ فرض کی نہیں اس کے ملک مملی کی ملکیت تھی۔ جہاں منہات پرلین کے دوران میں فرانسیسیوں نے اسے ملکی نمیت کہہ کر غیر اخلاقی طور پر لٹا تھا۔ اور جہاں اسے اس کے سب طیل القدر فرزند کی یادگار کے طور پر واپس لٹا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے اس بیان پر مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ فی الحقیقت اردو میں آیا ایک دوسری تصویر کو اڑانے کی نیت سے تھا۔ مگر پھر اس نے میرا رٹو پنچے کے اس شکار کو دیکھ لیا اور مونا لیزا کے قدوسی چہرے کے ملکوتی تہمت نے اس کے ارادوں کو کچھ اور بات سمجھا دی۔

میں سوچنے لگا کہ اس بے لطفی کی کیا وجہ تھی۔ کہیں میں وہ مرزا داں تو نہیں تھا جس پر کلام نرم و نازک بے اثر ثابت ہوا کرتے ہیں؟ لیکن اگر میں مائیکو کے مجھے کا لٹے سے سکتا تھا تو پھر اپنے وجہان اور ذوق پر شبہ کرنے کے لئے میرے پاس کوئی وجہ نہ تھی میں ٹاریسی کے عالم میں محل سے باہر آیا لکھنا ہوا تو لریز کے اس پانی باغ میں جا نکلا جس کی روشنیوں پر کبھی ماری انترنیت لگشت کیا کرتی۔ ہیزے کے درمیانی خشتی راستوں پر عشاق باہوں میں باہیں ٹٹالے اور گھر طرہ آدمی ہاں بچوں کو ساتھ لئے شام کی ہوا کھا رہے تھے۔ سامنے چشمت کے سیاہ نام درختوں کے سایوں سے پرے چینی چلاتی میز و نثار کا دوس کے شور میں ڈوبے ہوئے پلاس دی لاکشکارو کے سیاب صفت فردوں کی پھوٹا برقی روشنیوں کی جگہ گاہٹ میں منور ہونے لگی تھی۔ اداوان کے وسط میں فرعون عیسیس عثمانی کی سنگی لاٹھ دہان حال سے کھسک رہی تھی۔ داستان عظمت کو دہرا رہی تھی۔ اور اس سے

مجھے شانہ سے اینٹے کی فراخ سڑک کے دونوں طرف تھوہ خانوں کی شنات روشنیاں
 جھپٹنے میں مقیش کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے سڑک دوہر پر ایک نظر ڈالی۔ کار و سیل کی
 رومی محراب کے عقب میں تاریکی سے چھٹی ہوئی شاہان فرانس کی عظیم الشان قباسم گھاؤ
 تواریخ کے باغات کو ریوی ریوی کے جھنگامہ پر دریا نارا اور دھپائے سین کے گرسے
 پانیل سے بچانے کے لئے اپنے بازو پھیلانے لکڑی مٹی۔ ہر چیز اس ماحصلے سے کس قدر
 حسین کس قدر دل فریب نظر آ رہی تھی

* اور میر میں بھر گیا کہ مرنالیزا کی تصویر میں مجھے اس کی غصہ جس باذہیت کیوں دکھائی دے
 دی تھی۔ مجھے خیال آیا۔ فاسد حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور آرزو اور اشتیاق اس میں کشش
 پیدا کر دیتے ہیں۔ حسین اشما، فاسلے سے دیا وہ حسین اور عظیم چیزیں اور عظیم تو دکھائی
 دیتی ہیں۔ اور جب کوئی حسین یا عظیم چیز ہمارے سامنے فاسلے پر ہو تو اس کو دیکھنے کی
 آرزو میں ہم جوں جوں اس کے قریب جاتے ہیں ہمارا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ بھڑ
 زیادہ کچ کشش ہوتی چلی جاتی ہے۔ تھے کہ جب ہم اس کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔
 تو اس کے حسن کا سحر ہم کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ نادر ڈوڈو دہنی کا شکار۔ دور
 کے جس کوسے میں آویزاں ہے وہ اس قدر مختصر ہے کہ جیسے ہی آپ اس میں داخل
 ہوتے ہیں۔ یہ غرقۃ العین میں آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ جیسے اس کے کہ آپ کا
 اشتیاق آپ کو کشاں کشاں اس کے حضور میں لے جائے یہ خود ہے آپ کو آپ کی
 خدمت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں آپ اس کی قدر اور عزت نہیں

کر سکتے۔ سرزمین نے اپنے دفتر کا کمرہ اتنا بڑا رکھا ہوا تھا کہ ملاقاتی ایک کو نے سے داخل ہو کر دو دفناصلے پر دوسرے کو نے میں رکھی ہوئی نیز کے سامنے پہنچنے تک آہر کے رعب و جلال سے خوفزدہ ہو کر بری طرح بے حال اور بدمعاش ہو جاتا تھا۔

مغلوں کو حسن کے نقارے کے لئے فاصیل کی اہمیت کا جو احساس تھا۔ اس کا ثبوت ان کی تمام دفعیہ المرتبت عمارت میں ملتا ہے۔ جب میں نے پہلے پہل تاج محل کو دیکھا تو مجھے ان کے مذاق حسن کے اس نفیس پہلو کا خود بخود بدیع القلم احساس ہوا۔ جس وقت میں اندر جانے کے لئے داخلے کے دروازے کے باہر وسیع چبوترے پر آگے بڑھ رہا تھا تو حقیقت میرے ذہن سے یکسر فراموش ہو چکی تھی کہ تاج محل کی اصل عمارت داخلے سے کوئی فاصلہ بھر آگے واقع ہے۔ میں بکھڑکا تھا جیسے ہی میں سامنے کے دروازے میں سے گزروں گا میں تاج محل کے اندر یا سامنے پہنچ جاؤں گا۔ لیکن جب چبوترے کو طے کر کے میں بڑے پچانک کی محراب کے سامنے آیا تو انسان کے حاد دانی حسیق کی یہ غیر فانی یادگار پورے چاند کی خشک روشنی میں مجھ سے دو فاصیلے پر ایک قابلِ تصریح کیفیت میں کسی سماوی موتی کی طرح کھڑی سپریم کو استنزا سے تک رہی تھی۔ میں نے جلدی سے داخلے کے عظیم جہے کو طے کیا اور نیچے پائیں باغ میں اترنے والے سنگی زینے پر آکر کھل فضا میں ڈگ گئی۔ سامنے سرسبز نہر جس کے اندر سپید خدوں کا پانی سیلاب کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے کناروں پر گھنیرے درختوں کے جھڑوں میں کھڑے صد ہا سر و سکن کے ساکت و جامدا شہاد میرے اور تاج محل کے درمیان

پاسبانوں کی طرح مائل تھے۔ نہ جانے کتنی دیر میں لطف اندوزی کی اس دہائی کیفیت میں زینے پر کھڑا اس پاکیزہ عبادت کو نکلتا رہا۔ پھر میرے دل میں ایک بے پناہ اشتیاق کا جیش اُبھرتے لگا اور میں ایک خطرناک کیفیت کے ماتحت خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں تاج کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے سر دی حسن کی لالچال بہار کا نقشہ واضح سے واضح تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور جب میں بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تو اس کے وسیع و عریض چہرے پر کیف سیارہ رسید فرش اس کے سر میں کشمکش کی باریک چامیوں کی نفاس تاج کے مدعا سے پرکھی ہوئی عربی عبارت کے تمام ہندسی اس کے سبک میانوں کی مساوی لطافت اور اس کے منور گنبد کی پاکیزگی کی دیدار اور اس سے میرے قلب میں ایک کچھلی طاری ہونے لگی۔ اور میری جیب میں تاج کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تیسرا دل دہانہ اس دہائی کیفیت میں ڈوب گیا۔ جو بس اوقات ماہرین فن قائلوں کی ہمدردی گرم ہوتی ہوئی مجلس سماع میں آپ پر از خود طاری ہونے لگتی ہے۔

اپنے خیالات میں غرق میں اس وقت شیلہ کے محل کو بھیجے ہوئے لڑکے دریا سے سین کو جو روکنے کے بعد تھیلہ اود کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ اُنٹر لاکھ غلامی فراہم کی لاگت سے تعمیر کئے ہوئے اس ۸۰ فٹ طرز وادی مینار کے چاروں پاسے ٹال کے مار کے مہین کے تیس ہزار فٹ عریض تختے کے سینے پر کسی مافوق الفطرت پرندے کے سخت گیر جنوں کی طرح کوشے ہوئے تھے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو بلند سی

ڈرتے ہیں اپنی ان نفسیاتی کیفیت کا اعادہ مجھے اس وقت ہوا تھا۔ جب میں نے کئی برس پیشتر قلب مینار پر چڑھ کر نیچے جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں چکر کر بیچھے نہ گر جاتا تو شاید میں موت سے منسوب ہو کر پھلانگ لگا دیتا۔ اس نفسیاتی کیفیت کے احساس سے مجھے پہلے پہل فراہمیں، انجینئر ایٹل کی اس کمال آزمائش قسیر سے کچھ ایسا ڈر سا لگا تھا کہ اوپر چڑھنا تو درکنار مجھ سے نیچے سے اس کی بلندی کی طرف دیکھا ہی نہیں گیا۔ پھر میں نیویارک پہنچا۔ جہاں دنیا کی وہ سب سے اونچی عمارت کھڑی ہے جس کی ایک سو دو منزلیں زمین سے اُنھ کی ایک چوتھائی میل تک اوپر آسمان کی طرف نکل گئی ہیں۔ میں کئی مرتبہ ایپارٹمنٹ بلڈنگ کے دروازے تک گیا۔ لیکن اوپر جانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ آخر ایک دن جی کوڈا کر کے میں اس کی انتہائی منزل پر پہنچ گیا شام کے پانچ بج رہے تھے۔ صبح دیا نے جی کی کمر میں اُترنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے حرکت کر کے نیچے نظر ڈالی۔ آنتاب کی شکل داری کمروں کی گلابی روشنی میں عمارت کا جناتی سایہ نیویارک کی بلند عمارتوں کے سیلاب پر سے تیرتا ہوا دیا نے ایٹل کے پانیوں کو چھو رہا تھا۔ نیچے بانادوں اور گھیلوں میں کام کاج سے قاصد ہونے والے لوگوں سے بھری ہوئی گاڑی اور بسیں جنیٹیوں کی طرح رنگ رہی تھیں۔ میں نے سامنے نعرہ دہرائی تو میری نگاہیں لاٹک، ٹیلیفون کے تاروں و ثروت کو دیکھتی ہوئی نیویارک کی اونچی اونچی عمارتوں کی چٹانوں سے ٹکراتی درسدیل تک شفق کے قریب میں باہنہیں۔ پھر میں نے اوپر بچکے چکے آسمان کی طرف دیکھنے کے

بعد نیچے ہر محلہ تا ایک ہوتی جوئی شرک کی جانب جھانکا۔ مجھے ایک ساعت کے لئے
 میں محسوس ہوا گویا میں ایک ایسے روپہلی اور طلائی ستون کی کسی وسطی کھڑکی میں کھڑا
 ہوں جس کے توسط سے آسمان اور زمین کا وصال ہو گیا ہے۔ اس عجیب و غریب
 نظارے سے میں دم بخود رہ گیا۔

نویادک سے واپسی پر میں پیرس میں پھر وارد ہوا۔ تو میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا
 تھا کہ میں ہر غنڈی پر جا سکتا ہوں اور پھر اس اعتماد کے طفیل میں ایک دن وہیں منتقل
 حینار کی چھت پر جا پہنچا۔ اوپر جا کر میں نے سامنے نظر دوڑائی۔ صاف مطلع کی شفات
 فضا میں چالیس پہاس میل تک کا نظارہ دکھائی دینے لگا۔ جس کی سبکے نمایاں چیز
 پیرس کے مضافات کی ہر یاد دل میں بیٹھنے ہوئے ٹیرے ترچھے وریٹے سین کا حساب
 کی طرح چمکتا بڑا پانی تھا۔ پیرس نے پیچھے مڑ کر بائیں جانب شہر کی عمارات پر لگا اڈال
 کچھ فاصلے پر آفرید کا سنبر لگنید اس غزینے کی غمازی کر رہا تھا۔ جو پیرس کے جہدِ فنا کی
 صورت میں اس کے نیچے دفن ہے۔ اس کے پیچھے سوں پرناس کا علاقہ پھیلا ہوا
 تھا جس کے بائیں جانب باغات کھمبرگ سے دسے فرائس کی سبک بڑی فضیلت گاہ
 حامد سوربوں کی عمارت اس مالی قدر مزار کے سامنے کے نیچے کھڑی تھی جو غنچہ
 کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس میں فرائس کے ایسے جلیل امثال مصنفین دفن ہیں جن
 پر ہم زندگی میں ہنستے ہیں۔ اور جن کے مرنے کے بعد ہم انہوں سے انہیں یاد کرتے
 ہیں۔ اس مزار کے ایک طرف کنارت سوام کا ہیبت آور گر با تھا۔ اور دوسری طرف

کو سہ قریب کے نقشے پر تعمیر کی ہوئی وہ جس میں سہد جس کے بنار کی مرگشی طرز تعمیر سے
 کچھ تھلے کی مسجد کی یاد آتا۔ وہ جو رہی تھی۔ مگر کچھ تھلے کی مسجد کا خیال آتے ہی سیلو حیاں
 قلب بنار کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا سر کچھ ایسا طبیعت بگڑنے لگی۔ اور میں اسے
 خوف کے آئینفل کی ہنسی سے اتر کر اپنی فروتنی کی قدر کرتا ہوا پھر شاں دے مار کے
 چھستان میں پہنچ گیا۔

آج جب کہ میری میں میرا قیام اپنے غلے کو پہنچ گیا تھا۔ تر آئینفل کے بنار کے
 پاس سے خیرا دہی طور پر گزرتا مجھے بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور یہ بازوید اس احسان
 مندی کا اظہار بن گئی۔ جو میری کی طرف سے میں محسوس کر رہا تھا۔ میری کے آثار کی
 سب سے بڑی چیز پر آخری نظر ڈالنے کے بعد میں ویدائے سین کے باتیں کنارے
 کے ساتھ ساتھ پرانی کتابوں کی ان قابل قدر چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو دیکھتا آگے بڑھ
 گیا۔ جہاں کی ظاہر اکائیات میں سے منہا ہوا وہ مختصر سا چوبی کبھی ہوتا ہے جس کے
 اندر سے اہل پیرس اور غیر ملکی سیاحوں نے کتنے نسخے، نواد قیصریوں، نایاب کتابیں
 اور زمانے کی کیا کیا ماحول کیا ہے۔ پھر میں چلتا چلتا تنک کر کچھ دیر ستانے کیلئے
 دریا کے پشے پر ٹیک لگا کر سامنے دیکھنے لگا۔

میرے مقابل وہ شرہ افاق علائق تھا جس میں میں کو انڈیا میں میں نے پہلے
 اور میں پر تاس کے ٹانڈے بیٹھے ہیں۔ اسی میں بول میں گاؤں اور فریب ملک بھی شامل
 ہے جس کے لاتعداد قہرہ خانے بے فکر نوجوانوں اور یونیورسٹی کے طلباء سے ہر وقت

بھرے رہتے ہیں۔ کبھی پیس پیس کے اکثر مشہور مصنف، آرٹسٹ، نغمہ ساز، اور فن کار
 جمع ہوا کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ہیں اس شہر کے بعض آدماء مزاج اور خطرناک لوگوں
 کا دیدار بھی ہو جاتا ہے لیکن اپنے کمینوں کے طباخ کے اخلاص کے باوجود اس علاقے
 پر ہمیشہ پیرسی غلبہ و فراست اور استعداد و ادراک کی حکمرانی رہی ہے۔ یہاں دنیا بھر
 کے ہر صنف کے فلسفیوں اور مفکرین کے خیالات آج بھی اسی طرح بازاروں اور گلیوں
 میں زیر بحث آتے ہیں۔ جس طرح قوم مخالفوں کی میزوں یا دورگاہ کے چمروں میں علی
 اور ابلی، مذہبی اور فلسفیانہ نظریات کی یہ ایک سی جہاندار منڈی ہے۔ جس میں گاہکوں
 کی نسبت آڑھتوں کی تعداد ہمیشہ غالب رہی ہے۔ یہاں ایک دہانے میں مغربی دنیا
 کے نصف سے زیادہ مشہور و آرٹسٹ اپنے محبوں اور تصویروں کی رفاقت کو چھوڑ کر
 سستانے، تازہ دم ہونے اور حاضرین سے تبادلاً خیال کرنے کے لئے جمع ہوا کرتے
 تھے جس کی موجودگی کے باعث پیرس کے اس فی حیات علاقے کے بیشتر گمراہ اور غیر معروف
 دور تر خاؤں، مجرموں، مٹھکوں سے اجیار سے لے کر بچا سوئٹک، انسانی بہن کے
 کمال کا وہ سرچشمہ چھوٹا رہتا ہے جس نے دنیا کو سب کچھ دیا ہے۔

اگر آپ اس علاقے میں نکل جائیں تو آپ کو عجیب و غریب متاخر دعوت نظار
 بخشیں گے۔ اگر گھاس کے تھتے پر کوئی جشی عابد علم عظیم بندہ کی کسی دقیق مشق پر
 غور کر رہا ہے تو اس کے پاس ہی دو نادر اشیاء بالوں والا مضمی اور زور و زجاج بھی
 اس گلیس کے کسی ایرانی کھیل کے اصل متن پر نوکر رہا ہے۔ جس کے اپنے انماک

میں قریب کے ان شرخ رنگ قسمیوں اور بھڑکیلی ٹائیوں والے لڑکوں کے شور کی آواز غل نہیں جو آپس میں تھنڈے یا غم کے کسی کھیل پر بحث کر رہے ہیں۔ ان سے پرے ایک بڑے نیچے بھی بوٹی نیچے پایک، وحیرت کی عورت چپ چاپ بیٹھی کسی گھر پر سنے کو سل کرنے میں مستغرق ہے۔ اس کے پہلو میں ایک سن رسیدہ مرد منہ میں لپٹائے اپنے خیالات کی دنیا میں ڈوبا ہوا خلا میں گنگلی گھٹائے بیٹھا ہے۔ ان سے ہٹ کر ایک طرف کو گھاس کے تختے پر پیڑ کے تنے سے تکیہ کئے دو ماشق و مشرق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا و مافیہا سے یوں بے خبر بیٹھے ہیں گویا وہ پیرس میں نہیں بلکہ وسطِ سندھ میں کسی بے آباد جزیرے میں جا اترے ہیں۔

یہ بھی ایک پیرس ہے، یہ وہ پیرس ہے جو سٹول سیار کا پیرس نہیں، سبب یہ نزع صاحبِ ثروت فرانسیسی کا مسکن بھی نہیں۔ یہ دو شخصیں، ایک دیوانہ کا پیرس بھی نہیں۔ یہ وہ پیرس ہے جس کے بغیر شاید فرانسیسی کمال کی وہ یادگاریں کبھی تھیں جو پیرس میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ ادھر جس کے دھڑکنے سے شاید وہ کمالات بھی کبھی سحر میں نہ آتے جو ان یادگاروں کا موجب ہیں۔

جب میں دو گھنٹے کی چل قدمی کے بعد پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں بھرتا پھرانا ہرٹل میں داخل ہوا۔ تو شام کے چھ بجے رہے تھے۔ یہی کاؤنٹر پر گیا۔ ڈسک کے پیچھے مادام حسبِ معمول اپنے کاندات کی پڑتال میں موصوفیٰ میں قریب پہنچا تو اس نے سر اٹھایا۔ پھر ادا شدہ شفقت سے مسکرا کر پیچھے کھڑکی۔ مجھ کو کی چابی دیتے

ہر لے کئے گئی : آپ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کہا : ہاں آج میں
 کچھ دودھل گیا تھا۔ اور ابھی مجھے پھر ہانپ ہے : اور ام کا چہرہ بشارت سے کھل گیا۔
 کئے گئی : آخر ہیرس نے آپ پر بھی ہار دے کر ہی دیا۔

(۳)

جب سماسات بچے کے قریب لیونا ڈاؤ میں بڑھل سے باہر نکلتے ہیں تو
 سرادھب کا تسلط پیرس کے گلی کوڑوں پر چھا چکا تھا۔ اور اس کی شبینہ زندگی کی دوہا
 آفریں رنگینی انگریزایاں سے کر بیدار ہو رہی تھی جو آدھب کے ساتھ ہی پیرس کی فضا
 بھڑت پھلانے لگتی ہے۔ یہاں سے سامنے وہ حسین شاہراہ تھی جو اندھ دی لا اپا کے
 نام سے آپ کے بنگار پر چوک سے لے کر فرائس کے شہر و تھیٹر کامیڈی فرائس
 کی عمارت کے پاس سے گزرتی چلیے رائل کے چوک تک شمالی جزیرہ جلی گئی ہے۔
 لیونا ڈاؤ نے شورہ دیا کہ ہم اس بازار کے لطف کا سہارہ بیٹنے کے لئے کچھ
 دیر پیدل چلیں اور ہم باتیں کرتے دکازوں کی خفیس اشیا کو دیکھتے آپرا کی طرٹ چلنے
 لگے۔ برقی ٹھنوں کی شفاف روشنی میں سارا علاقہ جھڑو بنا ہوا تھا۔ سیر تلشے
 کا لطف بیٹنے والے مرد و عورتیں گاڑیوں میں بہتوں پر اند پیدل اور عرصہ آدھرا ہا ہے
 تھے۔ پشٹیروں پر ان لوگوں کے ہجوم تھے۔ جو دکازوں کی جڑیں کھڑکیوں کے
 پیچھے رکھے ہوئے قیمتی سادہ سامان کی دیو سے اپنا دل بہلا رہے۔ ایک شال

پر لگی ہوئی کتابوں، تعلیم رسائل اور حقوق جماعت کی دلچسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہم باتیں کرتے، اُپر کے چوک میں پہنچے جہاں سے پھٹ کر وہ پُر ثروت بانٹا رھاٹ میں دور دورہ نکل گئے ہیں۔ جو بے گراں عبور و کسلاتے ہیں۔ اور جن میں پیر کی تنقیس و کانیں گراں قہر خانے، مشور سنیما، تھیٹر، منڈوسے، ڈسنگا ہیں اور شبینہ کلبس واقع ہیں ہمارے سامنے تین ایکڑ زمین پر پھیلے ہوا پیر کی کا اچھا باؤس تھا۔ جو کچھ عرصہ پہلے تک شاید دنیا کا سب سے بڑا تھیٹر منصوبہ رہتا تھا۔ اور جواب بھی اپنے عظیم شیخ، غیر معمولی گراؤ خانے، وسیع اور خوبصورت منقش و مطلقاً چھت اور نیلے سنگ مرمر کی مرغلوں، پچھلے برنج کی کوریوں، دیواروں پر کھدی ہوئی جاندار تصویروں، پُر شکوہ پردوں اور حمیرا رنگین روشنیوں کی وجہ سے شاید اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

یونٹارڈ کی تجویز کے مطابق ہم دائیں طرف شرکموں مائر کی اس عجیب و غریب دنیا میں گھومنے لگے۔ جو دن بھر گزشتہ رات کی بے خوابی کی وجہ سے نیم غفلت کی کیفیت میں کھوئی کھوئی سی دہتی ہے۔ اور پھر جیسے ہی شام کا جھپٹا شکر کو اپنی پیٹ میں بیٹے لگتا ہے تو زندگی کی تمام پرجوش علامتوں کو اپنے جلو میں لے کر جیاد رہ جاتی ہے اور اس کا مدار کے ہاتھار کو گرم کرتی ہے۔ جو ہر نو وارد کو بعض اوقات مشکوک اور بعض اوقات حیران کن اور بعض اوقات دلغریب نظر آتا ہے۔ یہیں اگر فریئر رہے اور ملا تیرا کے وہ شہرہ آفاق تھیٹر ہیں۔ جن کے شیخ پر پیر کی فن کاروں کے دماغ ناظرین کی توجہ جمع کئے، رنگ، روشنی، عہد سات اور رہنہ اجسام کی آپس پر کشش سے میل جول کھینچتے

کا اجتماع کرتے ہیں تو اسی علاقے میں وہ تھیںڈ بھی ہیں۔ جن میں ایسے ایسے دور انگیز
پر جوش اور خیال افروز کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ جن میں بعض اوقات پرمیں کو مدخلت کرنا
پڑتی ہے۔ اور جو بعض اوقات اپنے خطرناک سیاسی اور فلسفیانہ خیالات کی تبلیغ سے
فسادات کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔

ہم باتیں کرتے باتاروں کی رونق کو دیکھتے بہت دور نکل گئے۔
پھر سب ہم شرک کے کٹارے کو کھدایس کے لئے گزرتی ہوئی خالی انگلیں کا
انتکار کرنے لگے تیسری توبہ عقب کے پر شور کیفے کی طرف گئی جس کے دروازے
میں آئے جانے والوں کا ناقصا بڑا اتحاد۔ سڑک کی سبز کرسیوں پر خوش پوش اور
خوش خورد مرد و عورتوں کا جرم ہمہری کاٹھے اور گلاسوں کے شور سے بنے کھانا ایک دوسرے
سے بڑے اہانک اور دل ہوزی سے گفت و شنید میں گھٹا بڑا اتحاد یہ پرمیں کے وہ فرزند
تھے جو باتوں کو حیات کا لازمہ اور زندگی کا بااصل تصور کرتے ہیں۔ جن کے نزدیک قسم
کی گفتگو بے صورت گپ بازی نہیں بلکہ کار آمد تبادلہ خیال ہے۔ اور یہ وہ مختصران پر
نعتیں جن کے نزدیک فاتحہ کا فراک شیر پٹی کی خوشبو، مار سین کے زیورات، روئی نشینی
کے لوازماتِ جمال، انٹرنیٹ کی مشاطگی، کرزیر کا ہینڈ بیگ، کھاسے کا جوتا، یا جادو کی
چھتری دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کافی کے ساتھ ساتھ کوٹنگ، وہ بکلی اور پیر کے
دور پل بد ہے تھے تقصیل اور لطیفہ بازی کا جنگامہ پاتھ اور گریت کے وجود جن کے
کشیف بادوں سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ لوگوں کے چہرے زبان حال سے کہہ رہے

تھے۔ کہے حیات کا جو عزمِ لہر زندگی کی جانگاہِ مصروفیتوں سے پس انداز ہو کر اس وقت
مسترب ہے۔ اس کی مسرتوں اور کشیدوں میں گزشتہ دن کو بھول جانا اور آئے دہے یوم کی
فکر نہ کرو۔

میرنا رٹنے پاس سے گذرتی ہوئی خالی ٹیکسی کو آواز دی ہم گاڑی میں سوار ہونے
گئے تو میں نے آخری نگاہ دیا اس اس حیات پر اور علاقے پر دوڑائی۔ پیرس کی تاناک
عشرت گاہیں خافی زندگی کی مادی مسرتوں کو چھو بیاں بھر بھر کر دیا۔ بی بھٹیں۔ ایک
ہمہ گیر بے فکری ہر طرف چھاتی ہوئی تھی۔ دودان ٹیکسی عمارات کے پیچھے کچھ ذمیلے
پر سیکرے کر معنی قلب مقدس کے، حند لائے ہوئے عظیم الشان سپید گرے کا بیولا
بلندی کی تاریک نغمائیں افسردہ و مغموم کھڑا اس بے پناہ جنگلے کا انخارہ کر رہا تھا۔
دیو دیوال کے نوتے پہنچ کر میرنا رٹنے ٹیکسی کو ناریخ کر دیا۔ اور ہم رات کے
کھانے کی تیاری کی خاطر میگزیلم کے مشہور طعام خانے میں اشتہار انگیزی کیلئے وائیل
ہوئے، سُرخ رنگ کی مٹلا پیش روپے اوپے اوپے؟ مینوں اور پیش قریت قالمینوں سے
مرزق ایک ہیٹ بٹسے کرے میں پیرس کے ممتوں بیتے کے افراد اور کسٹرا کے خوش آمد
نغات کے ساتھ اگل و شرب کے سنے حلق میں جزیمل کا، نادہ کر بے تھے ہم
ایک طرف بیٹھ گئے۔ تو میرنا رٹو کو باکر جاری عزورت کی تفصیل سمجھائی اور پھر اس مقبول
کی مقبولیت کا ذکر چھڑ دیا۔

پچاس برس سے نایدعت سے یہ کسیدان سلاطین یورپ اور امراد عالم کی جانگاہ

رہا ہے۔ رنج بھی دنیا کی بڑی بڑی نامور شخصیتیں اور بڑے بڑے بدنام افسانہ بیان اہلکار کی صحبت میں طعام شراب اور خوش وقتی کے لئے بڑی باقاعدگی سے آتے ہیں۔ میگنیم کے پرائیویٹ کمرے ابتداء میں زیادہ تر خلوت پسند عشاں کے استقبال میں آتے تھے۔ لیکن انہیں ایسے مشہور لوگ بھی استقبال کرتے تھے جنہیں منظر عام میں سامنے پر پیشنا گوارا نہیں تھا۔ رستوران کے اپنے نام کی طرح اس کے بعض ملازمین بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان میں سب سے مشہور گیزر د تھا۔ جس کی بذراہمی، حسن کارکردگی۔ اور عام مزو ماغی کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ پیرس کی نامور قاصد لائل اوتیرد جو باقاعدگی سے میگنیم کے ہاں آتی تھی۔ اور جس کے مانند کوئی اور حسین عورت فوئیزر بے کے سیٹج پر آج تک دیکھی نہیں گئی تھی۔ اچانک رستوران میں اپنا پچاس ہزار پونڈ قیمت کا بدوچ کھومٹی۔ گیزر د کو فوراً یاد آیا کہ جب اوتیرد داخل ہوئی تھی تو بار پر ایک گلاب کو اس نے مشکوک نگاہوں میں چومکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے جھٹ ایک ویٹر کو بلا کر کچھ فیہ ہدایات دیں۔ اور خود اس گلاب کے سر پہنے جا کھڑا بڑا ہتھوڑی ویر میں ٹیرٹری کی ایک بہت بڑی قاب سر پہناٹھائے سلنچ سے نکلا۔ اور اوتیرد کی میز تک پہنچنے کے لئے اس مشکوک گلاب کے پاس سے گزرا جیسے ہی وہ قریب آیا۔ گیزر د کے اشارے پر اس نے مشکوک کائی اور روک کر سوغلی کی پوری ڈش اس پر یوں پھینک دی کہ مٹھا کی کریم نے اس کے تمام کپڑے لت پت ہو گئے۔ وہ غصے اور جوش میں ملبلا کر

مجھے کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ کوئی احتجاج کر سکتا۔ گیرارد اور اس کے کارندے معذرت کے الفاظ کے ساتھ اُسے غسل خانے کی طرف لے گئے۔ یہاں جلدی جلدی اس کے کپڑے اتارے گئے۔ اور گیرارد کے مشاق باغیوں نے اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے دو گم شدہ بروچ ڈھونڈ نکالا۔

طوائف کے رہنے میں جب پیرس پر نادنیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ تو انہوں نے میگزیم کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یہاں گوزنگ اور دوسرے کئی تازی لیڈر قبضے کے دہان میں کھانے کے لئے آتے تھے۔ لیکن چونکہ اس رستوران میں بیچنے کے لئے صرف ایک ہی دروازہ ہے۔ وہ پیرس کی خفیہ انجمنوں کی قاتلانہ سرگرمیوں کے پیش نظر اس سے بہت زیادہ خوش نہیں تھے۔ پھر بھی اس سے دستبردار ہونے بلکہ انہوں نے ایاب شراب کی ڈیڑھ لاکھ بوتلوں میں سے ایک لاکھ کو بالکل سلامت کر ڈالا۔

جب ہم میگزیم سے اٹھ کر کھانے کے لئے لا ترو اور شاں کے حمام خانے میں داخل ہوئے ہیں۔ اُس وقت کوئی ساڑھے نو کا مل تھا۔ یہ رستوران تاریخی پیرس کے وسط میں ناترے دم کے گرجے کے المقابل دریا کے پار بائیں کنارے پر واقع ہے گلابوں کے لئے یہاں اس رسم کی بڑی پابندی ہے۔ مگر آٹنے سے پہلے میز مخصوص کرائی ہلنے۔ ہماری میز وقت کی کمی کے باوجود میز مارڈ کے صومخ کی وجہ سے مخصوص ہو چکی تھی۔ جب ہم کوٹ اور ٹوپیاں نیچے رکھ کر اپنی میز کی طرف، دریا کے گئے تو زینے کو ملے کو تے وقت لیٹنا ڈونے مجھ سے کہا کہ چھ گھنٹہ اس عجیبے روزگار رستوران کا انداز

خاص انعام پیری ہے۔ اس لئے اگر تم اس کے ملازمین کے طور پر رقیوں میں کوئی بات نہی دیکھو تو تمہیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں آخر ایسے بھی کیا طریقے ہوں گے۔ جن کے مشاہدے پر میرے ہڈیاں کے بے قابو ہونے کا اندیشہ تھا لیکن پھر میز پر بیٹھتے ہی مجھے پتہ چل گیا۔ کہ یونٹارڈ نے کچھ ایسا غلط مشورہ نہ دیا تھا۔

گلڈن کار بھی ہماری میز دکھا کر قہقہے مٹا رہی تھا کہ دو ویٹر ایک کر ہماری طرف آئے۔ اور جہازی سائرس کے دو میز کارڈ ہمارے ہاتھ میں دے کر ہمارے سر پر کھڑے ہو گئے۔ میں کارڈ کو دیکھنے لگا۔ تو جہول طعام فرانسیسی زبان میں تھی لکھت پانچ گنا غنایات پر غور و خاشا کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ فرانس تو خیر فرانس ہے مگر انگریزوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ان کے ہاں بھی اوپنٹے پاسے کے بوتل اور ریستوران میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کھانا خاص فرانسیسی انداز میں تیار ہوتا ہے جیو ہمیشہ فرانسیسی میں ہوتا ہے مثلاً اس کے کچھ نواز بھی ہوں گے بلکہ جہاں تک سیرا قلعہ ہے نتیجہ اس کا آج کے دن تک اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو مرغ سمجھ کر طلب کیا ہے تو وہ کچا نوکل آتا ہے کسی شے کو مچلی جان کر مانگا ہے تو وہ عقل و ملائمٹری ہے۔ میں سوچنے لگا کہ فرٹار ہمارے کا تو نام ہی جو نام تھا۔ اور نہ دنیا کا کوئی سا علاقہ ہے جو گرتہ خمار ہیم و تیر و نہیں۔

کھانے پینے کے سلسلے میں غیر دباؤوں کے کم معروف الفاظ اور اصطلاحات کے ہستیاں کے خیال کے ساتھ ہی میرا حیاں اپنے ملک کی طرف گیا۔ جہاں رسوم و

یتوہ کی پابندی اور کرماء تعلیم کے باعث آج تک دھاتی رتوں میں کھانے کو حاضر
 بھی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور پھر میرے حافظے میں حاضر کے لفظ سے متعلق ایک
 دلچسپ واقعے کے کوائف ابھرتے ہیں۔ کائنات میرے ایک ناخاندہ دوست سے
 تھا۔ جنہوں نے تعلیم سے بے بہرہ بولنے کے باوجود نانا جگ میں فرجی ٹیکوں کے
 ذریعے سے بہت سی دولت پیدا کر لی تھی۔

میں جاناہ صریح شخص پر گیا ہوا تھا۔ اور اس کے خاتے پر شام کی ٹوہن سے
 مہلی کی طرح روانہ ہونے کے لئے سامان باندھ رہا تھا کہ میرے سکول کے زمانے
 کے ایک دوست جنے اُٹھنے پر پوچھنے لگے کہ ال انڈیا ریڈ میں ڈاسے میں سوئے ہوئے
 والوں کو کیا فیس دی جاتی ہے۔ میں نے بتایا کہ یہی دس یا ستر روپے۔ کہنے لگے
 اگر تمہیں ایک چھوٹے سے ڈاسے میں بہت مختصر سے پارٹ کی ادائیگی کے لئے چاس
 روپے کی رقم ریڈ کے چیک کی بجائے نقد پیش کی جائے تو اس میں تمہیں کوئی ہڑت
 لڑے ہو گا۔ خضر صاحب کہ اس میں تمہیں صرف ایک ہی فقرہ ادا کرنا ہے۔ اور ویرل
 کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے تعجب اور شبہ کے عالم میں کہا۔ کہ میں حاضر ہوں۔ لیکن تفصیل
 معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے: تفصیل کچھ نہیں۔ صرف آنا سن دو کہ ٹیکسٹ اور
 احمدیہ دینی بیباں اُسے گا۔ میں جو کچھ اس سے کہوں گا۔ اس کی تائید میں گھر
 پڑے تو تمہیں صرف اتنا کہنا ہو گا کہ ہاں ٹیکسٹ تو کہہ رہا ہے۔ اس فقرے کی ادائیگی
 کے لئے چاس روپے پھر شاہی تھانہ کی خدمت کو ملے گا۔ صاب تیار ہو جاؤ کیونکہ باہر

ایک تانگر رکا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہ احمد دین ہی کا ہو:

احمد دین جیسے ہی اندر آئے یہ صاحب ان پر پرس پڑے۔ بڑی خشکی کے عالم میں کہنے لگے: یار چور عمری تجھے سو مرتبہ بھیجا چکا ہوں کہ جب کوئی ایسا کام کرنے لگے جس کا تعلق پڑھنے لکھنے سے ہو تو ہم سے مشورہ کر دیا کر۔ مگر تو نہیں آتا۔ اب تو نے جو درگوں کو عبرت کا اپنے ہاں کمانے پر بلا یا ہے تو کس سے مشورہ کر کے دعوتی رقعے میں ضیافت کے لئے سیدھے سادھے ویسی کھانے کی کبابے ماحضر کی شرط رکھ دی ہے کسی کم بخت سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس ملک میں کوئی نامعقول ماحضر کچا کی ترکیب بھی جانتا ہے یا نہیں؟“

احمد دین نے بڑی گھبراہٹ کے عالم میں میری طرف دیکھا، لگایا پوچھنا مایا ہوتا تھا کہ کیا واقعی اس سے کوئی بہت بڑی حاققت سرزد ہو گئی ہے۔ میں شاید سنس کر اس سارے مذاق کو ختم کر دینا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے من سے بے ساختہ نکل گیا: ہاں ٹھیک ہی رکھنا ہے! اس سے پیشتر کہ احمد دین کچھ کہے، عمارت دوست نے جھٹ ماحضر کے بارے میں ایک مولیٰ نیکو شروع کر دیا۔ جس میں ماحضر کی دقیق مامیت اس کی ایک سو ایک میر المعقول قصیں اس کے عجیب و غریب لوازم اس کے پکانے کے حیران کن طریقے اسے کمانے کے مخصوص ڈھنگ اور نہ جانے کیا کیا جمل تفصیلات بیان کرنے کے بعد کہات: اب ٹھیکیدار جی فدا پر سوچنے کو کل کو جب آپ کے ہاں چھاؤنی کے افسر و شر کے اہل کار اس پر مختلف ضیافت میں ماحضر کی رقعے پر

پر دوڑے اُٹھ گئے اور مٹے گا اُنہیں آؤ ٹھوٹا۔ یا کچھ ایسی ہی فضول چیز۔ تو آپ کی ٹھیکیداری کا روشن مستقبل ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گا انہیں؟

جے چارلس احمد دین خانے پر گریڈ بسٹ کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ اور میرے منہ سے ہر بے ساختہ نکل گیا۔ ٹھیک ہی ہوکتا ہے:

جب احمد دین اپنی اس افتاد میں ہم سے ملو کی انتہا کرنے لگے تو یہ صاحب کبھی گہری سوچ میں پڑے گئے، پھر کہنے لگے: ایک ترکیب ہے۔ عیدوار آباد کوں میں ایک صاحب کو ہانا ہوں۔ جن کے دسترخوان پر میں نے زندگی میں ایک مرتبہ حاضر کیا تھا وہ اتفاق سے ان دنوں کسی ریاستی کام سے مالیر کوٹہ میں چند دن کے لئے آئے ہوئے ہیں میں ان کے پاس جاتا ہوں۔ شاید وہ معاملے کو سنبھال میں اہمۃ رقم خرچ ہوگی۔ اس وقت تو تم مجھے تین سو روپے دے دو۔ پھر اصل ڈاکٹ کا تھینڈ ہو جائے گا۔ تو میں تم سے حساب کتاب کروں گا۔

جب احمد دین حدود پریشانی کے عالم میں رقم گن کر لکھ کی طرف رواد ہو گئے۔ تو ان صاحب نے مسکرا کر پچاس روپے میری طرف بٹھاتے ہوئے کہا: چند دن ہر سہیں نے احمد دین سے ایک سو روپے بطور قرض مانگے تھے۔ حضرت صاف ٹال گئے۔ میں نے کہا اگر سو کے اب عین سو دنوں تو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ سو میاں تم تو بلی کو سہانہ باتی ہم ہانہیں اور ٹھیکیداری۔

مینو دیکھتے ہوئے میز مار ڈالنے کا۔ سوپ اور مچھلی تو بوگی ہی مگر بھلے بریاں میاں کی

خاص چیز ہے۔ اگر تم کو ناپسند نہ ہو تو یہ بھی منگواتے ہیں :-

سوپ پیش کیا جا چکا تو ایک ویٹر ایک بڑی سی چاندی کی کشتی میں ایک بطخ کو اٹھائے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ اس کشتی میں ذرا کی ہوئی ایک بطخ رکھی تھی۔ جس کی منگی ہوئی گردن کے ساتھ ہمیں تانگے سے ایک پرزہ کاغذ بندھا ہوا تھا۔ یوں تاروٹنے اس کاغذ کی تحریر کو پڑھا۔ اس کے اظہار پسندیدگی کے بعد جب ویٹر کشتی اور اس کے بوجھ کرے کو واپس چلا گیا۔ تو میرا تاروٹنے مجھے بتایا کہ اس کاغذ پر اس نو بیجہ بطخ کا نمبر اور شجر و نسب درج تھا جس کی رو سے اس کا شمار اتنے لاکھ اتنے ہزار اتنے سو تانوا تھا اور اس کا تعلق ان لطیفوں کے حلیہ القادریہ خان سے تھا۔ جو غلام غلام سن میں یو رہب کے غلام ملاتے سے منگوا کر فرض کے غلام غلام میں پرورش کے لئے رکھی گئی تھی۔ ہم سوپ کو ہستہ ہستہ ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ پی رہے تھے۔ کہ چار بہیوں والی ایک چھوٹی سی صاف ستھری میز کو دو آدمی کھینچتے ہوئے ہمارے قریب آئے اس پر ایک سٹوڈنٹ شیشے میں بند ایک برقی آئینہ، پیشیں اور پکانے کی چند چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے سلاخیں پر دوئی ہوئی وہی بطخ، ہائے ہوز کی شکل میں بڑے ترے سے رکھی تھی۔ ان میں سے ایک شخص اس سلاخ کو اٹھا کر ہمارے قریب لایا۔ اور یو تاروٹنے بطخ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد خالص فرانسیسی انداز میں اظہار پسندیدگی کے لئے انگشت شہادت اور انگوٹھے کو ملا کر اٹھا کر ہر ایں جنبش دی لازم قطعاً کھانے کے بعد اسے واپس میز پر لے گیا۔ پھر اس نے سلاخ کو برقی آئینہ کے

اور پر مجایا۔ اور بعد آٹھ بج کے اندر اپنے مور پر گھومنے لگی۔ اب دوسرے نے سٹو کو آگ دکھائی اور جب ایک دبیز نیلا شعلہ بھڑکنے لگا تو وہ اس پر پھیل کے تھپے تلے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ مہمان کی آنکھوں کے سامنے یوں اس کا کھانا تیار کرنا کیسی ہی پریشانی کا باعث کیوں نہ ہو، کم از کم اس سے مہمان کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے کہ اس کا کھانا غلاظت سے بالکل محفوظ رہا ہے۔ ورنہ بڑھوں میں اور خود ایسے گھروں میں جہاں پکانے کا انتظام کبیرا دھڑیوں اور مافوں پر چھوڑ دیا جاتا، کھانے میں صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے کئی قسم کی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ اور اکثر ہوتی ہے۔ مگر برس بیلے دہائی میں ایک دوست نے جن کے ذوقِ خور و نوش کا میں ہمیشہ سے معترف تھا۔ ہم دو ستر کو نہاری کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران میں ایک صاحب نے شور بے میں سے کوئی سیاہ رنگ کی منگو کی سی چیز استہباب کے ساتھ ٹھانی پھر اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اسے اٹھا کر باہر بوشن میں بڑے خود سے دیکھنے لگے۔ جب ہم میں سے کسی نے یہ پوچھا کہ کیا چیز تھی۔ تو انہوں نے اپنی جگہ ہنسی کر پھر کھانا شروع کرتے ہوئے بڑی مسندت آمیز نگاہ میں دیکھے کھانا کھانیں یونہی شور بے میں سے چوبے کی دم بٹاؤ ہو گئی تھی۔

اس سے بھی چند برس قبل لاہور کا ذکر ہے۔ میں اسلامیہ کالج کے سامنے دوڑ رہی تھی کہ وکٹوں میں سے ایک پر کھڑا سستی پی۔ باغداد کے میرے مانتوں میں کوئی چیز آکر

انہی سے وہی کی بالائی کا ریزنگو اسمبلی کر جب میں نے اسے چوس کر پھینکا چاہا۔ تو دیکھتا ہوں وہ ایک موٹا تازہ جھینگہ ہے۔

جب ہم بطخ کا صفایا بھی کر چکے اور پیٹیں بٹائی گئیں۔ تو ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سامنے کر دیا مطلب یہ تھا کہ محتاس میں سے کیا چیز پیش کی جائے۔ یونٹا ڈونے میرا عندیہ معلوم کرنے کے لئے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: اب کوئی ایسی چیز منگوانا چاہئے جسے کم از کم مجھ سے سامنے آج پر رکھ کر کھا یا نہ جائے۔ اس اعتبار سے میرا خیال ہے آئس کریم بہت کمزور رہے گی۔

تھوڑی دیر میں مشتری میں رکھے ہوئے ایک چاندی کے ہاونے اور ایک بوتل کو ڈیڑھ لاکھ پیسوں والی میز پر رکھ دیا۔ میں نے رفع آستہاب کے لئے سر اٹھایا کر کے دیکھا تو بادینے میں دنیا آئس کریم لگا ایک تون تھا۔ اور بوتل کے لیبل پر پانچ ستاروں کا نشان اس امر کا ثابہ تھا کہ یہ برانڈی ہے۔ ڈیڑھ بوتل لگا لگا کھولا۔ اور اس کے اندر بند کی ہوئی ناپ ستیال کو آئس کریم پر تھوڑا تھوڑا چھڑکا۔ پھر اس نے دیا سلائی جلا کر اسے آگ دکھائی۔ سب بسترے تو بے پرایک تیز شعلہ بھڑکا۔ اور نار اور ہٹ کا یہ عجیب و غریب وصال ایک جگہ ریاء رنگ کا نشان آئس کریم کی پھلتی ہوئی سطح پر چھوڑ گیا۔

آئس کریم کھانے کے دوران میں میرا دھیان فرنیسیدوں کے اس فوق غور و فوش کی طرف گیا۔ جس کا مظاہرہ میرے سامنے پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ گویا انسان کی سب سے بڑی ضرورت شکم پوری ہے لیکن ذہن میں
 کتنے آدمیوں کو کھانے کا صحیح ذوق قدرت کی طرف سے میسر ہوا ہے۔ پھر میرا وہ بیان
 ہمارے ملک کے اُن علماء اور رؤسا کی طرف گیا جنہوں نے دسترخوانی فحاشی اور کابڈی
 کے فن کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ دربار اور وہابی کا ایک قصہ نایت معتبر ذرائع سے تاریخ کے
 سپرد ہوا ہے۔ کہ ایک کابلی سردار نے شاہ اودھ کی ضیافت کے موقع پر طرز طرح کے
 کھانوں سے دسترخوان کو پاٹ دیا۔ ہر چیز مقدار میں اتنی زیادہ تھی کہ فحاشی پسندی کی
 ایک برچھمکس کر رہی تھی۔ پھر نظریہ کہ کابلی میزبان پُرخوری کے جو ناک مظاہرے کرتا تھا
 اور شاہی مہمان اس طرح کھانا کھا رہا تھا جس کے لئے اودھ میں صرف ایک ڈنگٹا لافظ
 ہے۔ دوسرے دن کابلی میزبان کو مہمان کی حیثیت سے شاہی دسترخوان پر جانا تھا مگر جب
 پر حضرت پہنچے تو ان کے تعجب کی انتہا دہی کہ کھانے کا کس نام و نشان نہیں اور حضرت
 شاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ گھنٹے میں مصروف ہیں۔ مہمان کو عزت و احترام کے ساتھ
 بٹھا کر دیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ مصدقہ بھی کر دی کہ معاف فرمائیے گا ذرا یہ بازی ختم ہو جائے تو
 دسترخوان کا ہتھام ہوتا ہے۔ مگر وہ بازی نہ ختم ہوتی ہے دکل بکھانے کا وقت مل رہا
 ہے۔ اور کابلی مہمان کی آیتیں قُلْ هُوَ اللہ پڑھنے کے بعد اِنَّا لِلّٰہ تک پڑھنے لگی ہیں۔
 بالکل یہ بازی ختم ہوئی تو مہموم ہوا کہ خاصا بھی تیار نہیں ہے۔ تھوڑی دیر اور گئے گی۔
 حضرت شاہ نے گویا مجبوراً دوسری بازی شروع کر دی۔ اور کابلی مہمان کو یہ طے کرنا پڑا
 کہ اُن کو غالباً موت یہاں پہنچ لائی ہے۔ جبکہ کی شدت سے واقعی آنکھوں نے ایک

دوسری کو کھانا شروع کر دیا تھا۔ ام غزیرہ کہ بیکچہ کو حضرت شاہ نے حکم دیا کہ کچھ نہ کچھ نہ کھا
 چٹنی ہی کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ آفتاب آیا۔ سلطانی آئی۔ عین دانی آئی۔ دسترخوان بچھاؤ
 کھانے کا ایک نہایت پُر تکلف خزان بھی آیا۔ مگر حسبِ خزان پوش کھول کر دیکھا غصہ
 کے ہوش اڑ گئے۔ صرف ایک مشتری میں حقوڑے سے پاؤں اور کچھ بھی نہیں۔ اونٹ
 کے منہ کا یہ زیرہ دیکھ کر خزان صاحب جل ہی تو گئے۔ مگر حکم شاہ سے جھوٹے دھتور
 ہیں یہ پاؤں صاف کر دئے اور پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ بہر حال کچھ نہ کچھ تکسین قہوئی
 اور حسبِ بازی ختم ہوئی اور اصل دسترخوان بچھا۔ جس پر انواع و اقسام کے کھانے تھے۔
 تو خزان صاحب حیران کہ اب میں کیا کھاؤں۔ بھوک ختم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شکم سیر
 ہو کر کھانا کھا چکے ہیں۔ جب ہر امرار کے بعد وہ ایکا رہی کرتے رہے تو حضرت شاہ نے
 مسکرا کر فرمایا کہ شاہ صاحب زیادہ مقدار میں تو چروپانے بھی کھاتے ہیں۔ انسان اور چروپائے
 میں یہی فرق ہے کہ وہ مال گد ام نہیں جھرتا۔ بلکہ جو بری صورت میں کم سے کم کھا کر زیادہ
 سے زیادہ غذا میت حاصل کر لیتا ہے۔ اور چرمندرت چاہی کہ جتنا خیر بھئی وہ دانستہ
 حق جھنجھند کی بازی اور غصے کی تیاری میں دیر کا غدر و مصل سب کچھ ناسخ تھا۔ درہ
 مقصد صرف یہ تھا کہ خزان صاحب کی بھوک کو جہاں تک ہو سکے بھڑکا دیا جائے تاکہ
 اس کے بعد انہیں قائل کیا جاسکے کہ بھوک کی اس شدت میں بھی اس صحیح قسم کے
 چلاؤ کے دو تین حقوں سے زیادہ وہ نوش نہیں فرما سکتے۔

کھانا ختم ہو گیا تو ہم جست ہونے کے لئے اٹھے۔ مینار ٹوٹنے بل پر نظر ڈالی۔ اور

جیب سے بڑا نکال کر درمیں کا ایک پتہ پانڈی کی فشرتی میں ڈال دیا۔ میروندانہ ہے کہ وہ کوئی آٹھ نو ہزار فرینک تھے۔ اور پھر اُس نے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ الگ کر لئے۔ یہ گویا بچ تھا۔ دینے کے ہم نیچے لوگ روم میں پہنچے تو میروندانہ نے کوٹ اوڑھ کر پیٹنے کے لئے ٹمک اس روٹی کے حوالے کئے جو لوگ روم میں آگیاں کے سامان کی بگرائی پر موقوف تھے۔ اس نے مسکا کر کہا ہے اور کوٹ اوڑھ لیا ہماری طرف بڑھائیں۔ میروندانہ نے سو سو فرینک کے دو نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ابھی ہم نے کوٹوں کو اوڑھنے کی نیت سے بازو فضا میں پھینکے ہی تھے کہ دو ملازم کہیں بیچھے سے اپنا ٹک مارا ہونے اور انہیں اوڑھنے میں ہماری مدد کے الگ باکھرے ہوئے۔ میروندانہ نے سو سو فرینک کے دو نوٹ اور بچکے اور ان کے ہاتھ میں تھاوئے۔ عمارت سے نکل کر سبب ہم شرک پر پہنچے تو دروازے پر ایسا وہ ملازم نے آگے بڑھ کر ٹکیس کا دروازہ کھولا میں نے جب اندر پہنچ کر باہر میروندانہ کی طرف دیکھا تو وہ ایک مرتبہ پھر خوشی کے لئے اپنے بڑے کوٹوں رہا تھا۔

(۴)

جب ٹکیس سین کا پکل جبرہ کے اُس گنجان آباد علاقے میں پہنچی جو لاطینی کمار کے نام سے مشہور ہیں۔ تو مات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ مگر اس جگہ کے قہر خانے اور حمام گاہیں بے ٹکروں سے جوں کی توں بھری ہوئی تھیں۔ پڑیوں پر چلنے والے لوگوں کا

ہنریت اور پراسرار کیفیت کو دیکھ کر شبہ گورنر تھا کہ شاید شہر کے سبب کمزور شہر
اور قابل معیے سے مہیا ہوتے ہیں۔ اور پھر عوامی گاڑی آگے بڑھ کر ماں یمن چرسے
کے علاقے میں میونارڈ کے وئے ہوئے پتے پر ایک مشکوک سے مکان کے تاریک
دروازے کے سامنے رُک گئی۔ جم گاڑی سے باہر نکلے۔ میونارڈ نے ٹیکسی کے دم چکائے
اور سکا کر کہنے لگا: "وہی منزل مقصود گئی۔" آداب فدا اندر مل کر ایگزٹیشنوں کا حال
بھی دیکھیں کہ وہ کس عالم میں ہیں۔

ذہن پرستوں کا وہ کتنے ہی مستبد شوق پر گویا ایک اور تازیانہ ہوا۔ اس جماعت
کے فلسفے سے متعلق اتنا کچھ نہیں چکے کے باوجود کبھی کسی ذہن پرست سے باطنی تباہی
خیال کرنے بکھر جاتے تھے۔ کاتھولک میٹرڈ آیا تھا۔ گورنریت پرستوں کی متعدد قسمیں آج
یورپ میں نظر آتی ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ ہم ہمیشہ ہر ملک اپنی ایک انفرادی جماعت کا سر پرست
ہے۔ لیکن ان سب میں زیادہ مشہور فرانسیسی جماعت ہے جس کی دو شاخیں شاخ پال
سارتر کی وہ خیال افروز تحریروں ہیں۔ جن کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یوں
ایگزٹیشنزم کا فلسفہ کوئی نئی بات نہیں۔ انکلاطون اسپنوزا اور نیچل اپنی اپنی جگہ اس
کے متعلق اظہار خیال کر چکے ہیں۔ کانٹ پر کمال سے بھی اس کے متعلق اپنے تاثرات کا
اظہار کیا ہے۔ لیکن "ایگزٹیشن" یعنی ذہن پرست کا نظریہ اس فلسفہ مفہوم میں جو آج یورپ
میں لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ سب سے پہلے کوکسٹارڈ نے استعمال کیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔
کہ انسان اس مشین وید میں ماسٹر کی بہت بڑی کل کا ایک بے ہوش پرندہ بن کر رہ گیا

ہے۔ اور دہشتیں اور کلی پردوں کے طواغیت اپنے آپ کو کھوکھلی اس انفرادیت سے
 مبروم ہو گیا ہے۔ جس کا احساس ہی اسے زندگی کی رنگینوں سے لذت یا بے ہوشی
 کی تڑپ دلا سکتا ہے۔ اس لئے انسان کو اپنی انفرادیت کو محسوس کرنا چاہئے اور
 اسے اپنے معنی امکانات کو بدلنے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ مگر کرنا تو موقوفہ کوئی فلسفی نہ تھا۔ نہ
 اس کا کوئی عقیدہ نظریہ تھا۔ ہمارے اپنے عہد میں ہائیڈرو جیو پھیزکس نے اس اصطلاح کی
 جو تفریق کی ہے۔ اس سے متعدد جواں سال اور ابل الماسے فزیکس میں کوئی متاثر کیا بلکہ
 فرض میں وہ تحریک پہل نکلی جس نے بظاہر آج اس ملک کے تمام نوجوانوں کو اس قدر
 متاثر کر رکھا ہے کہ انھوں نے میں ان چار مہینے روز و رات جیسا کہ چار لاکھ کاپیاں
 انھوں نے ہتھ پکھڑائی ہیں۔ جن میں ان اس فلسفے پر بطور خاص بڑی شد و مد سے
 بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ پیرس میں اس تحریک کے لیڈروں کے ساتھ ان کے
 مقلدین کو کچھ دیہی دانشور و فزیکس کے جو نمائندوں کے سینا کے شائقین کو بوقت ہے
 عام روزناموں میں ان کے بیانات کو بیشتر اوقات سیاسی لیڈروں کے بیانات سے
 بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اور لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے کسی مسئلہ کے اسے
 میں غرض کہ ان کے ایک سرسبز پانچویں اندر سے مارا دیا یا سارتر نے کین خیالات کا انھوں
 کیا ہے متعلقہ اخباروں کے پرچوں کو دیں انھوں نے ہتھ دے جاتے ہیں گویا مسالفتہ ہائی
 ہیں۔

ہم دروازے پر پہنچے تو ایک ٹمٹہ کھڑکی میں سے ایک شخص نے بڑی جھنجھکیاں

پہلے میزبانوں پر اور پھر مجھ پر ٹھامیں میرے ساتھی نے آگے بڑھ کر سرگوشی میں کچھ کہا۔ سننے والے نے اٹھ کر اطمینان کے لئے اپنے سر کو جنبش دی۔ اور پھر ساتھ کا دواؤں گھل گیا۔ جس میں سے گزرا کر ہم ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی کو ملے کرتے ہوئے ایک ایسے وسیع مگر نیم روشن کمرے میں پہنچے جس میں تقریباً دو ایک عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے گنگو میں سر دھو رہے تھے۔ کمرے کی تاریکی کو سگریٹ کے کشیف دھوئیں نے اور بھی پر اہلزار کر دیا تھا۔ شراب کی دو اور عطریات کی ملک کے عجیب و غریب استخراج سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ گھلا سوں کی کھٹک، باڑوں کے شور اور قہقروں کی گونج نے دل جل کر ماحول کو حد درجہ جاندار بنا رکھا تھا۔ کرسیوں کے بعد جو جگہ فرش پر نہج رہی تھی۔ اس پر فوجان عورتیں اور مرد جن میں سے اکثر کی عمر بچل سن بدعت کو پہنچی تھی بیٹھے تھے یا نیم دراز پڑے تھے۔ دو تین آجدار مشتریوں میں کوئیک کے گھلا س اٹھائے اور مرد و عورت آبلے رہے تھے۔ اور سامنے ایک چھوٹے سے چوہے پر پانچ آدمیوں کا ایک آرگسٹرا ہر کی باز کی دھن بجا رہا تھا۔

میوٹا ٹوٹنے کوڑے کوڑے دروازے کی دبیز میں سے اطراف میں نظریں ڈالتا ہوں تمام جگہ یوں چرچاتی کہ آبادوں کو پینے والوں کی فزائش کی تعمیل کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ میرا خیال تھا شاید ہم اندر دھاا سکیں گے۔ لیکن اچانک ہم سے کچھ فاصلے پر ایک کوفے میں دو آدمیوں کی میزبانی ہو گئی۔ اور میوٹا ٹوٹا اور میں دونوں پر سے گرتے پڑتے معذرت کے الفاظ کہتے نجف

میں مجبوری مسکراہٹ کو ہونٹوں پر ہانے وہاں تک کسی نہ کسی طرح پہنچے ہی گئے۔
 میں نے کرسی پر بیٹھ کر ایک نظر ہراسے کی طرف لوگوں پر ڈالی۔ ماسٹرین مجلس
 زیادہ تر ایسے فزیز لڑکے اور لڑکیاں تھیں جو بظاہر ایک دوسرے سے اذہا بہ عشق میں
 یوں غرق تھے گویا انہیں مطلق اس امر کی پرواہ نہ رہی تھی کہ وہ ایک جمیع عام میں ہیں۔
 ہر ایک کے اٹھناک سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کا یہ رنگین لمحہ جو کہیں سے اُسے
 میسر آگیا۔ وہ اُسے کسی عام پر ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ ہر چہڑیوں شاداب اور
 تازہ نظر آ رہا تھا گویا اُسے اُس پریم صوبت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا جسے کڑواہٹ مانہ
 کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پھر چاہے ساڑھ تک گئے۔ اور ماسٹرین میں سے
 ایک شخص نے چوتھے پر چڑھ کر مائیکروفون پر اعلان کیا۔ خلیک بارہ بجے موسیہ
 نکلاں نکلاں سیٹیج پر آئیں گے۔ اور ماسٹرین ان کی موسیقی سے نصف اندوز ہو سکیں گے۔
 اعلان کے ساتھ ہی تالیوں کا ایک۔ بے پناہ شور اٹھا مسرت اور خوشی کے جھگمگے نے
 ہر شخص میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔

ایک دو منٹ کے بعد جب کمرے میں کلاک نے نصف شب کا گھنٹہ بجا یا تو ہر لڑکے
 سناٹا چھا چکا تھا۔ اور ماسٹرین مجلس بڑی شدت سے اُنے والے کا انتظار کر رہے تھے
 اتنے میں مقب کا سیاہ پردہ ہلا اور قیچے سے ایک ٹوکلا پکا سیاہ خام سفید موشخص ہاتھ
 میں کلارنٹ لے سیٹیج پر آیا۔ اُسے دیکھتے ہی پھرتالیوں کا شور اور مسرت کے نعرے
 بلند ہوئے۔ خود اور نے اپنی کورنش سے اس استقبال پر مانتہ کو کہ تعلیم دی۔ اور

مائیکرو وزن پر انگریزی میں کہا کہ وہ حاضرین کی تسنن طبع کے لئے چند مخصوص امریکی
 نغمے پیش کرنے کی اہانت چاہتا ہے۔ تاہم پھر گونجیں۔ نغمے ایک مرتبہ پھر بند
 ہوئے۔ اور پھر جیسے ہی اس نے لے کو ہرٹوں سے لگایا، سامانِ جمع ہڑڑا کر کھڑا ہو گیا
 عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے مقابل ہو گئے۔ اور جب آرکسٹرا نے اس موسیقی
 کا آغاز کیا جس کی نغمہ شاید امریکہ میں لائے جانے والے مسیحا غلام صدیقیوں قبل
 ازلیقہ کے کسی تاریک زیر گوشے سے اپنے ساتھ لائے تھے، تو سامانِ جمع ایک جگہ
 آفریں دھن میں ایک دوسرے سے گھٹ گیا۔ تھوڑے عرصے میں آرکسٹرا کی نغمہ آہستہ
 آہستہ تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور اس کی ضرب پر تمام حاضرین یوں متحرک رہے
 تھے۔ گویا ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور انہیں اپنے تن بدن کی ہوش نہیں رہی
 آرکسٹرا کی بیجاں انگیز و محنت تپتے ہوئے قدموں کا شور، متحرک ہونے، اجسام کا ہنگامہ
 بل بل کر ایک ایسی صورت اختیار کر گیا کہ کمرے کی تمام کائنات دھن دھن کرتی ہوئی نظر
 آنے لگی۔ میں نے اطراف میں دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا چھت سے لٹکے ہوئے
 نئے نئے دیواروں کی قسطنطنیہ صوفیوں کے پردے، فرش پر رکھی ہوئی میزکریاں، میزوں
 پر بھرے ہوئے گلاس اور راکھ والی کمرے کے در و دیوار جدید ہے کہ خود سامی
 کائنات پر وہ بظاہر ہو گیا ہے۔ ہر چیز کا پ رہی ہے، متحرک رہی ہے۔ ناچ
 رہی ہے۔ نہ جانے اس دھن اور نغمے میں کیا بات تھی کہ آہستہ آہستہ ایک خفیہ قوت
 اس ایک نیم جذبے کے ماتحت میرے اپنے پاؤں اس کی نغمہ پر از خود حرکت کرنے

گئے۔ اور مجھے دل کی گھرائیوں میں سے کوئی بات اس امر پر کسانے لگی کہ میں بھی اٹھ کر
 ماشرین مجلس کے ساتھ اس قفس میں شریک ہو جاؤں۔ یہ تحریک شاید میری فہم پر غلبہ
 پامتی، لیکن معاملہ کے ایک اور گوشے سے "پاسبانِ عقل" نے حکم دیا اور میرے ذہن میں
 چند مسائل کے لئے "آئینوں؟ یا نہ آئینوں؟" کے سوال پر احساسِ غلطی اور شدت اور زبرد
 کے مابین منظر شروع ہو گیا۔ ذہن کی گھرائیوں میں سے ہوش و محاسن مجھے یاد دل رہے
 تھے کہ میں چھٹی چھٹی آنکھوں سے حسنِ فرنگ کی بہار کا جو نظریہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ محض
 ایک فسونِ ایک دور و نامک سربِ قاجار کی حقیقتِ خود فریبی اور ہوسِ لعب کے سوا کچھ بھی
 نہ تھی۔ مگر میرے ارد گرد کی دنیا کہہ رہی تھی کہ زندگی محض مسرت و شادمانی کا نام ہے۔
 اور میرے سامنے کا منظر کچھ اور باتھا کہ ہڈوں کا ہڈو۔ ہے معنی و تار کی جھوٹی قدروں کے
 مکروہ ہند صنوں سے نکل کر زندگی کے اس سینے کے کی رنگینوں اور دلفریبوں میں اپنے
 ذہنی تفکرات کے جوہر کو نصیب دینا اور ذکر و۔ اور پھر اس کعبہ کے دروازے میں میرا
 ذہن بچکے سے کھانے لگا۔ اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ میرے سامنے کی دنیا کس قدر دکھائی
 کس قدر غیر واقع، کس قدر بظلم تھی۔ جہاں زندگی کا حاصل جذبات پرستی کے سوا کچھ نہ
 تھا۔ جہاں حیات محض نام تھا۔ بگریٹ کے دھوئیں شراب کے فطے، عورت کے جمال
 گلاب بازی اور خوش وقتی کا۔ مگر پھر سے دل نے کہا اگر زندگی یہ نہیں تو پھر کیا ہے؟
 کیا حیاتِ ماہیت کا نام ہے؟ کیا امر کا حاصل یہی ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے
 تفکرات اور صائب کے شعلوں میں اپنے قلب و روں کو دھیرے دھیرے تحلیل کرتا

رہے؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے انسانی زندگی کو ادا مروزا ہی کی بیڑیاں پہنائیں اور انہیں یہ کس نے حق دیا تھا کہ وہ اولاد آدم کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر یہ نہ کروا وہ نہ کروا؟ کی دہیریوں میں اُسے جکڑتے؟ وہ شخص کون تھا جس نے سب سے پہلے اپنی تنگ خیالی سے بنی نوع انسان کے لئے کاروبار و مہیات کے سخت گیر ضابطے وضع کئے اور وہ کون افراد تھے جنہوں نے انسان کے فریب خوردہ اب وجہ کی فطری آئندہی کو سلب کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خود ساختہ اصولوں کی قید میں ڈال دیا؟ اور وہ اٹل کچھوڑ جنہوں نے اپنے انکار و انکار سے حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی مرتکب کاریوں میں الجھا کر اُسے ایک کٹھن اور جاننا مردانہ و بال بٹا ڈالا؟ انہیں کیا حق پہنچا تھا کہ وہ زندگی کے دفرہ بلیج حسین رویا کو کثرتِ تعبیرات سے بھی ایک خواب میں بدل ڈالتے؟ ول نے کہا دوست یہ ادا مروزا ہی یہ ضابطے اور قواعد سے جھگڑم قدم پر انسان کے دامن میں اُلجھتے اور اس کی آئندہ روی میں حائل ہوتے ہیں محض فریب اور دھوکہ ہیں۔ زندگی بابت خود اتنی حسین شے ہے کہ اس کے ایک شے پر سب ضابطے یہ حجابِ اصول کیسے قربان کئے جاسکتے ہیں اور انہیں قربان کرونا چاہئے۔“

اور پھر میں اچانک بھی غیر مادی قوت کے ماتحت مذہب اور معاشرے بابت کے اشد جذبات کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اس نیت سے اٹھا کہ میں اس بزمِ قیاس میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملوں گا۔ لیکن جیسے ہی میں اٹھا اور بیٹھا رفعت کو ختم کر کے اپنے سرخانِ نرین کے سلسلے جھکا چکے تھے۔ تاویل کا ایک بے پناہ شور

بند ہو رہا تھا۔ اور دلگ ہستے ہوئے مسرت اور شادمانی سے جھومتے اپنی اپنی جگہ پر واپس آ رہے تھے۔

میں واپس ہو کر پھر بیٹھ جانا چاہتا تھا کہ اچانک میوزک ٹکڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ واپس چلنے کے لئے تیار رہیں یعنی صبح ہے۔ ایک بج چاہتا ہے۔ اور تمہیں صبح سویرے یہاں سے فرسٹ کلاس ہے مجلس کچھ ایسی پُرلطف تھی کہ اگر تم واپس چلنے کی نیت سے کھڑے نہ ہو جاتے تو میرے ماتھے سے تمہاری روانگی کا خیال بغیر ہو جاتا۔ ہم باہر نکلے میوزک ٹکڑے ٹکیسی کو پکارا۔ گاڑی میرے ہٹل کی طرف چلنے لگی۔ میں چپ چاپ گزرتے ہوئے وقت کا جائزہ لینے لگا۔ گزشتہ منظر کا نقشہ میرے مستحضر میں گھوم رہا تھا۔ اب تک میرے دل پر ایک ابدی مسرت ایک جاودہ دل لطف کی کیفیت باقی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کوئی نہ کہنے دے کہ کوئی ایسا ہی لمحہ میسر آیا ہو گا۔

جوتل کے دروازے پر گاڑی ٹکی۔ ہم دونوں باہر نکلے میوزک ٹکڑے میں نے شکریے کے اظہار کے لئے ان نظروں سے دیکھا جو دل کا سالِ زبان سے بھی زیادہ و نشاط سے بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ پھر ہم نے آخری بار مسافر کیا اور میں کمرے کی چابی لینے کے لئے کاؤنٹر پر پہنچا۔ زینے کے قریب جا کر میں نے ادھر چڑھنے سے پہلے ایک نظر ہیچے کی طرف ڈالی۔ پورٹاب تک میرے لئے دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو آج کیا ہو گیا ہے ؟

بالآخر میکو

(۱)

علم انفس کے ماہر ہم سب کے ساتھ ایک عجیب و غریب کھیل کھیلا کرتے ہیں جسے وہ اپنی زبان میں تسلسل خیال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب وہ دہرا دکتے ہیں تو سننے والے کا دھیان اگر اس سے اینٹ یا دروازے یا پردے کی طرف جانا ہے تو وہ فرد آس تپے پر پہنچ جاتے ہیں کہ شخص کس قماش کا آدمی ہے۔ لیکن لیٹن امریکہ کے نام کے ساتھ جو تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے اس سے کوئی ماہر علم انفس آپ کے بارے میں صحیح یا غلط اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں ایسا لفظ کے منہ سے ہی لاسالہ ایک ہی خیال آتا ہے اور وہ ہے انقلاب کا۔ کیونکہ یقیناً ہر ایک انقلاب بھی انسانی ہے اور واقعہ یہی ہے کہ سالہا سال سے وہاں انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور آج بھی جب موقع ملتا ہے ان کا نظم بند ہو جاتا ہے ۔

وہ بیس ممالک جنہیں مجموعی طور پر ہم یٹین امریکہ کہتے ہیں اپنی زندگی کے لئے ایک ایک انقلاب ہی کے مرحلے میں تھے اور اس اعتبار سے ان کے اندر انقلابی روایات کبھی سر نہیں ہو سکیں۔ چند برس گزرے کہ کولمبیا میں انقلاب ہوا پھر کیوبا کی باری آئی اور پھر کیر گزرا اور جٹائن میں ہیروں کی حکومت کو ایک قسم کے ایسے انقلاب ہی کے ذریعے ختم کیا گیا جس کی صدائے بازگشت ابھی تک سننے میں آرہی ہے۔ حقیقت میں یٹین امریکہ کے انقلاب کی کیر طور پر مذمت نہیں کی جا سکتی۔ اکثر حالات میں وہ ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کی سیاسی خواہشات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر ان انقلابی روایات سے قطع نظر بعض اوقات دنیا کے بعض ممالک سے بے خبری یا غلط اطلاعات کی بنا پر کسی قسم کی اٹلی سیدی باتیں بھی چپک جاتی ہیں۔ مثلاً یٹین امریکہ ہی کے ممالک کے سلسلے میں برازیل کا خیال آتے ہی بعض آدمیوں کے تصور میں یہ خیال گھومنے لگتا ہے کہ وہاں لوگ شاید صرف ٹی ٹی ٹ ”اگاتے“ کافی بھونٹتے اور کاربن مرانا قسم کی عورتیں پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ارجنٹائن کا ذکر بھی بعض اوقات ڈکٹیر قسم کے صدر، عشر انگیز ٹینگو، پو کو کھیلنے والے کرورچی یا شانہ بانگاشو کی تصویر ذہن میں آتا ہے۔ اسی طرح میکسیکو کا خیال آتے ہی ”ولا“ یا ”نپالٹا جیسے خون آشام انسانوں کی خوفناک شکلیں تصور میں گھومنے لگتی ہیں لیکن یٹین امریکہ سے محض کیر اور ٹیل، کافی اور مانچ، تین اور تانہ ہی باہر کی دنیا کو نہیں بھیجا جاتا بلکہ بعض نہایت قابل قدر سیاسی خیالات بھی ہمیں یہیں سے براہ راست دستیاب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا کو سب سے پہلے اسکو کی مدد بندی کا تصور اس صلح نامے کی دفعات سے ملتا تھا جس پر

۱۹۰۳ء میں ارجنٹائن اور پرتگیزی کی حکومتوں نے اپنی باہمی جنگ کے خاتمے پر دستخط کئے تھے۔
 پھر ۱۹۲۵ء میں پیرا اور پرتگیزی کے درمیان حب صلح کا معاہدہ لکھا گیا تو انہوں نے اپنے اہل سال
 کے جنگجوؤں کو ختم کرنے کے لئے یہ تجویز اس صلح نامے میں بطور شرط وضع کی تھی کہ روز
 فکروں کے سکولوں میں پڑھی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں سے ان تمام باتوں کو کبیر حذف
 کر دیا جائے گا جنہوں نے ہمیشہ قسب اور غلط فہمیوں کو پیدا کر کے جنگوں کی تسبیح
 رکھی تھی۔

گرمیاست سے قطع نظر خود ثقافتی زندگی میں لیٹین امریکہ کے فنکاروں نے کیا
 نہیں کیا؟ میکسیکو کے مصوٰر اور نڈو اور ڈیا گورویرا، یا برازیل کے پورٹریٹری کا نام کس نے
 نہیں سنا؟ سائمن بولیوار کے وسیع فائدوں میں برازیل کے کمپوزر وکٹور ہوس اور میکسیکو کے
 کارٹونسٹ شویز کس سے پیچھے ہیں؟ اسی طرح شعروادب کی دنیا میں ہتلی کی ذیل انعام یافتہ
 شاعرہ گبریلہ مسترال، ہیریو کے ناول نگار امیگیا، ویزنو ویلا کے سولوگیا گوس، برازیل کے
 اناٹو اور پرتگیزی کے بیلونز و ڈاچنٹ کے ادبا کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر ایشار
 خود ان لوگوں میں ہے جو عام طور پر بروسرے ملک کے ہار سے ہیں انہوں اور غلط
 خبروں پر پڑی مستعدی سے کافی دھرتے ہیں۔ چنانچہ جب کیوبا کے شہر ہوانا سے میراجماز
 میکسیکو کی طرف اڑا تو میرے تصور میں وہ فلمیں گھسنے لگیں جنہوں نے میکسیکو کے اس
 زمانے ہی کو میرے سامنے پیش کیا تھا جب وہاں قانون کی توثیق نہ تھی۔ میں سوچنے لگا
 خدا ہلے نے میکسیکو شہر میں ان دونوں قانون شکنی کی کیفیت کیا ہوگی اور وہاں اور نہ پانامکے

پہرہوں میں سے کسی کنی افرا سے سنا سنا رہے کچا کیکن پھر شام کے وقت دور سے دھندل
فضا میں وہ آتش فشاں پہاڑ نظر آنے لگے جو میکیکو کے قریب ہیں واقع ہیں اور نہ جانے
کیوں شام کے دھندلکے کی اس چمکوں فضا نے میرے دل کو ایسی تسکین بخش دی جس سے
میں دفعۃً یوں محسوس کرنے لگا گویا میں ایک ایسی جانی پہچانی سرزمین پر قدم رکھنے والا
ہوں جہاں کے باشندے اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے میرے لئے اجنبی نہیں۔

(۲)

مجھے کہ بہن کے خطے کے قدرتی حسن کا اندازہ اس سے قبل محض آٹنا ہی تھا بقول کتاب
کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ لیکن جب فلوریڈا کے شہری ایسی سے اٹھنے کے ایک
گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز ایڈجبرو کے اوپر سے گزرنے لگا جو براقیانوس کے
کریمین کے خطے آب میں واقع ہیں تو ایک بالکل نئی دنیا میرے دیکھنے میں آئی۔

دن کے کوئی دو بج رہے تھے کہ ہمارا جہاز جزائر ہاما کے پروٹینس آئیلینڈ پر
اترنے کی غرض سے سناؤکی بندرگاہ کے اوپر گھسنا اور ہم براقیانوس کے ان گہرے نیلے
پانیوں پر سے گزرتے خشکی کی طرف بڑھے جس کی سطح پر کف آکر دھریں ایک دوسرے کے
تقابل میں دوڑ رہی تھیں نیچے درنگاہ تک ٹیکلی ریت کی حسین بچھ دوپہر کی صوبہ میں
چاندی کی طرح چمک رہی تھی اس سے آگے تار کے پٹر ایک خاص ترتیب سے یوں
ایک لمبی قطار میں کھڑے سمندر سے آنے والی ہوا میں محسوس رہے تھے۔ گویا کسی غلم کا
سٹیٹ تیار کیا رکھا ہے۔ ان کے آگے دو درنگاہ تک ایک دوسرے پہاڑوں نے

تمام خطۂ ارض کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے کچھ اُگے نساؤ کے شہر کی زر واد پیا زی رنگ کی عمارات تھیں جن کی ہری ہری کھڑکیوں کے رنگا رنگ پردے عنابی اور قرمزی رنگ کے پھولوں سے مدی ہوئی سیلوں کے پیچھے بانسیم میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ نیچے دور سڑکوں پر ریشمی ساجانوں والی گھوڑا گاڑیاں ہواٹی جہاز کی بلندی سے نکلنے چھٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ منظر کا حسن اس قدر دلکش تھا کہ اس کی ترتیب میں قدرت کی نسبت خود انسان کا ہاتھ زیادہ کارفرما نظر آتا تھا اور وہ کہ گمان گذرتا تھا کہ ہم کسی عظیم فلمی سیٹ کے اوپر سے گزر رہے ہیں جہاں تھوڑی دیر میں شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔

پھر میں کمیو یا کے شہر ہوانا میں شام کے وقت وارد ہوا۔ شہر کے پورے نظارے کی دید سے یوں محسوس ہوا گویا وسطی یورپ اور وسطی ایشیا کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کا وجود عمل میں آگیا ہے جس پر ایشیائی قد و قامت اندوخل اور رنگ روغن کو میں مغربی تہذیب تمدن کے مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھ رہا ہوں اور ہر طرف ایک بے پناہ حسن اپنے جلو سے کی فراوانی سے زندگی کو ایک نئی تانابی، ایک نئی تازگی بخش رہا ہے۔ پھر مجھے اچانک یاد آبا کہ میں اس جزیرے پر چل رہا تھا جسے دریافت کرنے کے بعد کولمبس نے شاؤسپین کو دکھا تھا کہ سپہم انسانی سے اس سے زیادہ حسین خطۂ ارض نہیں دیکھا۔

ہوانا میں وہ میری پہلی شام بھتی میں ساحل سمندر پر کھڑا بندرگاہ کا نظارہ کر رہا

تھا۔ میرے سر کے اوپر چند تار سے بادلوں کے نقاب سے باہر آنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔
 تھے اور دور بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا سپانہ تاریکی کا ایک حصہ بن رہا تھا۔ میں نے
 ساحل سمندر سے ملٹ کر بچھے کی جانب ایک نظر دوڑائی۔ ایک عجیب حسین نظارہ میرے
 سامنے بکھرا ہوا تھا۔ سورہ کامل اور ٹاگبانا کے قلعے سے آگے ساحل سمندر پر چٹائی ملی بسی
 شور و بصورت ہلکے پام کے پیڑوں کی قطاریں، ان سے آگے پارک، باغات بلند مقامی
 اور ان سے بڑھ کر بارونق بازار جن میں خوش پوش، خوش گفتار، ہنسنے مکرہ تے لوگوں کے
 ہجوم، رنگارنگ گاڑیاں، شام کاریں، نقشبیں اور پھر ہوانا کا دلکش فتنہ اوغیر جو نیو بارک
 کے فتنہ اوغیر سے ویسا ہی مختلف دکھائی دے رہا تھا جیسے لندن کی پال مال سے لاہور
 کی مال مختلف ہے۔ مجھے شہر کی شبیہ زندگی کچھ ایسی رنگیں اور ولولہ انگیز نظر آئی کہ مجھے آج
 سے کوئی پندرہ برس مچرانے لاہور کی شبیہ زندگی یاد آنے لگی۔ سارا شہر تیز روشنیوں سے
 بقدر نور نہا ہوا تھا۔ کھانے پینے کی مکانات، شراب خانے، ہینا، ناچ گھر ایک بے پناہ
 بے تکلف اور بیباک زندگی سے معمور تھے۔ سڑکوں پر شور مچاتی ہوئی کاروں کے اندر سے
 حسین جمیل عورتوں کے قہقہوں کی جہاں پرور آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ سڑکیوں پر
 پیدل چلنے والے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ قیمتی سنگاروں کا خوش آئند دھواں اور شیش
 عطریات میں بے ہوش نسوانی اجسام کی خوشبو میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ آتش کیم، شربا
 یا سپا کیوٹ۔ کیلکری والوں کی دکھل صدائیں پرقتی ہوئی کچروں کے رونے چلانے اور بگڑنے
 اور والدین کے بچانے بچانے یا ٹلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نظارے کے اوپر سے

جب ان جہتی اور کج ہمتی ہوئی روشنیوں کی لہریں جولا لسی، ارم، بیترا اور مذا کو کے بعض مخصوص ناموں کا اشتہار دے رہی تھیں۔ ساحل سمندر کی نیم روشنی اسپینڈ کو ٹھہر ٹھہر کر جنگلات میں تو سنبھ اور خانہ سے آئی ہوئی اور جسم کے ابھار اور خطوط کو نمایاں کرنے والے پست، بھگت، طبعوسات میں پھنسی ہوئی حوا کی وہ بیٹیاں پام کے کپڑوں کے ساتھ لگی ہوئی دکھائی دیتیں جو بندرگاہوں میں شام ہی سے ابن آدم کے شکار کی تاک میں سیڑیوں کے پیچھے لپک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ خشکی کے اس نظارے سے پرے ساحل کے قریب چھوٹے کھاتی ہوئی کشتیوں کی کھڑکیوں میں سے چھین چھین کر باہر نکلنے والی روشنیاں تاریک پانی پر کس نکس ہو کر آتش و قنصل کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ ان سے پہلے سید و قنصل کے دلاؤگان سے لڑی ہوئی دُعا کی کشتیاں مہل بھاتی، پچٹ پچٹ کرتیں، بندرگاہ میں لنگر انداز جہازوں کے عقب سے نکلنے والی آب پر یوں پھسل رہی تھیں گویا بطوں کی قطاریں ہیں جو ابھر اُدر آ جا رہی ہیں۔

اور پھر نیند ملے بعد میں ہونا سے میکسیکو سٹی میں ہوائی جہاز سے اُترا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری آمد سے کچھ عرصہ پہلے ایک ہلکی سی بارش غیر معمولی طور پر ہر گھنٹہ جس سے فرش خاک و صل چکا تھا اور جھوٹے شجر سڑک کی گھنٹی ہوئی روشنی میں جھپک رہے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ کامنات کی ہر چیز بارانِ رحمت میں نہا کر توفانہ ہو گئی ہے۔

میکسیکو کو ہمیں کا حقہ نہیں لیکن جب میری نظریں اشیاء اور افسانہ کا مہیت کو سمجھنے لگیں تو میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ سرزمین اس عجب بے پایاں سے محسوس نہیں

جو قدرت نے کرہیں کر اپنے خاص انعام کے طور پر بخشا ہے۔ وہی تو مازنگی، وہی حظیر ہوا میں، وہی شون و شنگ ننگ، وہی سادگی، پڑکاری، وہی مناظر کا تنوع۔

(۳)

میکیکو کے قیام کے دوران میں میری آشنائی اس کے جن قوی اور بلی کمالات سے ہوئی ان میں سب سے اولین چیز ایک تصویر بنی۔ میں سپر کے قریب ہوائی اڈے پر وارد ہوا تھا اور جب مستقر کی کھل فضا سے چل کر میں مسافروں کے ہال میں داخل ہوا تو سب سے پہلی چیز جس نے میری نظر کو اپنی طرف کھینچا، سامنے کی دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر تھی جس پر لکھا ہوا تھا "فضا پر انسان کی فتح" اس تصویر میں رائٹ براہواں سے لے کر امیلیا اربارٹ تک ان تمام جہاں ہمت اور اودالعزم انسانوں کے کمالات کی داستان درج تھی جنہوں نے ہوائی کڑے کی پہنائیوں اور دستوں کی انہائی دنیا کو فتح کر کے ارضی کڑے کے الگ ننگ ملکوں کو آج ایک دوسرے کا ہمایہ بنا ڈالا ہے۔

اتفاق سے یہ قیام کے اشتغالات اترام متحدہ کے اعلیٰ ایگے نفاست پسند نمائندے کے ذمے تھے جس نے پاکستان سے وارد ہونے والے کم حیثیت اجنبی کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اس کا مختصر سا قیام شہر کے سب سے گراں قیمت اور فیشن ڈبل ہوٹل میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہوائی اڈے سے کار جب مجھے ٹرل پر اٹھ ہوٹل میں لے کر پہنچی تو اس کی عمارت کی نفاست اور شان کمروں کی خرمیں اور سجادات، روشنیوں کی چکاچوند تمام کے مبرسات کی ذرق برق کو دیکھ کر مجھے احساس کمتری سے ذہنی غلبان سا ہونے لگا۔

اس ہرٹل کے پونے سات سوکڑوں میں سے میرا کمرہ آٹھویں منزل پر واقع تھا جس کی کھڑکیوں کے سامنے دو رفاصلے پر تاروں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے میکسیکو سٹی کے وہ شہر و آبادی دو چڑھکوں آتش فشاں پہاڑ تھے جن کی سفید ہنالی چڑیاں پانڈنی رات کی خشک روپسل روشنی میں دوسن رسیدہ فسانوں کے سفید نمبروں کی طرح ان کی عظمت اور بزرگی کی وضاحت کر رہی تھیں۔ نیچے ایک طرف کو وہ دلکش باغیچہ تھا جس کے گھنیرے درختوں گھاس کے تختوں اور لہو لہوں کی کیا دیوں میں بکھری ہوئی برقی روشنیاں میرے کمرے کی بندی سے گھنونا کی طرح چمک رہی تھیں۔ سامنے روشنیوں کا ایک بے پناہ سیلاب تھا جس میں شہر کے بازار اور گلی کو چے میکسیکو سٹی کی کائناتِ شہینہ کو حرارت اور رنگینی بخش رہے تھے۔

شام کے کھانے کے لئے جب میں ڈائننگ روم میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ چپے ہوئے کمرے کا فرش گھاس کا ایک وسیع و عریض ہرا بھرا تختہ تھا جس پر ہر طرف کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں اور جس کو مہمانوں کے بھرم اور فحش کام کی ٹولیاں اپنے پاؤں سے روند رہی تھیں۔ میں اپنی میز پر بیٹھ گیا تو میری نظر وہ رہ گے فرش کی حسین گھاس پر گئی۔ لیکن پھر جرمی نے غور سے دیکھا تو مجھے ایک نظریوں دکھائی دیا۔ گویا یہ گھاس نہیں کچھ اور ہی چیز تھی۔ رفیع استعجاب کی خاطر میں اسے چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ محاب سا آدھا تھا کہ وہ کھینے والے خود میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ آخر میں نے تجسس کے احساس سے مغلوب ہو کر اپنا نیپکن اپنے قدموں میں پھینک دیا اور

جھک کر اسے اٹھانے کے بہانے جلدی جلدی دو تین مرتبہ ہاتھ سے فرش کی سطح کو چھوا تو مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا علم ہوا کہ یہ گھاس کا تختہ نہیں بلکہ ایک بیش قیمت نمائین تھا جو گھاس کا ایسا شیل تھا کہ نظارے اور لمس کو اس پر ہر طرح گھاس ہونے کا شبہ گزرتا تھا۔

اس کمرے میں سامنے کی طویل دیوار پر لکڑی کے منقش چوڑے میں ایک ٹرخ بانٹ تھی ہوتی تھی جس کی سادگی سے کمرے کے عین میں کمی لگا ادا تھا نہ ہو گیا تھا میں سوچنے لگا کہ بعض اوقات سادہ قسم کی عام چیزوں میں ذرا سا اجنباد کتنا حسن پیدا کر دیتا ہے۔ میں ابھی یہ غور کر رہی رہا تھا کہ اگر کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید کمرے کی تزئین کے لئے دیواروں پر چڑانے استادوں کی تصاویر کے پرنٹ چرکٹوں میں ڈال کر آویزاں کر دئے جاتے۔ لیکن ٹریل پر اڑو کے منتقلین نے محض سادہ بانٹ سے کتنا حسن پیدا کر دیا تھا، کہ اتنے میں میرا مقامی ساتھی مجھے شہر کی سیر کے لئے لینے آگیا۔ باتوں باتوں میں ڈائمنڈ روہم کے نمائین اور دیوار کی بانٹ کا ذکر چل گیا۔ میرے ساتھی نے مسکرا کر کہا: ”یہ بانٹ محض تزئین کی خاطر نہیں ہے بلکہ اس ٹرخ پردے کے نیچے چارے ملک کا ایک ایسا نمونہ شاہکار پوشیدہ ہے“ جس کی موجودگی نے نہ صرف اس ہوٹل کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا بلکہ ملک بھر میں قریب قریب فساد کی آگ لگا دی تھی اور پھر اس نے بتلایا کہ اس پردے کے نیچے دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر بنی ہوئی ہے جسے ۱۹۴۷ء میں

فوجیں اور سپاہ، سوار اور پیادے، پولیس اور پہرے دار، تاجر اور کارخانے دار،
 چھاپڑی فروش اور خزانچہ بردار، اخبار نویس اور مصور، شاعر اور ادیب، بچے اور
 بوڑھے، عورتیں اور مرد، رحمت اور موت کے فرشتے، نفسیکیاتنی بڑی تعداد میں
 افراد اور اصنام کو یکجا کر دیا ہے کہ ایک نظر میں منفرد انسانوں کے چہروں پر جذبات
 کے آثار چڑھاؤ، مواد کی ترتیب، رنگوں کی آئینش، روشنی اور عکس کے امتزاج کسی
 پر بھی تجربہ نہیں ٹھہرتی اور نگاہیں ایک کرنے سے دوسرے کو آنے کی طرف
 دوڑنے لگتی ہیں جن کے ساتھ ساتھ خود ناظر کو بھی ادھر ادھر لپکنا پڑتا ہے۔ [

تصویر کے بائیں جانب میکسیکو کے ہسپانوی فاتح کو تینز کی تشبیہ ہے
 جس کے ہاتھ اس خون سے آلودہ ہیں جو اس نے میکسیکو کی سرزمین پر ملک
 کے اصل وارثوں کے کشت و قتل سے بہایا تھا اور اس کے قریب وہ
 پادری ہیں جنہوں نے ارتھک باشندوں کو عیسائیت کا پیرو بنانے کی ایک ہرگیر
 تحریک چلائی تھی اور اس سے آگے جنرل انامیکسیکو کے سابقہ علاقے عکس
 کی چابیاں شکست کے بعد امریکی جنرل کے حوالے کر رہا ہے اور اس کے
 قدموں میں چند فلاکت زدہ انڈین مظلوم عورتیں محنت مزدوری کی ٹھکن سے چڑھ کر
 پڑے ہیں۔ زما آگے خواریز ہے جس کے ہاتھ میں شمشیر کا دستور مسودے
 کی صورت میں پکڑا ہوا ہے۔ یہیں صاف اول میں خود رویا کی تشبیہ ہے،
 جس کی ناک اور ماتھے سے ٹھوڑی تک کا حقہ چھری سے فسادیں کے ہاتھ

کھڑا ہوا جوں کا توں موجود ہے۔ اس سے آگے انقلاب کے بنگا مر اور کشت و خون کا نظارہ ہے اور پھر وہ منظر ہے جس میں پولیس کے اہل کار ایک شریف بیچ انڈین کو اس گناہ پر زور کو بکر رہے ہیں کہ اس نے اکیدا کے باغیچے میں قدم رکھنے کی جسارت کی تھی۔

یہ تصویر بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس سے میکسیکو کی حکومت ملک کے افراد کو اپنے وطن کی تاریخ سے مستقل طور پر باخبر رکھنا چاہتی ہے۔ یہ ساتھی نے کہا ہمارے ملک کی ایک بہت جلی بدقسمتی یہ تھی اور اب تک ہے کہ ہمارے ہاں ملک کے کئی حصوں میں لوگ تعلیم کی نعمت سے محروم ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے ملک کی تاریخ سے آگاہ کرانے کا ایک طریقہ تو یہی تھا کہ انہیں اپنی تاریخ کے اہم واقعات متعلق تصویروں کی صورت میں جگہ جگہ دکھائے جائیں تاکہ ان کی معلومات ملکی تاریخ سے نئی نہ رہ جائے۔ بعد میں میں نے خود میکسیکو سٹی کی سیر سے اندازہ لگایا کہ جس طرح لاہور کی دیواریں سینما اور مذہبی جلسوں اور دواؤں کے اشتہارات سے جگہ جگہ اٹی ہوتی نظر آتی ہیں اسی طرح میکسیکو سٹی میں دیکھنے والے کو یہ ملک عمارات کی اندرونی دیواروں پر جگہ جگہ وہ تصویریں دکھائی دیتی ہیں جن پر صورتوں نے ملک کی تاریخ بیان کر کے رکھ دی ہے۔ محکمہ تعلیم کی عمارت میں جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی جگہ بھی ان تصویروں سے بچ نہیں رہی۔ یہاں تک کہ سیر جیوں کے ساتھ کی دیواریں

بھی اپنی ہلکی روشنی میں انہیں تصویروں سے پُر ہیں۔ لائبریری، تھیٹر، دفاتر کے کمرے سب کی دیواریں میکسیکو کی تاریخ کے کسی نہ کسی واقعے کو آپ کے سامنے لاکھڑا کرتی ہیں۔

یہ تصویریں زیادہ تر ملک کے انڈین باشندوں اور مزدوروں کی اس جدوجہد اور تنگ و دو کو بیان کرتی ہیں جو انہوں نے سالہا سال سے اکیسٹائشین کے خلاف جاری رکھی ہے۔ ان میں ویہی رسوم و رواج، عوامی کام کا چمکیلے گناہ، ناچ گانے، پیدائش اور موت، شادی اور بیاہ کی تقریبات کے ساتھ ساتھ گاؤں اور کارخانوں کی زندگی، سمندر، ہوا اور زمین پر نقل و حرکت کے سابقہ اور جدید طور طریقے، فنون، صنعت و حرفت، گھریلو دستکاریوں، سائنس کی ایجادات سب کا حال ملتا ہے اور خود میکسیکو کی تاریخ کا کوئی باب ایسا نہ ہوگا جس کی تفصیل ان تصاویر میں سے حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ ملک کے اولین وحشی باشندوں سے لے کر عصر حاضر کی متدن معاشرہ کی معیشتی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ ہوگا جس کی نقشہ کشی نہ کی گئی ہو۔ یہ تصویریں میکسیکو کے افراد کی زندگی کا کچھ ایسا حصہ بن گئی ہیں کہ وہ کانوں کی دیواروں پر بھی یہی تصویریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ میں نے بعد میں میکسیکو سٹی کی سب سے بڑی دکان ملان ہارٹ میں بھی دیکھا کہ یہی تاریخ سے متعلق تصویریں ہر طرف دیواروں پر بنی ہوئی ہیں اور ان میں کچھ ایسی موضوعاتی اور فنی کشش ہے کہ ضرورت کا خیال ان تصویروں کی

دلکشی کے احساس کے نیچے دب جاتا ہے اور گاہک کو ایک راحت کے لئے
یہ قطعی یاد نہیں رہتا کہ وہ اس دوکان میں سامان خریدنے کے لئے آیا ہے یا
تصویروں کی دید کے لئے۔

میرے ساتھی نے کہا کہ ان تصویروں کے علاوہ ان پڑھ لوگوں کی علمی رہنمائی
کی دوسری صورت یہ تھی کہ شہر کے بازاروں اور گلیوں کے نام محض ہنگامی قسم کے
افراد اور بے معنی اشیاء ہی سے غسوب نہ کئے جاتیں بلکہ انہیں ایسے نام دئے
جاتیں کہ ان کے توسط سے ہماری تاریخ کے اہم آیام کی یاد بھی زندہ رہے۔ یہی
وجہ ہے کہ شہر کی سب سے اہم سڑک کا نام ”پاسٹری لاریفارم“ ہے تاکہ اس
کے ذریعے اس جنگ کی یاد تازہ رہے جو اصلاحات کے لئے ملک میں لڑی
گئی تھی اور ”پلازا ٹریل کسٹی قریبیوں“ کا نام عوام کو اس دستور کی یاد دلاتا ہے
جو انہوں نے ایک خون آشام انقلاب برپا کر کے حاصل کیا تھا۔ ایک سڑک کا
نام ”سکوڑی باؤ“ ہے۔ یہ اس فتح کی یادگار ہے جو میکسیکو نے ۵ مئی ۱۸۲۱ء میں
فرانس کے غیر ملکی قبضے کو ختم کرنے کے بعد حاصل کی تھی۔ ایک سڑک کا نام ”فرور“
ایک کا نام ۶ ستمبر ایک کا نام ۲ نومبر ہے اور یہ سب کسی نہ کسی اہم تاریخی واقعے
کی یاد تازہ کرتی ہیں ایک شارح کا نام ”انیکلو ۱۲۲“ ہے اور اس سے ملکی دستور
کی اس اہم دفعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق مزدوروں کی بہبودی اور نگہداشت
سے ہے۔

ہم باتیں کرتے ہوئے نکلے تو ذکرِ مصلواتِ عامہ اور تعلیم کا چھڑ گیا میں اپنے ساتھی کو بتانے لگا کہ کس طرح غیر ملکی حکومت نے میرے اہل وطن کو ڈیڑھ صدی تک تعلیم سے بیگانہ رکھا اور آج اس کے نتائج ہمارے ملک کی ترقی کے لئے کس قدر حوصلہ فرساثابت ہو رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے ملک کے ان خوش قسمت لوگوں کے محدود زمرے میں ہوں جو تعلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اور میں نے اسے بتایا کہ اس زمرے کے افراد ایسے نڈھے کے باشندوں کی تعلیم کے لئے جن میں طبائش کے اعضاء، برہمنوں کی افراط اور ثقافتی تنوع کی بھرمار ہے، کن روح فرسا مسائل کے حل کی تلاش کر رہے ہیں تو اس کی انگلیوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ یہ مسئلہ جس کی طرف آج آپ کی توجہ لگی ہوئی ہے اپنے تمام تر ہر ناک پہلوؤں کے ساتھ اب سے دس برس قبل ہمارے بھی پیش نظر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کا ایک ایسا عملی حل مروج کیا جس کے نتیجے میں ہماری حالت بدل گئی اور پھر اس نے اس مسئلے کا حال بتایا۔

(۴)

اگست ۱۹۴۷ء میں جبکہ دنیا کے دوسرے ملک جنگِ عظیم کے ہر ناک ہنگامے میں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے سمیکیکو میں صدر مینڈیل اور چاکا نے اپنے وطن کے ایک ایسے خطرناک دشمن سے جنگ کا اعلان کیا جس نے

ہسپانوی فتح کے زمانے سے میکسیکو کے عوام کو گھیر رکھا تھا۔ اس نے اپنے اعلان میں لوگوں سے کہا۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن جس کی رشید دعائیں سے میکسیکو خلافت و مکتب کے غار کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے ہمارا ہی آدمی آبادی کا کھنسنے پر مبنی سے بے بہرہ بن ہے۔ لیکن اگر میکسیکو کا ہر چڑھا کھٹا مرد، عورت اور بچہ ایک اور فرد کو کھٹنا پڑھنا سکھا دے تو یہ دشمن موت کی نیند سب سوئے گا۔

اس تحریک کا آغاز کسی بڑی مبارک گٹھری میں ہوا تھا کہ اس کے اعلان کے ساتھ ہی سارے ملک نے ایک نئی افتخار کے احساس سے صدر کا چوکی آواز پر لبیک کہا اور بے تعلیمی کے خلاف ایک مستقل محاذ پر طرف قائم ہو گیا۔ شاید ہی کوئی آدمی ہو گا جس نے اس جہاد میں حصہ نہیں لیا۔ شہر کے دفاتروں میں کام کرنے والوں نے دیہات کے کسانوں کو پڑھایا۔ آقاؤں نے ملازموں کو تعلیم دی، چھوٹوں نے بزرگوں کے درس کا زور لیا۔ اس کے نتیجے میں وہی کھردری انگلیاں جو اس سے پہلے ہل سے تھکی کسی چیز کو تھامنے کا تجربہ نہ رکھتی تھیں قلم سے زندگی کی بے جان تصویروں میں حیات کے نئے نئے رنگ بھرنے لگیں۔ سڑکوں پر گٹے ہوئے نشانات، اشتہاروں پر لکھے ہوئے حروف، کتابیں اور اخبارات جو اس وقت تک ایک بے معنی اور دور از کار شے تھے، اچانک زندگی کی جیتی جاگتی تفسیریں قارئین کی ایک

نئی قوم کی توجہ کو علم و ادب کی ایک جنت گم گشتہ کی طرف کھینچنے لگیں سارے ملک میں تعلیم و تعلیم کا ایسا چرچا ہوا کہ روزمرہ کے تمام مسائل اس کے سامنے ہونے لگے۔

وہ حالات جنہوں نے اس تحریک کی ترغیب دی بڑے افسوس ناک تھے میکسیکو جس کی آبادی دو کروڑ باشتہ وں سے اوپر ہے ۱۸۲۱ء میں ہسپانیہ کی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہی اندرونی سیاسی خلفشار، خانہ جنگیوں، انقلابات اور دوسرے ہر گیزہ گسوں میں کچھ اس طرح الجھا رہا ہے کہ اس کے اربابِ نظم و نسق کو سربس تک وہ اطمینان اور فراغت جیسا کہ آج کے اس ملک کی تعلیمی ضروریات کی طرف متوجہ ہو سکے۔ آج سے تیس پچیس برس پہلے تک شاید اس کی ضرورت بھی کچھ ایسی زیادہ محسوس نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ شہروں سے باہر بسنے والی آبادی اپنی ہی دنیا میں کچھ ایسی گمن غمی کہ اس کے لئے علم اور معلومات میں کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن پھر اچانک یہ لگائی نے شمال اور جنوب کے فاصلوں کو کم کر دیا، شاہراہوں نے مقامات کو ایک دوسرے کے پاس لا کھڑا کیا۔ ہوائی جہاز اور ریڈیو نے مکان و زمان کی رہی بھی مشکلات کا حل بھی پیش کر دیا۔ اب چارہ نہ تھا کہ میکسیکو اپنی جاہل آبادی کی حالتِ زور کی طرف متوجہ ہوتا۔

میکسیکو کے اربابِ حکومت نے محسوس کیا کہ اس عہد کی دنیا میں حوت کا

مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صنعت کو فروغ دیا جائے۔ صنعت کو فروغ دینے کے لئے انہیں تکنیکی ماہرین کی ضرورت تھی مگر انہیں باہر سے بلانے میں جو نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور جو گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کا سال انہیں اپنی گزشتہ تاریخ سے معلوم تھا۔ تو پھر اپنے ملک کے افراد ہی کو تعلیم سے کیوں نہ لیس کیا جائے؟ لیکن جوانوں کے علاوہ اُن اُن بڑے بالغوں کا کیا کیا جائے جو برسوں سے جہالت کے گھسے میں پڑے ہوئے ہیں اور جنہیں کھسنے پڑھنے میں کوئی کشش دکھائی نہیں دیتی؟

آخر ۱۹۴۷ء میں تعلیم کا ایک ہمد گیر پروگرام مرتب کیا گیا جس کی تکمیل کے لئے میکسیکو کے ایک جواں ہمت فرزند توریز بودیت کو قیادت کے فرائض سنبھلے گئے۔ بودیت نے سب سے پہلے موجود سکولوں کی عمارات میں اصلاحات کا کام شروع کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ملک میں وہی سکول تعلیم کا کام عام کریں گے جو پڑھنے والوں کے لئے اپنی تعمیر اور تزئین و آرائش کی وجہ سے باعث کشش ہوں گے۔ تمام سکول ہواوار، روشن، خوش نما اور مرتب کئے گئے۔ نئے سکولوں کے لئے نئے نقشے اور رضا کے تیار کئے گئے جس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ علاقے کے لوگ ان کی پک کشش نوعیت سے ایسے متاثر ہوں کہ دورانِ تعطیلات وہ انہیں ثقافتی سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔

پھر جب تک نئے سکول تعمیر ہوں موجودہ سکولوں میں درس کے نئے تقسیم اوقات کا ایسا لائحہ عمل تجویز کیا گیا کہ دن بھر میں کئی جماعتیں شریک درس ہو سکتیں اور ایک ادارے کی بجائے کئی ادارے اسی عمارت سے فائدہ اٹھا سکتے۔

اس کے بعد بدویت نے معتمدوں کی تنخواہوں کی طرف توجہ دی۔ ہمارے اپنے ملک کی طرح میکسیکو کے استاد بھی بڑی تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ذہین اور موزوں لوگ اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ بدویت نے معتمد کو ایک باعزت اور پرکشش ذریعہ معاش بنانے کے لئے فیصلہ کیا کہ تمام استادوں کو فنِ تدریس کا ایک شش سالہ کورس طے کرنا چاہئے۔ یہ کورس سکول یا کالج میں داخل ہونے کی بجائے ڈاک کے ذریعہ مکمل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ پہلے سال کی کامیاب تکمیل پر استاد کی تنخواہ میں ۱۶ فی صدی اضافہ ہوتا تھا اور دوسرے پر مزید ۱۶ فی صدی، گویا چھ سال کے خاتمے پر استاد کی تنخواہ ٹوگنی ہو جاتی تھی۔

نورین بدویت نے ایک اور کام کیا۔ اس نے مصوری کے نئے ایک بہت بڑی درس گاہ کا افتتاح کیا جس میں اپنے ملک کے تمام نامور مصوروں کو تعلیم دینے کی ترغیب دلائی اور اس کے دورانے دنیا کے تمام لوگوں پر کھول دئے۔ اس سکول میں داخل ہونے والوں کے لئے کاغذ رنگ ماٹل

سب مفت مہیا کئے جاتے ہیں۔ تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ صریح ہے کہ بیرونی علاقوں میں مناسط کی تصویر سازی کے لئے طلباء کے سفر کا خرچہ بھی سکول کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس سکول نے دور دور کے ملکوں سے طلباء کو کھینچ لیا۔

مگر بریت اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ کوئی ملک اس وقت تک مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک ملک کے اس طبقے کو جو سکول میں جانے کی عمر سے تباہ کر چکا ہے، باہل اور علم سے بے بہرہ بننے دیا جائے۔ چنانچہ جہاں اسے تعلیم بالغاں کا خیال آیا اور اس کا ذہن اس مشکل کے حل کی تجویزیں سوچنے لگا۔ آخر اس نے ایک تجویز نکالی۔ اس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ فوراً ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس کی رو سے ہر چھالک شخص ایک ان پٹر شخص کو ایک مقررہ میعاد کے اندر اندر پڑھانے کا ذمہ دار بنھرایا جائے۔

قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اس تحریک کے مقاصد اور اس کے فوائد سے ہر شخص کو آگاہ کرنے کے لئے ایک بہت بڑے پیمانے پر پبلشنگ کا اہتمام کیا گیا۔ ریڈیو، اخبارات، اشتہارات، گھونٹنے والی ٹرکوں، سفری تماشوں، ٹراک کے ٹکٹوں غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اس تحریک کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد جیسے ہی قانون نافذ ہوا ریسٹروں میں ہر گھر کے پڑھے لکھے

لوگوں کے ناموں کی فہرستیں بنادی گئیں اور ان کے آگے ان لوگوں کے نام درج کئے گئے جنہیں پڑھانے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہر شخص اپنے شاگرد کو پڑھا لکھا کر تعلیم کے ایک مقررہ میاژ تک پہنچا دے۔ قانون کے نافذ ہوتے ہی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میکسیکو ایک درس گاہ کا نام ہے جہاں ہر وقت ہر جگہ کوئی نہ کوئی شخص کتاب کھولے بیٹھا پڑھ رہا ہے یا پڑھا رہا ہے۔ دونوں جانتے ہیں کہ چھ ماہ کے بعد جو امتحان ہونے والا ہے اس میں اگر طالب علم نے پڑھنے لکھنے کا کوئی ثبوت نہ دیا تو دونوں کی خیر نہیں۔ ایک مختصر عرصے میں حکومت نے اس کتاب کی ایک کروڑ کاپیاں چھپوائیں جو تعلیم بالانساں کے لئے خاص طور پر تیار کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ستر لاکھ نوٹ بک اور پچاس لاکھ کاپیاں اس ہدایت نامے کی تیار کی گئیں جو پڑھانے والوں کی رہنمائی کے لئے تصنیف کیا گیا تھا اور یہ تینوں کتابیں حکومت نے اپنے خرچے سے ملک بھر میں مفت تقسیم کیں۔

لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ایک بہت بڑی عملی مشکل نے اس تقریب میں ایک الجھن پیدا کر دی اور وہ مشکل یہ تھی کہ شہروں میں تعلیم یافتہ آدمیوں کی آبادی غیر تعلیم یافتہ افراد کی نسبت زیادہ تھی۔ لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ آدمی مقابلہ بہت قلیل تعداد میں تھے۔ مثلاً میکسیکو سٹی کے بیس لاکھ افراد میں سے پندرہ لاکھ تعلیم یافتہ تھے اور باقی لاکھ غیر تعلیم یافتہ۔ اس کے برعکس بعض دیہات

میں پانچ سو کی آبادی کے مقابلے میں تعلیم یافتہ آدمیوں کی تعداد تین تین اور چار چار سے زیادہ نہ تھی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ رضا کاروں کی جہازوں کو دیہات میں بھیجا جائے جو چھ ماہ کے لئے وہیں سکونت پذیر ہو کر لوگوں کی تعلیم کا اہتمام کریں۔ ان سفری سکولوں کے ساتھ ساتھ ایسے مشن بھی بھیجے گئے جو لکھنے پڑھنے کے علاوہ دیہات کے لوگوں کو صفائی اور زراعت کے جدید اصولوں سے باخبر کریں، مکانوں کی تعمیر میں مشورہ دیں، اور بیماروں کا مقابلہ کرنے کے طریقوں سے آگاہ کریں۔ حسب یہ بھی کر دیا گیا تو ایک اور مسئلے نے تو ریزہ ریزہ کی توجہ کو اٹھانا شروع کیا۔ میکسیکو میں کوئی باؤن قومیں بستی ہیں۔ ان میں اکثر اپنی مادری زبانوں کے علاوہ ہسپانوی بھی بولتی ہیں۔ لیکن ملک میں تقریباً بارہ لاکھ باشندے ایسے ہیں جو ہسپانوی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو پہلے اپنی زبان میں کھانا پڑھنا سکھایا جائے اور پھر تدریجاً ہسپانوی سکھائی جائے اور یوں ایک تعلیمی پروگرام کے اندر ایک اور پروگرام شامل کیا گیا اور اس جدید پروگرام کی تکمیل کے لئے نئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ انہیں چھاپنے کے لئے ٹائپ ایجاد کیا گیا اور سکھانے کے لئے مستحقین تیار کئے گئے۔

مگر یہ محریک جو دراصل حکومت نے چلائی تھی ایسی نہ تھی کہ سرکاری چیز

بن کر اپنی وقعت کھو بیٹھی۔ سارا ملک اس تحریک کے فوائد سے متاثر ہو کر اس میں شامل تھا۔ ناشرین کے ایک ادارے نے دنیا کی مشہور کلاسیکی تصانیف کو طبع کر کے کوڑیوں کے مول مارے ملک میں بکھیر دیا۔ ایک ماہسن بنانے والی کمپنی نے مصوری کے مشہور زمن شاہکاروں کو اپنی ماچسوں کے اوپر چھاپ کر عوام کو ان لواؤں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ ایک اور ماہر فرم نے ہاچر اور سیرگا ہوں میں لاٹو سپیکر لگا کر کلاسیکی موسیقی کی ترویج کا اہتمام کیا۔ غرضیکہ جہر کچھ جس سے ہو سکا اس نے کیا۔ یہ تحریک ۱۹۴۴ء میں شروع ہوئی تھی پتلی کے خاتمے پر چھ لاکھ بالغوں کو تعلیم حاصل کرنے کی سندیں دی گئیں۔ دوسرے سال کے خاتمے پر کوئی پندرہ لاکھ اُن پڑھ لوگ لکھنے پڑھنے کی شہادہ بدھ حاصل کر رہے تھے۔ قیاس یہ تھا کہ آٹھ سال میں سارا ملک لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے گا۔ جب میں میکسیکو میں تھا تو اسے آٹھ سال ہو چکے تھے لیکن ابھی بھی کئی لاکھ آدمی ایسے باقی تھے جنہوں نے اُن پڑھ تھے۔ ان کی ناکامی کے وجہ میں خود ان کی اپنی ذہنی کمزوری کے علاوہ یہ بات بھی شامل تھی کہ بعض علاقوں کی مالی حالت اتنی خراب ہے کہ وہاں کے لوگ اپنی روزمرہ کی جانکاح زندگی سے ہٹ کر تعلیم کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن یہ کام جاری ہے اور یہ کام اس قدر عالی مرتبت اور مہتمم بالشان ہے کہ اگر اصل پروگرام کے برعکس اس کی مکمل کامیابی میں ابھی پانچ چھ برس اور بھی

گلاب جاتیں تو بھی اس کے برآمد شدہ نتائج شاید اس صدی کا ایکٹ اول خوش کن
معجزہ متصور ہوں گے۔

(۵)

اتوار کا پرسکون دن تھا۔ میری بیکاری اور تجسس مجھے کیچ کر بٹھا کر
یعنی سانس اور انسانی کی جنگ کا نظارہ دیکھنے کے لئے اکھاڑے کی طرف
لے گئے۔ اندر اور باہر ہجوم کا "ٹٹاٹٹاٹٹا" مارتا ہوا سمندر لاہور کے اخبار
"زمیندار" کی پسندیدہ سُرخ کی تفسیر پیش کر رہا تھا۔ وہ سیکڑوں کاریں جو
اٹھارہ بیس ہزار تماشاخیوں کو جگہ جگہ سے اٹھا کر یہاں لائی تھیں، تمام علاقے
میں پھیل چکی تھیں۔ داخلے کے دروازے تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ بڑی
وقت کے ساتھ میں اور میرا ساتھی گھومتے پڑتے ہجوم سے اُٹھنے لوگوں کو دھکیلتے
اندر پہنچے۔ ہماری سیٹ اکھاڑے سے دُور اوپر تھی۔ نیچے کشتیوں، جہاز
سے ڈرائی کا منظر صاف دکھائی دیتا ہے اور ریلی زمین پر گرتے ہوئے خون کی
دھار اچھی طرح نظر آ سکتی ہے، دو گنا گنا دام خرچ کرنے پر ملتی ہیں چنانچہ
ہم اوپر کی کم قیمت نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

چار بجے سے تھوڑی دیر بعد انسان اور حیوان کا مقابلہ شروع ہوا
اور میں نے زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ نصف صدی صحت مند اور حسین

جانوروں کو انسان کے ظالم ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُترتے ہوئے دیکھا
 شاید ایسے تماشائی کے لئے جو اس مقابلہ کے فن سے واقف نہ ہو اس کھیل
 میں کوئی دلچسپی نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ کامیابی کا سہرا ہمیشہ انسان
 ہی کے سر رہے اور حیوان اپنی ہمت اور برہمی داری کے باوجود ہر مرتبہ موت
 ہی سے ہم کنار ہو یہ جنگ کچھ ایسا بنانا یا کھیل نظر آتی ہے کہ اسے کھیلنے
 اور دیکھنے کے لئے بظاہر کوئی جواز نہیں۔ لیکن مجھے یہ اعزاز ہے کہ مقابلے
 کے دوران میں کئی مرتبہ نظارہ ایسا دل فریب اور دلچسپی پیدا کرنے والا بن
 گیا کہ چند لمحوں کے لئے مجھے کھیل کی وحشت اور بربریت کا قطعاً کوئی احساس
 نہ رہا۔ ان سیاہ ساندوں کو ترسیخ کرنے والے سُرخ و سیاہ ریشمی لباس
 پہنے ہوئے پتلے ڈبے نہتے جواں سال کھلاڑی ساندوں کے بے رحم سنگولی
 کے سامنے ہاتھوں سے سُرخ چادریں پھیلائے اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔
 یہ جو کچھ کر رہے تھے اس میں خون آشامی کا رنگ مزور بھلاک رہا تھا۔
 لیکن یہ افسانوی خون آشامی اور خون ریزی کم سے کم ان شکاریوں کے خونیں گدوہا
 سے بدرجہا کم افسوس ناک تھی جو پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر کھیتوں میں
 سے اُڑتے ہوئے تیر یا بیسیر کو بندوقوں سے نشانہ اجل بنانے میں لطف
 لیتے ہیں۔

لیکن میکیکو کے لوگ بلکہ تمام ہسپانوی قومیں انسان و حیوان کے اس

مقابلے کو کھیل کے زمرے میں شامل نہیں کرتیں۔ ان کے نزدیک اتوار کی سہ پہر کا یہ حسن، نخل اور شجاعت کا مشعر، نگارہ آرٹ ہی کی ایک ایسی صورت ہے جو تھیٹر یا رقص کے حد درجہ قریب ہے۔ وہ اکھاڑے میں مرتے ہوئے شائد کو دیکھنے نہیں جاتے بلکہ تھیٹر کی سیٹج یا کسی اٹیے کو پیش ہوتے ہوئے دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک تقاد قسم کی اچھی پبلک کی طرح وہ ہر اس میٹا ڈور یعنی کھلاڑی پر پتھر، برتلیں یا جرجیز ہاتھ لگے بے تکلفی سے پھینکنے پر آمادہ ہوتے ہیں جو مقابلے کے دوران میں حریف مخالف میں سائڈ کا احترام نہ کرے اور فنکار ہونے کا ثبوت نہ دے۔

مقابلے کے دوران میں کوئی بیس ہزار آدمی چلا رہے ہتھے، اشود مہا ہے تھے اور جب سائڈ قتل ہو جاتا تھا تو مسرت سے تائیاں پیٹتے تھے۔ یہ بات قدرے بربریت کا اظہار کر رہی تھی لیکن میرا خیال ہے یہ بربریت اس بربریت سے زیادہ نہ تھی جس کا مظاہرہ متمدن لوگ سرکس میں ہاتھیوں کو چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر یا رکھپوں کو بائیسکل چلاتے دیکھ کر یا شیروں کو جھپتی ہوئی آگ کے اندر سے بچھلانگتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے تائیاں پیٹ پیٹ کر کیا کرتے ہیں۔

(۶)

میکسیکو سٹی کے ایک ریڈ بائی ادارے کے ایک کارکن نے شام کے شے

مجھے اپنے کلب میں مدعو کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے عام معمول کے مطابق یہ طے کیا کہ میں کلب تک ٹیکسی کی بجائے پیڈل جاؤں گا۔ لیکن جیسے ہی سڑک پر نکلا مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں نے کس آفت کو اپنے لئے مول لے لیا ہے معلوم ہوتا تھا میں نے واقعی جان کو ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے۔

دنیا کے محتاط آدمی عام طور پر فرانس بلکہ پیرس کے کار چلانے والوں کی بے پروائی اور عدم احتیاط کی شکایت کیا کرتے ہیں لیکن پیرس ڈرائیور میکسیکی ڈرائیور کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ غالباً دنیا کے کسی دارالحفاظ میں ٹریفک کا معاملہ اس قدر خوفناک نہ ہوگا جیسا میکسیکو سٹی میں نظر آتا ہے۔ اس شہر میں کاروں کا استعمال بچے کی ”بے تماشا“ قسم کا ہے۔ وہ سب سے پہلی چیز جو نووارد کو میکسیکو سٹی میں حیران کر دیتی ہے، گاڑیوں کی رفتار اور ان کا شور ہے۔ اگر وہ اپنی آمد کے چند گھنٹوں کے بعد اندر کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے تو یوں کہنا چاہئے کہ تصور اس کا اپنا ہے ورنہ میکسیکی ڈرائیور ہر وقت اپنی سی کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ اس کی گاڑی اس قدر شور مچاتی، جتنی چلتی آمدنی کی رفتار سے دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے کہ اکثر اوقات وہ کان پڑی آواز جو ہمارے ہاں محض محاورہ سُنائی نہیں دیتی یہاں بچے کی شور کی نذر ہو جاتی ہے

اور تعجب ہونے لگتا ہے کہ وہی میکسیکی فرد جو عام زندگی میں غیر جلد باز، تساہل پسند، کم گو اور آہستہ خرام واقع ہوا ہے کار میں ڈرائیور کی نشست پر بیٹھتے ہی بے احتیاط اور غورہ پسند کیونکر ہر جاتا ہے۔

میں یہ تو کہ نہیں سکتا کہ میکسیکی سٹی میں کاروں کے حادثے کس تعداد میں ہوتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سڑکیں بہت ہی کم ہوتی ہیں اس کے باوجود سڑکوں پر لا پرواہی اور بے احتیاطی کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کی وجہ غالباً قومی کیپر کیڑ ہے۔ میکسیکیوں میں زندگی پاک معمولی شے ہے۔ کم از کم آج سے دس پندرہ برس پہلے تک اسے کوئی خاص وقعت حاصل نہ تھی۔ انسان ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کی جان بے لینے لگتے۔ یہ کھیل آج ہی نہیں صدیوں سے کھیلا جاتا ہے۔ کوئی پانچ سو برس قبل جب ازتیک دیوتا کے لئے ایک نیا مندر تعمیر کیا گیا تھا تو کوئی بیس ہزار انسانوں کی قربانی دی گئی تھی جن کے خون سے پروہتوں کے کپڑوں کو رنگا گیا تھا۔ میکسیکی کے عجائب خانے میں قربانی کا وہ پتھر اب تک محفوظ پڑا ہے، جس کے خوف میں دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر زندہ انسانوں کے سینوں میں سے تڑپتے ہوئے دلوں کو اکھاڑ کر پھینکا جاتا تھا۔ اور پھر سپانوی حملہ آور ہرنان کورتیز نے، جس نے طارق بن زیاد

کے اتباع میں دیراکرز کے مقام پر فوجیں اتارنے کے بعد اپنی کشتیوں کو جلا ڈالا تھا، فتح میکسیکو کے بعد مذہب کے نام پر جو قتل اور غارتگری برپا کی تھی اس نے میکسیکو میں انسانی جان کو پرکاہ کی حیثیت دے رکھا تھی اور عیسائیت سے انکار کرنے پر انسان گاجر سولی کی طرح کاٹ کر رکھ دئے جاتے تھے۔

پھر میکسیکو کی اندرونی لڑائیوں نے جن کے علم میکسیکو کے انڈین وطن پرستوں، خواریز، دیاز اور کاردیناس نے یکے بعد دیگرے پہلے آزادی کی خاطر، پھر اصلاحات کے لئے اور پھر انقلاب کے نام پر بلند کئے تھے۔ ملک میں کشت و خون کی ایسی خوف ناک طرح رکھی کہ انسان کو انسانی جان کا پاس جانا رہا۔ ہنستے کہلاتے لوگ ذرا سی بات پر بگڑ کر ایک دوسرے کی جان لے لیتے۔ کوئی پندرہ برس پہلے تک شراب خانوں میں دلا اور زہاٹم کی تقلید میں لوگ مخالفین کی درشت کلامی کا جواب ریرا لور کی گولی سے دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔

کوئی نصف گھنٹے کی وحشت ناک مسافت کے بعد میں اپنے میزبان کے ساتھ کلب میں پہنچا جو سوکالو کے قریب ایک فراخ سی گلی کے اندر واقع تھا۔ سوکالو دراصل سوتل سے ہے جو عربی لفظ ہے

اور مراد ہے بازار۔ یہ لفظ سپانیوں کو عرب فاتحین سے ملا تھا۔ میکسیکو میں آج ہر شہر میں سوکالو موجود ہے اور اگر آپ کسی سوکالو کی تاریخ کو جانتے ہیں تو آپ اس شہر کی تاریخ سے واقف ہیں۔ خود میکسیکو سٹی کا سوکالو جس کا سرکاری نام پلازادی لاکانسٹی ٹوسی اوں ہے اور جس سے کنٹھڈرل، قلمی عجائب خانہ، نیشنل پیس ملحق ہیں تمام بڑے سیاسی ہنگاموں کا مرکز رہا ہے۔ یہیں کو رتیز کے حملے کا آغاز ہوا۔ یہیں انقلاب کی بنیاد رکھی گئی۔ ہمارے کلب کا نام الدو رادو کلب تھا۔ یہ ایک عام قسم کا کلب تھا جس کی رکنیت کے لئے کچھ ایسی کڑی شرائط نہ تھیں لیکن اس کے ارکان کی تعداد ایک سو تیس پر محدود تھی۔ آج موسیقی کی خاص شام تھی جس کے لئے جمیکا کے برطانوی جزیرے سے فنکاروں کی ایک عیشی جماعت بطور خاص مدعو کی گئی تھی جو براعظم افریقہ کے بعض تاریک حصوں میں بسنے والے جنگجو قبیلوں کی موسیقی کو اس کے مقامی رنگ کے ساتھ پیش کرنے والے تھے۔

کھانے کے دوران میں کلب کے نام کا ذکر چھڑ گیا۔ میرے ساتھی نے مجھے بتلایا کہ اس لفظ کے ساتھ حمد داستان وابستہ تھی اس نے کس طرح صدیوں سے ہزاروں انسانوں کی جانیں لی تھیں۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ طوائف انسان جسے الدورادو کہتے ہیں جنوبی امریکہ کے اس خطے میں جو آج کولمبیا کی ریاست کہلاتی ہے اس ہزار فٹ کی بلندی پر برفانی پہاڑوں کی فصیل میں گھری ہوئی ٹیالے رنگ کے پانی کی مقدس جھیل "گوٹا وٹیا" میں رہتا تھا۔ ہسپانوی قبضے سے چند صدیاں پہلے کا ذکر ہے کہ اس انڈین سردار کی مغرور اور حسین بیوی نے اس سے بے وفائی کی اور پھر شوہر کی طعن و تشنیع سے آزرہ ہو کر جھیل گوٹا وٹیا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ الدورادو کو اپنی بیوی کے اس اقدام پر بہت صدمہ ہوا۔ اس حادثے کے بعد ہر سال یہ غم زدہ اور جگر سوختہ سردار سونے کا چہرہ حاد اے کر اس جھیل پر آتا۔ اس تقریب کے لئے پہلے پہاڑی اس کے برہنہ جسم پر ایک خاص قسم کی خوشبودار گوند مل دیتے۔ پھر اس پر سونے کا براہ چھڑکا جاتا جس سے اس کی جلد سونے کی ہو جاتی اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی آولیں کرفوں میں سردار کی رعایا کے ہزاروں افراد جو جھیل کے گرد کھڑے ہو کر اس سالانہ تقریب کا مشاہدہ کرتے، اس کے نہرے جسم کو ستائش اور تحسین کی نظروں سے دیکھتے۔ پھر الدورادو سونے اور جواہرات کا انہارے کر نختے پر سوار ہوتا اور دیوتاؤں کی قیس و تقدیس گاتے ہوئے پہاڑی اس نختے کو کھے کر جھیل کے وسط

میں لے جاتے جہاں الدو را دو یہ بیش بہا چڑھاوا اپنی بیوی کی روح کی
تکلیں کی خاطر اس جگہ پر گراتا جہاں اس نے خود کشی کی تھی اور پھر
جھیل کے مقدس پانی میں غوطہ لگا کر اپنے جسم کا سونا دھوا تا شہابی
خصل کے خاتمے کے ساتھ ہی تمام حاضرین فرے بلند کرتے اور
اپنے اپنے سونے چاندی کے چڑھاوے پانی میں پھینک دیتے۔

جب سپانوی فاتح جنوبی امریکہ میں پہنچے تو اس داستان سے ان
کے دل میں تجسس کا جذبہ پیدا ہوا اور الدو را دو کے گنج گراں مایہ کی
تلاش انہیں ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ لے گئی۔ لیکن وہ دن
اور آج کا دن اس طوائف انسان کے افسانے کی حقیقت کسی کو
معلوم نہ ہو سکی۔ امریکہ میں آج بھی اس مفروضہ خزانے کی تلاش جاری
ہے اور باخبر لوگوں کے نزدیک ایک لا حاصل سہی ہے۔ لیکن
ان کے لئے اب یہ لفظ ایک ذہنیت کا نام بن گیا ہے جس
سے مراد حصول ثروت یا جلب زر ہے اور یوں یہ نام زندہ ہے
اور زندہ رہے گا۔

کھانے کے خاتمے پر ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کرے کی تباہ
گل کر دی گئیں اور بمبکی روسیتاروں نے اپنے کمال کا مظاہرہ شروع
کیا۔ یہ ایک ناچ تھا جو واوی کا گلو کے کسی آن سانے تھیے کے

جنگی عزائم کی تفسیر تھی۔ جس دوران میں یہ ناچ پیش کیا جا رہا تھا جس سوچ رہا تھا کہ افریقی موسیقی کو مغرب نے کس بڑی طرح بدنام کیا ہے۔

مغرب نے اسے ہمیشہ ایک ایسی قسم کی خوفناک شے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو محض افریقہ کے تاریک براعظم ہی سے نمودار ہو سکتی ہے۔ یہ مغربیوں کی بے خبری کا نتیجہ ہے کہ ان کے ذہن سیاہ فام اقوام کے ساتھ سیاہ اعمال و افعال کو منسوب کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ سیاہی شیطنت اور تاریکی اور بے خبری کے دوسرے نام ہیں جو ہم سیاہ فام قوموں کے لئے مغرب میں مخصوص ہو چکے ہیں اور یہ نتیجہ ہے اس ذہنی رجحان کا جس سے مغرب کے پڑھے لکھے لوگ کبھی آسانی سے خلاصی حاصل نہیں کر سکتے۔

آج مغرب میں جس نے کئی افریقی تالوں کو بے خبری یا ارادے سے اپنی موسیقی میں شامل کر لیا ہے۔ یہ بات خال خال آدمیوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ”ڈارک کانٹیننٹ“ یعنی افریقہ کے تاریک براعظم سے کوئی اچھی موسیقی بھی مہذب دنیا تک پہنچ سکتی ہے اور یہ ”تاریک“ براعظم وہی خطہ ارضی ہے جہاں سورج دوسرے مقامات سے زیادہ تاب ناک ہوتا ہے۔ جہاں دھوپ زیادہ چمکیلی اور زیادہ

روشن، چاندنی زیادہ منور اور ستارے زیادہ پُر انوار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی جب افریقہ کے کسی غیر معروف علاقے کا کوئی عوامی رقص دکھایا جاتا ہے تو اس کی فلمیں یا الدورادو کلب کے بھیکی فنکار اسے ”وارڈانس“ یعنی جنگی رقص ہی بتلاتے ہیں۔ ان سیدھے سادے عورتوں اور مردوں کو جو اس میں حصہ لیں ”واریرز“ یعنی جنگجو ہی کہا جاتا ہے اور اس گھڑیلے نمٹنے کو جس کے ساتھ یہ رقص پیش کیا جاتا ہے ”وحشت ناک“ اور ”بھان انگیز“ جیسے ”سنسنی خیز“ نام ہی دئے جاتے ہیں۔

اور پھر آخر سیر و راحت کے ہنگامے ختم ہوئے اور وقت بھی آگیا۔ جب مجھے وطن کا رُخ کرنا تھا۔ وہ اوائلی اپریل کی ایک دلغزب صبح کا ذب تھی۔ بارہواری کے لطیف جھونکوں نے فضا میں خوشگوار خشکی پیدا کر رکھی تھی گہرے نیلے آسمان پر پدیدہ صبح کے سامنے مانند پڑتے ہوئے ستارے ایک ایک کر کے غائب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ نیم روشنی فضا میں اُٹھے ہوئے عمارات کے بیولے اور سڑکوں پر بساکت و جامہ اشجاروں چپ چاپ کھڑے تھے۔ گویا سکتے کے عالم میں کاروانِ صبح کے منتظر ہیں۔ لیکن میکسیکو سٹی کے گلی کوچوں کا شاناس امر کا شاہد تھا کہ تاریکی اور نور کی اس آویزش میں گزشتہ دن کے کاروبار سے تسلی ہوئی کائنات ابھی تک ہر شخص پڑی ہے اندھائی انوار کے رُوح پر و شاہد سے سے کیسے نیاز ہے۔ جو آید صبح کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ہوائی اڈے میں گو اس دلت لوگوں کا ہجوم مختصر تھا۔ اور وہ پہلے پہل کم تھی جو میں نے معدولہ پہاں دیکھی تھی لیکن مشینوں کی چکا چوند، ہوائی کپنیوں کے خوش خرام اور خوش انداز ملازمین اور ملک ملک کے متحمل مسافروں کی سرگردگی سے ابھی بھی اس

مخصوص رونق کی جھلک ہر طرف دکھائی دے رہی تھی۔ جو بڑے ہوائی اڈوں میں
 گہما گہمی کے وقت عموماً نظر آیا کرتی ہے۔ میں نے اپنا بیگ، اور کٹ اور
 کتابیں فرش پر رکھ دیں۔ اور روانگی کے اعلان کے انتظار میں کرسی پر دوڑا ہوا ہوائی
 اڈے میں آنے جانے والوں کی مصروفیات کو دیکھنے لگا۔

اور پھر اس نفاذ میں میرے خیالات کی روکیں سے کہیں جا بھل میں سوچنے
 لگا۔ کہ اس چھ ماہ کے قلیل عرصے کے دوران میں راولپنڈی سے لے کر ملکیکو
 بٹی تک پہنچے پہنچتے مجھے دنیا کے کتنے وسیع حصے اور کتنی بڑی مخلوق کو دیکھنے اور
 سمجھنے کا کیسا ہمیشہ ہوا موقع میسر آیا تھا۔ اور ثروت و غربت، عشرت و خلعت
 جندی و بستی، کمال و فروتنی، علم و جہالت، ذوق و کم سواری کی کیسی کیسی مثالیں میرے
 مشاہدے میں آئی تھیں اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے روبرو ایک پردہ
 سیسہ ہے جس پر میرے اس عالمی سفر کی پوری روئیداد دکھائی جا رہی ہے۔ اور
 میری نگاہیں ان تمام علاقوں کے حسین و جمیل نظاروں سے یکے بعد دیگرے پھر
 سے ٹکنا رہ رہ رہی ہیں جن کی دید سے میں اس سفر کے دوران میں روحانی لطافت
 اٹھا چکا تھا۔ اور وہ تمام مرد اور عورتیں آج پھر میرے سفر کے اس
 آخری دن مجھے گرجموٹی اور مخموم نگاہوں سے الوداع کہنے کے۔ میرے
 ارد گرد جمع ہو گئے ہیں جن کی خلوت و جلوت میں میرے سفر کا وقت پر لگا
 کر جوتا چلا گیا تھا۔ اور جن کے خلوص و محبت نے میرے لئے اپنا ٹھکانہ کی یاد

کو زندہ رکھنا ایک مشکل مسئلہ بنا دیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اپنے اعزاء اور اہلِ وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کے اعتماد پر ہم اکثر غفلت کرتے ہیں۔ ہمارے سب رشتے نامٹے وطن کی حدود یا گھر کی چار دیواری کے اندر بند ہیں۔ باہر کی دنیا غیر محال ہے۔ جہاں کے بننے والے رنگ و نسل، آداب و اطوار، مذہب و ملت، زبان و تمدن کے اقتدار سے ہم سے مختلف ہیں۔ اور فطری طور پر ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ یہ پُرانا خیال جہدِ جدید میں اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ جبکہ اقتصادی اور سیاسی کشمکش نے ہر ملک کو دوسرے کے مقابلے کا کھڑا کیا ہے۔ لیکن نسلی بیگانگی، تمدنی بُدھداسانی، اختلاف، سیاسی تفریق اور مذہبی تعادلات کے باوجود میں اس کو وسیع و عریض دنیا میں جہاں بظاہر اولادِ آدم، گروہوں، جماعتوں، فرقوں اور ملتوں میں بٹی ہوئی ہے جہاں جی گیا نہیں ہے ابنِ آدم کی رگ و پے میں اسی گرم گرم خون کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ جو خود میری، اپنی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور مجھے رنگ و نسل کی تفریق میں منقسم یہ سارا جہاں انسانی جہدِ دی کا ایک ایسا حسین گہوارہ دکھائی دیا۔ جہاں انسان کے دل میں ہر دوسرے انسان کے لئے انسانی جہدِ دی کا سمندر موجزن ہے۔ مگر یا ہم سب ایک ہی باپ کی اولاد، ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ میں سوچنے لگا۔ جب انفرادی طور پر یہ کیفیت ہے تو اجتماعی طور پر یہ ہنگامہ کیوں؟

لیکن میں اپنے خیالات سے چونکا۔ اعلان ہو رہا تھا کہ ہمارا جہاز روانگی کے لئے تیار ہے، میں خیال دنیا سے مادی دنیا کی طرف کڑا، میں نے اپنا سامان اٹھایا۔ ہوائی اڈے میں چلنے پھرنے والوں پر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر قدم بڑھاتا ہوا ان مرد، عورتوں سے جاملے جو قطار بنائے ہوئی اڈے سے باہر ٹارمک پر امریکن ایئر لائنز کے جہاز کی طرف جا رہے تھے۔

